والله یحب المتطہرین

الحمد للہ دریں ایام سعادت التیام کتاب مستطاب مسمیٰ بہ

تحفۃ الاتقیاء

یعنی

ترجمہ اردو کتاب

تنزیہ الانبیاء

مصنفہ

جناب افضل العلماء والفقہاء سید مرتضیٰ علم الہدیٰ علیہ الرحمہ

مترجمہ

جناب مولانا مولوی سید شریف حسین صاحب دام ظلہ العالی

بفرمایش

جناب مولوی سید محمد سبطین صاحب اڈیٹر البرہان لاہور

[illegible]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچۂ مترجم

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

بعد حمد و صلوٰۃ ارباب علم پر واضح ہو۔ کہ کتاب مستطاب تنزیہ الانبیاء مصنفہ عالی جناب عمدۃ العلماء وقدوۃ الفقہاء سید مرتضیٰ علم الہدیٰ علیہ الرحمہ (جن کے نام نامی اور اُن کے علم و فضل سے اکثر مومنین بخوبی واقف ہیں) اپنے مطالب و مضامین و اغراض کے لحاظ سے جیسی گراں قدر و بیش بہا ہے بیان کی ضرورت نہیں۔ لیکن عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اکثر شوقین احباب اس کے فیض سے محروم تھے۔ اور وقتاً فوقتاً احباب نے خواہش کی کہ اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ بندۂ احقر نے بغرض افادۂ مومنین اپنے فہم ناقص کے مطابق اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور حتے الامکان صحت اور محاورے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ خداوند عالم اس کو قبول فرمائے۔ اور مومنین کے واسطے مفید ثابت ہو۔ نیز بطور حواشی بعض ضروری تشریحات مزید فائدے کی غرض سے جناب ایڈیٹر البرہان کی طرف سے ایزاد کی گئی ہیں۔ جو انشاءاللہ ضرور مفید اور دلچسپ ثابت ہونگی۔ خاص وجوہات سے حصۂ امامت ترک کیا گیا۔ اگر کہیں نقص پائیں۔ تو ناظرین چشم پوشی سے کام لیں۔ اور اصلاح سے ممنون فرمائیں۔ فقط۔ والسلام علے من اتبع الہدے ✦

حقیر سید شریف حسین بھریلوی مدرس
سنٹرل ماڈل سکول لاہور

ترجمۂ اصل کتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ کما ھو اھلہ ومستحقہ وصلی اللہ علی خیرتہ من خلقہ وحجتہ علی عبادہ محمد وآلہ الابرار الطاھرین الذین اذھب اللہ عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا۔ اما بعد مجھ سے درخواست کی گئی ہے کہ میں ایک کتاب اس باب میں تصنیف کروں کہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام گناہان کبیرہ اور صغیرہ سے عمداً اور سہواً منزہ اور مبرا ہیں۔ اور اس باب میں علمائے اسلام میں جو اختلاف ہے۔ اس کی تردید بھی کردوں۔ حالانکہ عدیم الفرصتی اور کثرت اشغال وافکار ایسے امر جلیل الشان کی مانع ہے۔ مگر تاہم جواب میں مصروف ہوتا ہوں۔ اور اوّل اس باب میں مختلف اقوال اور متفرق مذاہب کو بیان کرتا ہوں۔ پھر صحیح مذہب کو دلائل باہرہ وبراہین ساطعہ سے ظاہر اور روشن کرونگا۔ بعد ازاں ان آیات اور احادیث کی تاویل بیان کی جائیگی جن سے مخالفین کو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام سے صدور گناہان کبیرہ وصغیرہ کا گمان ہوا ہے۔ ومن اللہ استمد المعونۃ والتوفیق وایاہ اسئل التائید والتسدید ؏

اختلافات مذاہب در عصمت انبیاء علیہم السلام

شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کا قول یہ ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام سے کسی قسم کے گناہ اور نافرمانی کا صادر ہونا جائز نہیں۔ خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ۔ نہ نبوت سے پہلے۔ نہ اس کے بعد۔ اور ائمہ علیہم السلام کے باب میں بھی ان کا یہی قول ہے۔ اور اہل حدیث اور فرقہ حشویہ نے نبوت سے پہلے صدور کبائر کو جائز رکھا ہے۔ اور بعض نے حالت نبوت میں بھی صدور کبائر کو تجویز کیا ہے۔ ہاں یہ رعایت ضرور کی ہے۔ کہ امور متعلقہ شریعت کے ادا کرنے میں جھوٹ کو مستثنٰے کر دیا ہے بعض کا قول یہ ہے کہ حالت نبوت میں پوشیدہ طور پر کبائر کا صادر ہونا جائز ہے۔ مگر کھلم کھلا نہیں۔ اور بعض ہر حالت میں جائز رکھتے ہیں۔

اور معتزلہ کا مذہب یہ ہے۔ کہ قبل نبوت اور حالت نبوت میں گناہان کبیرہ اور خفیف اور رسوا کرنے والے گناہان صغیرہ کا صادر ہونا جائز نہیں ہے۔ مگر ایسے صغیرہ گناہوں کا جو خفیف اور رسوا نہ کریں صادر ہونا دونوں حالتوں میں جائز ہے۔ پھر اس میں بھی باہم اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ نبی گناہ صغیرہ کو عمداً کر سکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عمداً نہیں کر سکتا۔ بلکہ یوں کہتے ہیں۔ کہ انبیاء ایسی حالت میں گناہوں پر اقدام نہیں کرتے۔ جبکہ ان کو گناہ ہونے کا علم حاصل ہو۔ ہاں تاویلاً مرتکب گناہ ہو سکتے ہیں۔ اور نظام اور جعفر بن مبشر اور ان کے تابعین کی ایک جماعت کا یہ مقولہ ہے۔ کہ انبیاء سے گناہ صرف سہو اور غفلت کی حالت میں صادر ہو سکتا ہے۔ اور ایسے گناہ اگرچہ ان کی امتوں سے معاف کئے جائیں۔ مگر ان حضراتؑ سے بوجہ ان کی قوت معرفت اور علو مرتبت کے ان گناہوں کا مواخذہ بھی ہوتا ہے۔

اور کل معتزلہ اور تمام اہل مذاہب جن کا ذکر اوپر گذرا یعنی حشویہ اور اہل حدیث ائمہؑ سے کبائر اور صغائر کا صادر ہونا جائز جانتے ہیں۔ مگر معتزلہ کہتے ہیں۔ کہ کبیرہ کے مرتکب ہونے کے سبب امام کی امامت فاسد ہو جاتی ہے۔ اور اس کا امامت سے معزول کرنا اور اس کے عوض دوسرا شخص امام مقرر کرنا واجب ہے۔ ارباب علم پر ظاہر ہے۔ کہ ہم میں اور معتزلہ میں یہی فرق ہے۔ کہ وہ انبیاء سے صرف صدور صغائر جائز رکھتے ہیں۔ سو یہ فرق بروقت تحقیقات ساقط ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے صغائر کا صدور جائز رکھتے ہیں۔ جن کے ارتکاب سے کسی عذاب و عقاب کے مستحق نہیں ہوتے۔ ہاں ان کے ثواب میں کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ پھر اس باب میں بھی اختلاف ہے۔

کیونکہ ابوعلی جبائی کہتا ہے۔ کہ صغیرہ کا عذاب بلا موازنہ اور معاوضہ کے ساقط ہو جاتا ہے ۔ گویا وہ لوگ اس بات کے قائل ہیں۔ کہ انبیاءؑ سے کوئی امر ایسا وقوع میں نہیں آتا جس سے وہ مذمت اور عذاب کے مستحق ہوں۔ اور یہ بات معناً بعینہ عقیدۂ شیعہ کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ شیعہ انبیاءؑ سے تمام قسم کے گناہوں کی نفی کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک ہر ایک گناہ کا مرتکب مستحق مذمت و عذاب ہوتا ہے۔ اس سبب سے کہ احباط یعنی گناہوں کا حبط کرنا ان کے نزدیک باطل ہے۔ جب کہ احباط باطل ہوا۔ تو کوئی گناہ ایسا نہ رہا جس کا مرتکب قابل مذمت و عقاب نہ ہو۔ پس جبکہ انبیاء علیہم السّلام سے استحقاقِ ذم و عقاب کی نفی کی جاتی ہے۔ تو واجب ہے۔ کہ تمام گناہوں کی بھی ان سے نفی کی جائے۔ اب شیعہ اور معتزلہ میں صرف احباط کے متعلق اختلاف باقی رہا۔ اور جب کہ احباط باطل ہے۔ تو ضرور اس بات پر اتفاق ہوا۔ کہ انبیاءؑ سے کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں ہو سکتا جس سے وہ مذمت اور عقاب کے مستحق ہوں۔ لیکن یہ جائز ہے۔ کہ ہم اس مسئلہ میں فرضی اور تقدیری طور پر کلام کریں۔ اور فرض کر لیں۔ کہ صغائر اور کبائر کے باب میں امر واقعی وہی ہے۔ جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں۔ جب ہم یہ بھی فرض کر لیں۔ تو بھی ہم انبیاء علیہم السّلام پر صغائر کو تجویز نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ ہم عنقریب بیان کرینگے۔ ان شاء اللہ ۔

مخفی نہ رہے۔ کہ جن معاصی اور قبائح سے ہم انبیاء علیہم السّلام کا پاک اور منزّہ ہونا تجویز کرتے ہیں۔ اور ان کا وقوع میں آنا ان حضرات سے ناممکن جانتے ہیں۔ ان سب پر نشانِ معجزہ دلالت کرتا ہے۔ خواہ وہ دلالت بنفسہ ہو یا بالواسطہ ۔ اور اس جملہ کی تفسیر یہ ہے۔ کہ معجزہ چونکہ نبوت اور رسالت کے مدعی کا مُصدّق اور حق سبحانہ تعالےٰ کے اس قول کا گویا قائم مقام ہوتا ہے۔ کہ تُو نے سچ کہا۔ کہ تُو میرا رسُولؐ اور میری رسالت کا پہنچانیوالا ہے۔ پس لازم ہے۔ کہ وہ معجزہ اس مدعی نبوت کو ان امور میں جو خدا کی طرف سے پہنچاتا ہے۔ اس ذاتِ اقدس پر کذب و بہتان باندھنے سے مانع ہوگا۔ کیونکہ جائز نہیں ہے۔ کہ حق تعالےٰ کذّاب کی تصدیق کرے۔ اس لئے کہ کذاب کی تصدیق قبیح ہے۔ جیسا کہ کذب خود قبیح ہے۔ اب رہا تبلیغ رسالت کے ماسوا اور امور میں جھوٹ بولنا اور دیگر کبائر کا مرتکب ہونا۔ پس ان کی نفی پر وہ ہی معجزہ اس حیثیت سے دلالت کرتا ہے۔ کہ وہ (معجزہ) اتباع رسول کے واجب ہونے اور تبلیغ رسالت میں اس کی تصدیق کرنے اور اس کے اقوال کے قبول کرنے پر دال ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السّلام کے مبعوث کرنے اور معجزہ سے ان کی تصدیق کرنے سے صرف یہ مقصود ہے۔ کہ امور رسالت میں

ان کی فرماں برداری کی جائے۔ پس جو چیز فرمانبرداری رسول اور قبولیت امور رسالت میں قادح اور حارج ہو۔ اور ان دونو میں اپنا اثر بذظاہر کرے۔ واجب ہے۔ کہ معجزہ اس کا بھی مانع ہو۔ اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ معجزہ امور غیر تبلیغ رسالت میں تو اُن سے کذب اور کبائر کی نفی پر بالواسطہ دلالت کرتا ہے۔ اور امور متعلقہ تبلیغ رسالت میں بنفسہ وبذاتہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ یہ ثابت کرو۔ کہ انبیا میں کبائر کا تجویز کرنا قبول اور امتثال کی قدح کرتا ہے۔ جو عین غرض بعثت ہیں۔ تو ہم جواب میں یہ کہینگے۔ کہ اس میں شک نہیں ہے۔ کہ جس شخص کی نسبت ہم کبائر کو تجویز کریں۔ اور گناہوں پر اقدام کرنے میں اس کی طرف سے مطمئن نہ ہوں۔ تو ہمارے نفس کو اس کی بات کے قبول کرنے اور اس کے وعظ کے سننے میں ایسا اطمینان اور سکون نہ ہوگا۔ جیسا کہ اس شخص کے قول اور وعظ سے ہوگا۔ جس کی نسبت ہم صدور کبائر و معاصی کو جائز نہ رکھیں۔ اور ہمارے اس قول کا یہی مطلب ہے۔ کہ کبائر کا ارتکاب مانع قبولیت اور باعث نفرت ہے۔ اور نفرت دلانے والے اور نہ نفرت دلانے والے امور کا انحصار صرف عادت پر ہے۔ اور وہی چیز معتبر ہے جس کو عادت مقتضی ہو۔ اور اس امر میں دلائل اور قیاسات کو دخل نہیں ہے۔ اور جو کوئی عادت کی طرف رجوع کریگا۔ اس کو ہمارے مذکورہ بالا قول کی تصدیق ہو جائیگی۔ کیونکہ وہ (صدور کبائر) قبول قول سے نفرت دلانے میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے کہ اس باب (تنفیر) میں صدور کبائر اور صدور سخافت وجنون و فریب کا درجہ یکساں ہے۔ یعنی جس طرح بے وقوف اور دیوانے اور فریبی کی باتوں سے طبایع انسانی نفرت کرتی ہیں۔ اسی طرح کبائر کے مرتکب سے لوگ نفرت کیا کرتے ہیں +

اشکال۔ اب اگر کوئی کہے۔ کہ کیا پہلے ایسا نہیں ہو چکا۔ کہ بہت لوگوں نے انبیاء میں کبائر کو تجویز کیا۔ اور پھر ان کے قول کی قبولیت اور ان کی شریعت پر عمل کرنے سے نفرت نہیں کی۔ اور یہ بات تمہارے اس قول کی تردید کرتی ہے۔ کہ کبائر نفرت دلانیوالے ہیں +

جواب۔ تو ہم کہینگے۔ کہ یہ سوال وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو ہمارے مذکورہ بالا ایراد کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ ہم نے تنفیر سے یہ مراد نہیں لی۔ کہ تصدیق رسالت بالکل اُٹھ جائے۔ اور اس کا حکم ذرہ بھر بھی نہ مانا جائے۔ بلکہ ہماری تفسیر مذکورہ کا مطلب یہ ہے۔ کہ نفس کو ایسے شخص کے قول کے قبول کرنے میں جو مرتکب کبائر ہو سکتا ہے۔ ایسا سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ جو ایسے شخص کی بات سے ہوتا ہے۔ جس کی نسبت ایسے امور کا وہم و گمان

بھی نہ ہو۔ نیز تجویز کبائر کی صورت میں ہم قبول قول سے اتنا ہی زیادہ دور ہونگے۔ جتنا کہ کبائر سے مطمئن ہونے کی حالت میں اس (قبول قول) سے زیادہ قریب ہونگے۔ اور کبھی ایسی چیز ایک شے سے قریب کرتی ہے۔ جس کے ساتھ وہ شے حاصل نہیں ہوتی۔ اور کبھی ایسی چیز ایک شے سے دور کر دیتی ہے۔ جس کے ہوتے وہ شے مرتفع نہیں ہوتی + دیکھو۔ کھانے کیلئے دعوت کرنے والا شخص اگر ترش رو اور تند خو ہو۔ تو عادۃً لوگ اس کی دعوت میں جانے اور کھانا کھانے سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن باوجود ترش روئی اور تند خوئی کے لوگ دعوت میں جاتے اور کھانا کھاتے ہیں۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ لوگ اس سے نفرت اور کراہت نہیں کرتے۔ اسی طرح جو شخص کشادہ روئی اور خندہ پیشانی اور بشاشت سے لوگوں کی دعوت کرتا ہے۔ لوگ عموماً خوشی خوشی اس کے ہاں جاتے اور کھانا کھاتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ باوجود ان نیک عادات اور اخلاق کے لوگ اس کے دستر خوان پر حاضر بھی نہیں ہوتے۔ مگر غیر حاضری کی وجہ سے یہ کلمہ زبان پر نہیں لا سکتے۔ کہ لوگ اس کے پاس جانے سے نفرت کرتے ہیں۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہو گیا۔ کہ نفرت اور میلان کے باب میں جو بات ہم نے بیان کی ہے۔ وہی معتبر ہے۔ نہ کہ قابل نفرت فعل کا وقوع میں آنا یا نہ آنا +

اشکال۔ اب اگر کوئی شخص یہ سوال کرے۔ کہ اس تقریر سے تو یہ ظاہر ہوا۔ کہ انبیا علیہم السلام سے حالت نبوت میں کبائر سرزد نہیں ہوتے۔ مگر یہ کہاں سے معلوم ہوا۔ کہ قبل از نبوت ان سے کبائر ظہور میں نہیں آتے۔ حالانکہ ان (کبائر قبل از نبوت) کا حکم نبوت سے جو عقاب اور ذم کے ساقط کرنے والی ہے زائل ہو جاتا ہے۔ اور بعد ازاں نفرت خلایق کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی +

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ طریق نفرت دونو حالتوں میں یکساں ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ کہ جس شخص پر کسی حالت میں (قبل نبوت یا بعد از نبوت) کفر کرنا اور کبائر کا مرتکب ہونا تجویز ہو سکے۔ گو اُن سے وہ توبہ کر لے۔ اور عقاب و عذاب کے استحقاق سے نکل جائے۔ مگر ہم کو اس کے قول کے قبول کرنے میں ایسا سکون و اطمینان نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اس شخص کے قول کے قبول کرنے میں ہوتا ہے۔ جس کی نسبت ہم کسی صورت اور کسی حالت میں کفر اور کبائر کو جائز نہ رکھیں۔ اس لئے اس واعظ کا حال جو اللہ کی طرف دعوت کرتا ہے۔ اور ہم اس کو جانتے ہیں۔ کہ وہ کبائر کا مرتکب ہو چکا ہے۔ اور بڑے

بڑے گناہ کرتا رہا ہے۔ گو اس وقت تمام کبائر اور گناہانِ عظیم سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اور ان سے توبہ کر لی ہے۔ اس شخص کے حال کی مانند نہیں ہوتا جس سے پاکیزگی اور طہارت کے سوا اور کچھ ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ اور پہلے واعظ کی وقعت ہمارے دلوں میں کسی صورت میں دوسرے واعظ کی سی نہیں ہو سکتی۔ اور ان دونوں شخصوں کے حال میں جو فرق بو اعث اطمینان و نفرت میں ہے۔ وہ ظاہر اور باہر ہے کچھ حاجت بیان کی نہیں۔ اسی لئے اکثر وہ لوگ جنہوں نے اس کی پہلی برائیاں دیکھی ہیں۔ گو ان سے اب توبہ کر لی ہو۔ اس کو شرم دلائینگے۔ اور ان کے سبب اس میں عیب اور نقص نکالینگے۔ اور اس کے فضائل میں جرح و قدح کرینگے۔ اور یہ ضروری نہیں۔ کہ اگر تجویز کبائر قبل نبوت تجویز کبائر حال نبوت سے باب تنفیر میں ناقص اور کم درجہ ہو۔ تو اس میں مطلق تنفیر ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ دو چیزیں (مثلاً قبل نبوت اور بعد نبوت ارتکاب کبائر کرنا) کبھی نفرت دلانے میں مشترک ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایک چیز دوسری چیز سے اقویٰ ہو۔ دیکھو سخافت اور جنون کی کثرت اور ان پر مداومت کرنا اور ان میں منہمک رہنا بیشک سخت نفرت دلانے والے ہیں۔ اور تھوڑی سی سخافت جو کبھی کبھی اور دیر دیر کے بعد وقوع میں آتی ہو۔ وہ بھی ضرور باعث نفرت ہوتی ہے۔ اگرچہ پہلی حالت نفرت دلانے میں دوسری حالت سے زیادہ قوی ہے۔ اور دوسری حالت اس باب میں بہت کمزور ہے۔ مگر اسکی کمزوری اس کو فی نفسہ حالت تنفیر سے قطعاً خارج نہیں کر سکتی +

اشکال۔ اگر کوئی سوال کرے۔ کہ تم کو یہ کہاں سے معلوم ہوا۔ کہ حالت نبوت میں اور نبوت سے پیشتر انبیاءؑ سے صغائر کا سرزد ہونا بھی جائز نہیں ہے +

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ اگر غور و تامل سے کام لیا جائے۔ تو دونو حالتوں میں نفی کبائر کی جو وجہ ہو سکتی ہے۔ وہی نفی صغائر کی بھی صورت ہے۔ چنانچہ ہم کو معلوم ہے۔ کہ جس شخص کو قبل از نبوت کبائر کا مرتکب تجویز کیا جائے۔ جن سے حالتِ نبوت میں اس نے توبہ کر لی ہو۔ اور بالکل ان سے پاک ہو گیا ہو۔ اور ذرا بھی عقاب اور ذم کا سزاوار نہ رہا ہو۔ ہم کو اس شخص سے ایسا اطمینان قلبی حاصل نہیں ہو سکتا جیسا اس شخص سے ہو سکتا ہے۔ جس کی نسبت کبائر کو تجویز ہی نہ کیا جا سکے۔ اسی طرح ہم کو یہ بھی معلوم ہے۔ کہ جس نبی کی نسبت صغائر کو تجویز کیا جاتا ہے۔ وہ حالت نبوت میں یا نبوت سے پیشتر قبائح پر اقدام کرنے والا اور معاصی کا مرتکب ضرور ہے۔ اگرچہ وہ معاف ہو گئے ہوں۔ مگر ہم کو اس کی طرف ایسا میلان

اور اس سے وہ اطمینان قلبی نہیں ہو سکتا۔ جیسا اس شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ جس سے ہم ہر قسم کے قبائح سے عمل میں لانے سے بالکل مطمئن ہیں۔ اور اس کی نسبت کسی برائی کو تجویز ہی نہیں کر سکتے۔ رہا یہ عذر کہ تجویز صغائر کی حالت میں عقاب اور ذم دونو ساقط ہو جاتے ہیں۔ سو یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔ کیونکہ ذم اور عقاب ہی نفرت دلانے میں معتبر نہیں ہیں۔ کہ ان ہی دونو کی وجہ سے نفرت وقوع میں آتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟ کہ اکثر مباح چیزیں بھی نفرت دلانیوالی ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان کے عامل پر کوئی عقاب نہیں ہوتا۔ اور بہت سی پیدائشی چیزیں اور قدرتی صورتیں اور وضعیں نفرت دلانیوالی ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ باب ذم سے بالکل خارج ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ قول اپنے قائل پر واجب کرتا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السّلام قبل بعثت کبائر کو تجویز کرے۔ کیونکہ توبہ کرنا اور گناہوں سے علیحدہ ہو جانا ذم اور عقاب کو تو زائل کر ہی دیتا ہے۔ جو بنا بر اس قول کے باعث نفرت ہوا کرتے ہیں۔ اور محض صدور گناہ اس کے نزدیک نفرت کا باعث ہے ہی نہیں۔ سو ارتکاب کبائر اور صغائر یکساں ہوا +

اشکال۔ اگر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ صغائر باعث نفرت کیونکر ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف اجر و ثواب کی کمی کا باعث ہوتے ہیں۔ اور صغائر ہونے کی وجہ سے مقتضائے ذم و عقاب سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہی ہے۔ کہ قلت ثواب نفرت دلانے والی شئے نہیں ہے۔ دیکھو انبیاء علیہم السلام اکثر نوافل کو ترک کر دیتے ہیں۔ کہ اگر ان کو بجا لاتے۔ تو ثواب کثیر کے مستحق ہوتے۔ حالانکہ یہ بات اُن حضرات سے نفرت دلانیوالی نہیں ہے +

جواب۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ صغائر اس وجہ سے باعث نفرت نہیں ہوتے۔ کہ ان کے مرتکب ہونے کی صورت میں اجر و ثواب میں کمی ہو جاتی ہے۔ بلکہ جس طرح اور قبائح اور معاصی پروردگار باعث نفرت ہیں۔ اسی طرح یہ بھی۔ اور یہ بات پیشتر بیان ہو چکی ہے کہ کسی چیز کا منفرات (نفرت دلانے والی چیزوں) میں داخل ہونا عادت اور رسم و رواج پر موقوف ہے۔ اور ہم یہ بھی بتا چکے ہیں۔ کہ عادت اور رواج تمام قسم کے گناہوں اور برائیوں سے نفرت دلاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ اوپر بیان ہو چکی۔ ماسوا اس کے یہ بات بھی ہے۔ کہ صغائر کا مرتکب ہونا اس باب میں نوافل کے ترک کرنے سے بالکل مخالف ہے۔ کیونکہ صغائر کا مرتکب ہونا مستحق اور ثابت شدہ ثواب کو گھٹاتا ہے۔ اور ترک نوافل میں یہ بات نہیں ہوتی۔ پس دونو کا فرق بالکل واضح اور ظاہر ہے۔ کہ اول میں تو ایک مرتبہ سے جو ثابت اور متحقق

ہو چکا ہو تنزل اور انحطاط ہوتا ہے۔ اور دوسری حالت میں گویا وہ مرتبہ حاصل ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ ایک شخص کو بڑی حکومت مل گئی ہو۔ اور وہ عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہو گیا ہو۔ تو جب اس کو اس منصب سے معزول کر دیا جائے۔ تو وہ شخص بیکاری اور معزولی کی حالت میں نہایت محزون و مغموم ہوگا۔ اور اس حالت کی تبدیلی اس میں نہایت موثر ہوگی۔ اور اس کی حالت اس شخص کی سی نہ ہوگی جس کو وہ حکومت نصیب ہی نہیں ہوئی۔ اور اس عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہی نہیں ہوا۔ اور ہماری یہ تقریر ان لوگوں کے اقوال کی بھی تردید کرتی ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام سے صدور صغائر کو عمداً یا تاویلاً بحسب اختلاف مذاہب جائز جانتے ہیں لیکن ابو علی جبائی اور اس مسئلہ میں اس کے ہم رائے لوگ جو اس بات کے قائل ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام ارتکاب معاصی عمداً نہیں کرتے۔ بلکہ تاویلاً ان سے خطا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ثبوت میں قصۂ حضرت آدمؑ کو تمثیلاً پیش کرتے ہیں۔ کہ حق تعالےٰ نے ان کو خاص کسی درخت سے منع نہ کیا تھا۔ بلکہ عام طور پر درختوں کی جنس سے منع فرمایا تھا۔ مگر انہوں نے تاویلاً یہ گمان کیا۔ کہ خاص درخت کے کھانے سے منع کیا ہے۔ پس انہوں نے معصیت کے علم ہونیکی حالت میں معصیت پر اقدام نہیں کیا۔ اس کے اس قول میں صاف تناقض پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے یہ مذہب اس لئے اختیار کیا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے پاک اور منزہ ہونا ثابت کرے۔ اور اس کا اعتقاد یہ ہے۔ کہ عمداً ارتکاب معصیت کرنا اس کو کبیرہ کر دیتا ہے۔ اس بنا پر اس نے حضرت آدمؑ کو ایک گناہ سے تو پاک کیا۔ اور دو گناہ ان کی طرف منسوب کر دئے۔ کیونکہ اس کے مذہب کے موافق ایک خطا تو یہ ہوئی۔ کہ حضرت آدمؑ پر واجب تھا کہ منشائے نہی پروردگار میں غور و تامل کرتے۔ کہ خاص درخت کے کھانے سے منع کیا ہے۔ یا ان درختوں کی جنس کے کھانے سے۔ اور انہوں نے اس امر میں غور و فکر کو ترک کیا یہ ایک خطا ہوئی دوسری خطا یہ کہ درخت کا پھل کھا لیا۔ غرض یہ دو خطائیں ہوگئیں۔

نیز یہ بھی کچھ ضروری نہیں۔ کہ عمداً ارتکاب معصیت کرنا اس کے کبیرہ ہونیکا باعث ہو۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ حالت عمد میں خوف اور ڈر بھی جو اس گناہ کو صغیرہ کرتا ہے۔ اور کبیرہ ہونے سے مانع ہے۔ اس شخص کو لاحق ہو۔ اور ابو علی یہ بات زبان پر لا ہی نہیں سکتا۔ کہ پروردگار عالم نے جو جنس یا نوع کی نہی کی تکلیف حضرت آدمؑ کو دی تھی۔ اس میں

غور و تامل کرنا ان پر واجب نہ تھا۔ کیونکہ اگر یہ بات ان پر واجب نہ تھی۔ تو وہ مکلّف کیونکر ہوتے۔ اور اس کا کھانا معصیت کیوں ہوا۔ اب ضرور ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ آدمؑ کے دل میں وہ بات ڈال دے۔ جو اس امر میں وجوب غور و تامل کی مقتضی ہے۔ اور جبکہ غور و تامل حضرت پر واجب ہوا۔ اور آپ اس کو عمل میں نہ لائے۔ تو عمداً واجب میں خلل انداز ہوئے۔ اور معصیت پر اقدام کرنا اور واجب میں خلل انداز ہونا نفرت دلانے میں دونوں یکساں ہیں۔ اور اس باب میں ان میں ذرا فرق نہیں ہے۔ پس جب کہ اس (ابوجبائی) کے نزدیک اخلال بالواجب جائز ہے۔ اور اس کے ارتکاب سے حضرت آدمؑ کا گناہ کبیرہ نہیں ہوا۔ تو اس کے نزدیک یہ بھی جائز ہوگا۔ کہ حضرت نے عمداً اس درخت کو تناول کیا۔ اور ان کا یہ فعل گناہ کبیرہ نہ ہوا۔

اور ہم نے جو نظام اور جعفر بن مبشر اور ان کے ہم موافقین کا قول اوپر نقل کیا ہے۔ کہ گناہ انبیاء علیہم السّلام سے غفلتاً اور سہواً سرزد ہوا کرتے ہیں۔ اس پر بھی ان حضرات علیہم السلام سے ان گناہوں کا مواخذہ ہوتا ہے۔ سو یہ قول محض بے اصل اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ سہو تکلیف شرعی کو زائل کر دیتا ہے۔ اور وہ فعل جو سہواً سرزد ہو۔ گناہ ہونے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور قابل مواخذہ نہیں رہتا۔ اور اسی سبب سے مجنون اور نائم سے مواخذہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور سہو کا حاصل ہونا رفع تکلیف میں ایسا ہی مؤثر ہے۔ جیسا کہ قدرت اور آلات اور دلائل کی عدم موجودگی۔ الغرض اگر بحالت سہو تکلیف کے صحیح ہونے میں انبیاءؑ کا حال امت کے حال سے مختلف ہوتا۔ تو جائز تھا۔ کہ فقدان قدرت و آلات و دلائل کی صورت میں بھی تکلیف کے جائز ہونے میں ان کا حال امت کے حال سے مختلف ہوتا۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔

لیکن وہ طریقہ جس سے معلوم ہو۔ کہ ائمہ علیہم السّلام بحالت امامت میں کبائر کا تجویز کرنا درست نہیں ہے۔ یہ ہے۔ کہ وجہ معلوم کے سبب لوگوں کو امام کی احتیاج ہے۔ اور وہ وجہ یہ ہے۔ کہ مکلفین اس کی موجودگی میں فعل قبیح سے دور تر اور فعل واجب سے قریب تر رہیں۔ جیسا کہ ہم نے کئی مقام پر بیان کیا ہے۔ پس اگر صدور کبائر امام سے جائز ہو۔ تو علّت احتیاج اس کے وجود میں بھی ثابت ہوگی۔ اور انسان کو کبھی کسی ایسے شخص کی احتیاج ہوگی۔ جو اس کا امام ہو۔ اور اگر وہ شخص بھی صدور کبائر کے جواز میں ایسا ہی ہے۔ تو اس کی امامت میں بھی اسی طرح کلام ہوگا۔ اور یہ سلسلہ بے انتہا اماموں کی طرف منتہی ہوگا یعنی تسلسل لازم آئیگا۔ جو باطل ہے۔ آخر کار امام معصوم تک نوبت پہنچیگی۔ جو سہو کا ستہا نہ ہو۔ اور یہی مطلوب ہے۔

نیز ائمہؑ طاہرینؑ سے عدم جواز کبائر کو یہ بات بھی ثابت کرتی ہے۔ کہ ان کا قول مثل انبیاءؑ کے قول کی شریعت کے نزدیک حجت ثابت ہو چکا ہے۔ بلکہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ حق کی معرفت محض انہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور سوائے ان کے اقوال کے اور کسی طرح حق کی طرف رستہ ہی نہیں ملتا۔ جیسا کہ ہم نے کئی مقام پر ثابت کیا ہے۔ پس جب یہ بات ثابت ہو گئی۔ تو وہ ہر حال میں انبیاء علیہم السلام کے قائمقام ہوئے۔ جو بات ان حضرات کے لئے جائز ہو۔ ان کے لئے بھی جائز ہوگی۔ اور جو ان کے لئے ناجائز ہو۔ وہ ان کے لئے بھی ناجائز ہوگی +

اور ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے کبائر اور صغائر کا صادر ہونا جائز نہیں ہے۔ نہ تو قبل از نبوت اور نہ بعد از نبوت۔ کیونکہ حالت صدور کبائر و صغائر میں لوگوں کو ان کے اقوال کے قبول کرنے سے نفرت ہو جائیگی۔ اور گناہوں سے پاک رہنے کی حالت میں لوگ ان سے مطمئن رہینگے۔ اسی طرح ائمہؑ کے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ وہ تمام کبائر و صغائر سے منزہ اور پاک ہوں۔ امامت سے پہلے بھی اور امامت کے بعد بھی۔ کیونکہ انبیاءؑ اور ائمہؑ دونوں اس حالت میں یکساں ہیں +

جب کہ ہم انبیاء علیہم السلام کی عصمت عام طور پر ثابت کر چکے۔ تو اب اُن آیات قرآنی کو بیان کرتے ہیں۔ جن کو اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ انبیاءؑ سے کبائر کا ظہور میں آنا جائز ہے +

تنزیہ آدمؑ علیٰ نبینا و آلہ و علیہ السلام

سوال منجملہ ان آیات قرآنی کے جو خطائے حضرت آدمؑ میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ آیت ہے۔ وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی۔ تخطئیۃ الانبیاءؑ کے قائل کہتے ہیں۔ کہ اس آیت سے صریح طور پر معصیت پروردگار کا وقوع میں آنا ظاہر ہوتا ہے۔ جو کہ قبیح ہے۔ اور لفظ فَغَوٰی اس کی تاکید میں وارد ہوا ہے۔ اور غَی رُشد کی ضد ہے +

مؤ ارباب علم پر پوشیدہ نہ رہے۔ کہ عصمت انبیاءؑ جملہ گناہان صغیرہ و کبیرہ سے ہر وقت و ہر حالت میں براہین عقلیہ اور دلائل نقلیہ سے ثابت ہے۔ نہ قبل نبوت اُن سے گناہ صادر ہوتے ہیں۔ اور نہ بعد نبوت۔ بلکہ قبل نبوت اور بعد نبوت کی بحث بھی تسامح پر مبنی ہے۔ غالباً مراد اس سے قبل بعثت اور بعد بعثت ہوگی۔ ورنہ محققین کے نزدیک نبی ہر وقت میں نبی ہوتا ہے۔ نبی نبوت ہی پر مخلوق و مجعول ہوتا ہے۔ النبی

جواب۔ ان سے کہا جائیگا کہ معصیت مخالفت امر کو کہتے ہیں۔ اور امر باری تعالےٰ واجب اور مندوب (مستحب) دونو طرح پر ہوتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ آدم علیہ السلام اگر درخت کا پھل نہ کھاتے۔ تو ایک امر مندوب کو بجالاتے۔ اور اس کے کھانے کی صورت میں نفل اور فضل کے تارک ہوئے۔ اور کوئی امر قبیح ان سے سرزد نہیں ہوا۔ اور یہ کچھ ناممکن بات نہیں ہے۔ کہ تارک نفل کو عاصی کہا جائے۔ جیساکہ واجب کا تارک عاصی کہلاتا ہے۔ اور

(بقیہ نوٹ) نبیّٗ ولو کان صبیاً بہت سی آیات قرآنیہ اس دعوے کے شاہد صدق ہیں۔ غالباً ہمارے علماء کی تحریرات میں قبل نبوت وبعد نبوت کے الفاظ کا استعمال بنا بر مشہور علی السنۃ العامہ ہے عصمت انبیاء کے باب میں بہت سے مباحث اس اختلاف کی وجہ سے بھی بڑھ گئے۔ اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو عصمت انبیاء میں شک کرنا عدم معرفت انبیاء پر موقوف ہے۔ اس لئے اثبات عصمت سے پہلے ضرورت ہے کہ حقیقت نبوت اور معنی عصمت بیان کئے جائیں۔ اس کے بعد اثبات عصمت انبیاءؑ نہایت آسان ہوگی۔ دلائل عقلیہ اور آیات قرآنیہ جو تمام انبیاء کی عصمت پر دال ہیں انکو احقر نے ایک علیحدہ کتاب میں لکھا ہے۔ یہاں اُن کی تفصیل کا موقع نہیں۔ طول مُمل ہو جائیگا۔ اور حاشئے کی حیثیت سے نکل جائیگا۔ سید علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر معتد بہ بحث کی ہے۔ جو مومنین کی تسلی کے لئے کافی ہے۔ میں یہاں پر صرف بعض جملوں کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ناظرین کو مزید فائدہ حاصل ہو۔ اور مطلب بخوبی سمجھ میں آجائے۔

مناسب ہے کہ اول اُن تمام آیات کو ذکر کیا جائے جن کو تنزیہ وتخطیہ حضرت آدمؑ سے تعلق ہے۔ سورۂ بقر رکوع ۴ وقلنا یآ ادم اسکن انت وزوجک الجنۃ وکلا منہا رغداً حیث شئتما ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظٰلمین۔ فازلھما الشیطان عنہا فاخرجھما مما کانا فیہ وقلنا اھبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الیٰ حین۔ فتلقیٰ ادم من ربہ کلمات فتاب علیہ انہ ھو التواب الرحیم۔ قلنا اھبطوا منہا جمیعاً فاما یأتینکم منّی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ الخ۔ (ترجمہ) اور ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم مع اپنی زوجہ کے جنت میں رہو اور فراخ عیشی کے ساتھ جس جگہ سے تم چاہو۔ اُس کے میوے وغیرہ کھاؤ۔ اور اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔ (ورنہ) تم ظالمین (نقصان اٹھانے والوں) میں سے ہو جاؤ گے۔ پس پھسلا یا ڈگایا انکو شیطان نے اور نکالا اُن کو اُس حالت سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا اُتر جاؤ۔ تم میں بعض بعض کا دشمن ہے اور تمہارے لئے زمین میں ایک عرصے تک جائے قیام اور روزی ہے۔ پس آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات

یہ ظاہر ہے کہ ہر امر کا مخالف خواہ وہ امر واجب ہو۔ یا نفل۔ عاصی کہلاتا ہے۔ اسی لئے عرب میں زبان زد ہے۔ اَمَرْتُ فُلَانًا بِکَذَا وَکَذَا مِنَ الْخَیْرِ فَعَصَانِیْ وَخَالَفَنِیْ۔ یعنی میں نے فلاں شخص کو فلاں امر خیر کا حکم دیا۔ پس اس نے میرا عصیان یعنی نافرمانی اور مخالفت کی۔ خواہ وہ امر جس کے بجالانے کا اس کو حکم دیا گیا ہے۔ امر واجب نہ ہو۔ اور قولہ تعالیٰ فغویٰ کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ خائب یعنی ناکام رہا۔ کیونکہ ہم کو معلوم ہے۔ کہ وہ امر مندوب جو تناول

(بقیہ نوٹ) سیکھے۔ پس خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ اور بیشک وہی توبہ کا قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

سورہ طہٰ ع ۸۔ ولقد عھدنا الی ادم من قبل فنسی ولم نجد لہ عزما۔ واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس ابی۔ وقلنا یا ادم ان ھذا عدو لک ولزوجک فلا یخرجنکما من الجنۃ فتشقی۔ ان لک الا تجوع فیھا ولا تعری۔ وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحی۔ فوسوس الیہ الشیطن قال یا ادم ھل ادلکم علی شجرۃ الخلد وملک لا یبلی۔ فاکلا منھا فبدت لھما سواتھما وطفقا یخصفان علیھما من ورق الجنۃ وعصی ادم ربہ فغوی۔ ثم اجتبہ ربہ فتاب علیہ وھدی۔ قال اھبطا منھا جمیعا بعضکم لبعض عدو الخ۔ (ترجمہ) اور البتہ ہم نے وصیت کی آدمؑ کو پہلے۔ پس اس نے ترک کیا۔ اور ہم نے اُس میں عزم بالجزم نہ پایا (یعنی وہ اُس وصیت پر ثابت قدم نہ رہا) اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا۔ کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ تو سب نے سجدہ کیا۔ مگر شیطان نے انکار کیا۔ اور ہم نے آدمؑ سے کہا۔ کہ یہ (شیطان) تیرا اور تیری زوجہ کا دشمن ہے۔ پس (دیکھو) کہیں تم کو جنت سے نہ نکال دے۔ کہ پھر تم نقصان و اذیت اٹھاؤ گے بیشک تیرے واسطے جنت میں ایسی چیزیں ہیں۔ کہ نہ تو بھوکا رہیگا۔ اور نہ برہنہ ہوگا۔ نہ تجھ کو پیاس لگیگی۔ اور نہ دھوپ کی تکلیف اُٹھائیگا۔ پس ایک بُری فکر کی شیطان نے اُس کے لئے (اور وہ یہ تھی کہ) اُس نے کہا (اے آدم) کیا میں تمکو ہمیشگی کا درخت اور ابدی ملک بتلا دوں۔ پس انہوں نے کھا لیا اُس درخت سے۔ پس اُن کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں۔ اور وہ اُن کو بہشت کے پتوں سے چھپانے لگے۔ اور خلاف وصیت خدا کیا آدمؑ نے۔ اور (اس وجہ سے) وہ خائب و ناکام رہا۔ پھر برگزیدہ کیا (خدا نے آدمؑ کو) اور توبہ قبول کی۔ اور اُس کی راہ نمائی کی (یعنی اُن کلمات کی طرف جنکی وجہ سے توبہ قبول ہوئی)۔ اور کہا کہ اُترجاؤ سب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

سورۂ اعراف ع ۳۔ ویا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ فکلا من حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظلمین۔ فوسوس لھما الشیطن لیبدی لھما ما وری

شجر کے ترک کرنے کا ان کو دیا گیا تھا۔ اگر وہ اس کو عمل میں لاتے۔ تو ضرور ثواب عظیم کے مستحق ہوتے۔ مگر جب کہ انہوں نے امر مندوب پر عمل نہ کیا۔ اور امر الٰہی کی مخالفت کی۔ تو بے شک و شبہ خائب اور خاسر رہے۔ کیونکہ انہوں نے اس ثواب کو حاصل نہ کیا۔ جس کے ترک تناول کی صورت میں وہ مستحق ہوتے۔ اور اس میں شک نہیں ہے۔ کہ لفظ غوی میں خیبۃ (ناکامی) کے معنی محتمل ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

(بقیہ نوٹ) عنہما من سوأتہما وقال ما نہٰکما ربکما عن ہٰذہ الشجرۃ الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخالدین۔ وقاسمہما انی لکما لمن الناصحین۔ فدلٰہما بغرور فلما ذاقا الشجرۃ بدت لہما سوأتہما وطفقا یخصفان علیہما من ورق الجنۃ وناداہما ربہما الم انہکما عن تلکما الشجرۃ واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین۔ قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔ (ترجمہ)۔ (اور ہم نے کہا) اے آدم تم اپنی زوجہ کے بہشت میں رہو۔ اور جہاں سے چاہو کھاؤ۔ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ۔ (ورنہ) تم اپنے نفسوں پر ظلم کرو گے (اور نقصان اٹھانے والے ہو گے)۔ پس ایک بری فکر کی شیطان نے ان کے لئے۔ تاکہ کھول دے ان کی شرمگاہوں کو جو پوشیدہ ہیں۔ اور اس نے کہا۔ کہ نہیں منع کیا تمہارے پروردگار نے اس درخت سے۔ مگر صرف اس غرض سے۔ کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ زندہ نہ رہو۔ اور قسم کھائی ان سے۔ کہ بلاشبہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ پس لغزش دی ان کو دھوکے سے (اور اس کے کھانے پر مائل و آمادہ کیا)۔ پس جب انہوں نے کھایا۔ تو ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں۔ اور وہ بہشت کے پتوں سے چھپانے لگے۔ اور ان کے پروردگار نے ندا دی کہ اے آدم کیا ہم نے تم کو منع نہ کیا تھا اس درخت سے۔ اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے (اس کے فریب میں نہ آنا)۔ (اس وقت حضرت آدم نے عرض کیا) اے ہمارے پروردگار۔ ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا (اور اس ثواب کو کھویا۔ جو اس درخت کے نہ کھانے سے ملتا)۔ اور اب اگر تو ہماری اس کمی کو پورا نہ کریگا۔ اور رحم نہ فرمائیگا۔ تو ہم خسارت میں رہینگے۔ انتہیٰ۔ یہ امر تو ظاہر ہی ہے۔ کہ ان القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔ قرآن کی بعض آیتیں دوسری بعض آیتوں کی تفسیر کرتی ہیں۔ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے حالات اکل شجرہ کے متعلق مذکورہ بالا تین آیتوں میں نقل کی گئی ہیں۔ ان آیات کو ایک دوسرے کے مقابل رکھنے سے اس قصے کی اصل کیفیت بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ اور صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت آدم سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی۔ صرف ایک معمولی لغزش کھائی ہے۔ جس کو ترک اولیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ظواہر قرآن سے جو مطلب مستنبط ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب خداوند عالم نے اپنی حکمت و مصلحت سے

فمن یلق خیراً یحمد الناس امرہ ✤ ومن یغو لا یعدم علی الغی لائماً

(جو شخص کوئی نیک کام کرے۔ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اور جو کوئی اس سے ناکام ہے۔ وہ اس ناکامی پر ملامت کیا جاتا ہے) ✤

اشکال۔ اگر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ کیونکر جائز ہے۔ کہ امر مندوب کے ترک کو معصیت کہا جائے۔ تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ انبیاء علیہم السّلام کو ہر حال میں عاصی کہا جائے۔

(بقیہ نوٹ) اپنے ایک خاص بندے کو اپنی خلافت کے واسطے برگزیدہ و منتخب کیا۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ (میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں) اور اپنے عالم امر سے ایک روح قدس ملکوتی عطا فرما کر اشرف مخلوقات قرار دیا۔ اور اُس وقت میں اپنی سب سے مقرب مخلوق یعنی ملائکہ مقربین کو اُن کیلئے سجدۂ تعظیمی کا حکم دیا۔ کما قال عزّ من قائل فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین۔ جب میں اُسکو ٹھیک بنالوں۔ اور اپنی برگزیدہ روح پھونک دوں۔ تو تم اُس کو سجدہ کرو۔ اُس وقت ابلیس لئیم و رجیم کی نفسانیت نے بروز کیا۔ اور آتش نخوت و غرور شعلہ زن ہوئی۔ سجدہ سے صاف انکار کر دیا۔ فسجدوا الا ابلیس ابی سب ملائکہ نے سجدہ کیا۔ مگر شیطان نے انکار کیا۔ جب خداوند عالم احکم الحاکمین رب السموات والارضین نے دریافت کیا کہ ما منعک ان تسجد اذ امرتک کس چیز نے تجھکو منع کیا اُس کو سجدہ کرنے سے جب کہ میں نے سجدے کا حکم دیا۔ اور دوسری جگہ ہے ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی تو وہی تکبر کا جواب دیا۔ قال انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین۔ کہ میں اُس (آدمؑ) سے بہتر ہوں (میں کیوں اُس کو سجدہ کروں) مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا ہے۔ اور اُس کو مٹی سے۔ (گویا اس کے خیال میں آگ مٹی سے افضل ہے۔ اس قیاس میں بھی اس نے سخت غلطی کھائی ہے)۔ خلاق عالم نے یہ جہالت آمیز جواب سُن کر فرمایا۔ دور ہو یہاں سے تجھکو یہاں تکبر کا موقع نہیں استکبرت ام کنت من العالین۔ کیا تو اپنے کو بڑا سمجھتا ہے۔ یا تو دراصل بڑے اور عالی نفوس میں سے ہے۔ یہاں ملعون خاموش رہا۔ اور اس وقت سے مردود بارگاہ الٰہی قرار پایا۔ اور مغضوب معتوب خداوندی ہوا۔ مگر قیامت تک عذاب و عقاب سے محفوظ رہنے کی مہلت طلب کی۔ جو کریم و ارحم الراحمین کی بارگاہ میں قبول ہوئی۔ قال انظرنی الی یوم یبعثون قال انک من المنظرین۔ بغض و حسد کی آگ تو سینے میں دبی ہی ہوئی تھی۔ مہلت پا کر حضرت آدم علیہ السلام اور بنی آدم کی دشمنی و عداوت پر کمر ہمت باندھ لی۔ اور قسم کھالی۔ لاقعدن لہم صراطک المستقیم۔ میں تیرے صراط مستقیم میں تیرے بندوں کی روک ہو کر بیٹھ جاؤنگا۔ ولاغوینہم اجمعین الا عبادک منہم المخلصین اور میں اُن سب کو

کیونکہ غالب ہے۔ کہ وہ امر مندوب کے تارک ہو کر کبھی معصیت سے خالی نہیں رہتے ◆

جواب ۔ تو ہم یہ جواب دینگے۔ کہ امر مندوب کے تارک کو مجازی طور پر عاصی کہا جاتا ہے۔ نہ کہ حقیقی طور پر۔ اور مجاز پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ فاعل قبیح اور تارک اولےٰ کی نسبت حقیقتہً عاصی کا لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ تو انبیاءؑ کی بابت اس لفظ کا استعمال بدون تقیید کے جائز نہ ہوا کیونکہ اس کا استعمال قبائح میں کثرت سے کیا جاتا ہے۔ پس

(بقیہ نوٹ) بہکاؤنگا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ احکم الحاکمین کا حکم صادر ہوا۔ کہ تو ملعون اور مردود ہو کر یہاں سے دور ہو۔ کچھ پروا نہیں۔ ھٰذا صراط علی مستقیم۔ یہ سیدھا راستہ موجود ہے۔ جو آنا چاہے۔ باآسانی اور خوشی سے آسکتا ہے۔ ان عبادی لیس لک علیھم سلطان۔ میرے بندوں پر تجکو قدرت نہیں۔ جو تیری پیروی کریگا اُس کو تیرے ساتھ جہنم میں ڈالونگا ◆

اور حضرت آدمؑ کو حکم ہوا کہ تم مع اپنی زوجہ کے بہشت میں رہو۔ اور جہاں سے چاہو۔ خوشی سے اس کے میوے کھاؤ۔ لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا۔ ورنہ تمکو نقصان پہنچیگا۔ اور اس انتفاع سے محروم ہو جاؤگے اور اپنے نفسوں پر ظلم کروگے۔ اور یہ شیطان تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ دیکھو۔ ایسا نہ ہو۔ کہ تمکو جنت سے نکال دے۔ اور کوئی ایسی چال چلے۔ کہ تم اس نعمت سے محروم ہو جاؤ۔ اور دیکھو تمہارے واسطے اس بہشت میں تمام سامان عیش موجود ہے۔ نہ تم کو یہاں بھوک لگیگی۔ نہ تم برہنہ رہوگے۔ نہ پیاسے ہوگے۔ اور نہ دھوپ میں رہوگے ◆

ابلیس لعین تو حضرت آدمؑ کا دشمن تھا ہی۔ ہمیشہ فکر میں رہتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا۔ کہ آدمؑ پیغمبر برگزیدہ خدا اور خلیفۃ اللہ اور اُس کے مخلص بندوں میں سے ہیں۔ میرے اغوا اور بہکانے میں نہ آئیگا۔ اور کبھی دیدہ و دانستہ کسی فعل قبیح کا مرتکب نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے پہلے ہی خدا کے مخلص بندوں کو اپنے قول میں مستثنےٰ کرچکا تھا۔ کہ میں سب کو گمراہ کرونگا۔ مگر تیرے مخلص بندوں کو۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ برگزیدۂ خدا ہیں۔ یہ گناہ کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔ مجھ کو جھوٹا ہونا پڑیگا۔ (جھوٹ ایسی بری چیز ہے۔ کہ شیطان بھی اُس سے پرہیز کرتا ہے) مگر حسد کی آگ تو بھڑک رہی تھی۔ کہ وہ ملعون حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کر کے ملعون و مردود ہو گیا۔ اور آدمؑ بہشت میں چین اُڑاتا ہے ◆

پس جب اُس نے یہ دیکھا۔ کہ وہ ان کو گمراہ تو کر نہیں سکتا۔ خیال کیا۔ کہ کوئی ایسی چال چلنی چاہیئے۔ جس سے حضرت آدمؑ بہشت سے الگ ہو جائیں۔ چنانچہ اسی فکر کی طرف خداوند عالم اشارہ فرماتا ہے فوسوس لھما الشیطان۔ کہ شیطان نے اُن کے لئے ایک بڑی فکر کی۔ اور بڑی چال چلا۔ کیونکہ وسوسہ

اس کا اطلاق بدون تقید کے شک میں ڈالتا ہے؟ تو ہم اس کا جواب یوں دینگے۔ کہ اگر ان حضراتؑ کو عاصی کہنے سے تمہاری مراد یہ ہے۔ کہ وہ قبائح کے مرتکب ہوتے۔ تو یہ جائز نہیں ہے۔ اور اگر تم اس سبب سے ان کو عاصی کہتے ہو۔ کہ وہ ان امور کے تارک ہوتے۔ کہ اگر ان پر عامل ہوتے۔ تو ثواب عظیم کے مستحق ہوتے۔ اور وہ ان کے حق میں اولٰے اور افضل ہوتا۔ تو اس صورت میں تمہارا خیال سچا اور درست ہے۔ اور وہ ایسے ہی ہیں *

(بقیہ نوٹ) کے معنی لغت میں بد اندیشیدن بُرا سوچنا بُری فکر کرنا ہیں۔ پس حضرت آدمؑ اور حواؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا۔ (ما نھٰکما ربکما عن ھٰذہ الشجرۃ الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخالدین) کہ نہیں منع کیا تمکو تمہارے پروردگار نے اس درخت سے مگر صرف اس لئے کہ کہیں تم فرشتے نہ ہو جاؤ یا تم ہمیشہ زندہ نہ ہو۔ یعنی خدا نے تمکو اس درخت سے صرف اس واسطے منع کیا ہے کہ اگر تم اس کو کھالوگے تو ہمیشہ زندہ رہوگے اور فرشتے بن جاؤگے۔ اور خدا ایسا نہیں چاہتا۔ پس تم مر جاؤگے۔ اور اس نعمت سے دور ہو جاؤگے *

حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ یہ بات سُن کر نہایت متحیر ہوئے۔ اسی فکر میں تھے۔ کہ یہ ملعون ایک بزرگ کی صورت میں آیا (جیسا کہ بعض احادیث و تفاسیر سے ثابت ہے)۔ اور کہا۔ (ھل ادلکم علی شجرۃ الخلد و ملک لا یبلی) کہ کیا میں تمکو ہمیشگی کا درخت اور ملک ابدی بتلا دوں۔ یعنی میں تمکو ایسا درخت بتلائے دیتا ہوں۔ کہ اگر اس کو کھالوگے۔ تو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہوگے۔ (اسی بات کی فکر پہلی صورت میں ملعون ڈال گیا تھا) صرف اس کہنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مزید اطمینان اور حضرت آدمؑ پر حجت شرعی تمام کرنے کی غرض سے قسم کھائی۔ وقاسمھما انی لکما لمن الناصحین یعنی اُن سے قسم کھائی۔ کہ بلاشک میں تمہارا دوست اور خیرخواہ ہوں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میں تمکو فریب نہیں دیتا۔ تمہارا دشمن اور بدخواہ نہیں ہوں۔ تاکہ حضرت آدمؑ کو اُس کے صدق کا یقین ہو جائے۔ جب حضرت آدمؑ نے یہ دیکھا۔ کہ اسم حضرت حق کی قسم کھاتا ہے۔ حضرتؑ کے لئے حجت شرعی پوری ہوگئی۔ کیونکہ جب کوئی خدا کی قسم کھائے۔ تو اُس کے نام اقدس کی تعظیم کی وجہ سے حکم ہے کہ اُس بات کو مان لینا چاہئے اور سچ سمجھنا چاہئے۔ حضرت آدمؑ پیغمبر تھے۔ اسم حضرت حق کی قسم سنتے ہی یقین ہوگیا۔ کہ یہ سچا ہے۔ شیطان کی یہ چال چل گئی۔ اور حضرت آدمؑ کو لغزش دے دی۔ اور ڈگا دیا۔ چنانچہ اسی کی طرف اللہ جل شانہ اشارہ کرتا ہے۔ فازلھما الشیطان عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ۔ پس ڈگا دیا و پھسلا دیا شیطان نے اُس سے (بہشت سے) اور نکال دیا اُن کو اُس حالت سے جس

اگر یہ کہیں کہ اگر یہی بات ہے۔ تو پھر قولہ تعالےٰ ثم اجتباہ ربّہ فتاب علیہ وھدیٰ
اور آیۂ فتلقی آدم من ربّہ کلمات فتاب علیہ انہ ھو التواب الرحیم کے کیا معنی ہیں کیونکہ
ان آیتوں سے تو صاف حضرت آدمؑ کا گنہگار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جس نے گناہ نہیں
کیا۔ اس کی توبہ قبول کرنا کیا معنی۔ اور جس نے فعل قبیح نہیں کیا۔ اس کا توبہ کرنا یعنی چہ +
اس کا جواب یہ ہے۔ کہ لغت میں توبہ کے معنی رجوع کے ہیں۔ اور یہ لفظ خدا کی طرف

(بقیہ نوٹ) ہیں وہ تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ازل کا لفظ استعمال کیا۔ جو ازلال کی ماضی ہے
اور ازلال کے معنی لغت میں لغزانیدن پھسلانا ہے۔ کیونکہ اس کا مجرد زلّ و زلۃ ہے۔ جس کے
معنی لغزش کے ہیں۔ اسی سے زلۃ الاقدام و مزلۃ الاقدام ہے۔ یعنی پیر پھسلنا اور پیر پھسلنے
کی جگہ۔ پس ازلال کی صورت یہ ہے۔ کہ مثلاً کسی ڈھلان کی جگہ کوئی پھسلنے والی نرم چیز ڈال دے تو
جس کا پیر وہاں پڑیگا یا وہاں سے گذریگا گر پڑیگا۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ایسی صورت میں گرنے والے کا کوئی قصور
نہیں۔ اور اس کو کوئی بُرا نہ کہیگا۔ کہ تو کیوں گرا۔ بلکہ اُس دھوکہ دینے والے کا قصور ہے۔ اور سب
اُس کو بُرا کہینگے۔ فلعن اللہ الشیطان۔ بہرحال اس طرح شیطان نے چال چلی۔ اور حضرت آدمؑ
اس لغزش سے اُن نعمتوں سے نکلے۔ فلما ذاقا الشجرۃ بدت لھما سوآتھما وطفقا یخصفان
علیھما من ورق الجنۃ جب انہوں نے اُس درخت کا پھل کھالیا۔ تو ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں اور
بہشت کے پتوں سے چھپانے لگے۔ یہ اثر تھا اُس پھل کے کھانے کا جو کھاتے ہی ظاہر ہوا۔ اسی واسطے
خدا نے فرمایا تھا۔ ان لک الا تجوع فیھا ولا تعریٰ الخ۔ اگر تم اس درخت سے نہ کھاؤ گے
تو بہشت میں نہ تم بھوکے رہو گے۔ اور نہ برہنہ ہو گے۔ لہذا اُس درخت کے چکھتے ہی اس کا اثر ظاہر ہوا۔
اور وہ برہنہ ہو گئے۔ اُس وقت پروردگار عالم کی طرف سے ندا آئی۔ کہ اے آدمؑ و حوّا۔ کیا میں نے تم کو اس
درخت سے منع نہ کیا تھا۔ اور میں نے نہ کہا تھا۔ کہ بلاشبہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ ونادٰھما ربھما
الم انھکما عن تلکما الشجرۃ واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین۔ اسی کی طرف خدا اس آیۂ مبارکہ
میں اشارہ فرماتا ہے۔ ولقد عھدنا الیٰ آدم من قبل فنسی ولم نجد لہ عزمًا یعنی البتہ ہم نے
وصیت کی آدمؑ کی طرف پہلے پس اُس نے اُس کو ترک کیا (نسی لغت میں بمعنی ترک استعمال ہوتا ہے۔
قرآن میں اور بھی بہت سی جگہ نسی بمعنی ترک استعمال ہوا ہے) اور ہم نے اُس کے لئے عزم نہ پایا۔ تب حضرت آدمؑ
نے عرض کیا۔ کہ اے ہمارے پروردگار بیشک ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہم کو معاف نہ کرے
اور رحم نہ فرماتے۔ تو ہم ٹوٹے اور خسارے میں رہینگے۔ اُس وقت خدا نے بعض کلمات خاصہ مخصوصہ کا

بھی منسوب ہوتا ہے۔ اور بندوں کی طرف بھی۔ اور توبہ ہمارے نزدیک اور ہمارے اصول مسلمہ کے موافق عقاب آخرت کے زائل ہونے کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ توبہ کرنے سے اللہ تعالےٰ محض اپنے تفضل اور احسان سے عقاب کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور توبہ جس چیز کا باعث بنتی ہے۔ وہ استحقاقِ ثواب ہے۔ پس اس صورت میں توبہ کی قبولیت صرف ثواب کی ضمانت ہے۔ بنابریں آیۂ تاب علیہ کے یہ معنی ہوئے۔ کہ خدا نے آدمؑ کی توبہ قبول کی۔ اور

(بقیہ نوٹ) الہام کیا۔ اور راہ نمائی کی۔ اور اُس کی برکت سے حضرت کی توبہ کو قبول کیا۔ یعنی وہ ندامت جو حضرت سے بقول ربنا ظلمنا انفسنا میں ظاہر ہوئی تھی۔ اور خدا نے اُن کو برگزیدہ کیا۔ چنانچہ مذکور ہے۔ فتلقیٰ آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ انہ ھو التواب الرحیم۔ اور دوسری آیت میں ہے وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ ثم اجتبٰہ ربہ فتاب علیہ وھدیٰ کہ خلاف عہد خداوندی کیا آدمؑ نے۔ پس وہ ناکام و ناامید ہے یعنی جس کی خاطر کیا تھا وہ نہ ملی۔ کیونکہ حضرت آدمؑ نے اُس درخت کو اس غرض سے کھایا تھا۔ کہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہینگے۔ اور ہمیشہ بہشت میں رہینگے۔ لیکن نتیجہ برعکس نکلا۔ اور اُس درخت نے اور ہی کچھ اثر دکھایا جس کی خدا پہلے اطلاع دے چکا تھا۔ پھر برگزیدہ کیا اُن کو خدا نے اور توبہ قبول کی۔ وقلنا اھبطوا منہا جمیعا۔ اور کہا کہ سب نیچے اُتر جاؤ۔ اور دوسری جگہ ہے وقلنا اھبطوا منہا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الیٰ حین یہ دوسرا اثر درخت کا تھا۔ کہ حکم ہُوا۔ کہ سب اتر جاؤ۔ تم میں بعض بعض کا دشمن ہے۔ اور تمہارے واسطے ایک مدت تک زمین ہی میں جائے قیام اور سامان معیشت ہے +

صاحب عقل سلیم بیان صدر سے حضرت آدمؑ کے ترک اولےٰ کے معنے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ حضرت آدمؑ نے اُس وقت اُس درخت سے کھایا ہے۔ جب کہ شیطان نے اسم حضرت حق عزوجل کی قسم کھائی جو اُن کے لئے حجت تھی۔ اور حضرت آدمؑ کو کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا۔ کہ انہوں نے کسی کو خدا کی جھوٹی قسم کھاتے دیکھا ہو۔ نیز یہ کہ وہ دار الحیواۃ ہے۔ وہاں کی ہر ایک چیز ذی حیات و ذی ہے۔ وہاں جو کوئی ذرا بھی خلاف کرتا ہے۔ فوراً اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ ان دار الاخرۃ لھی الحیوان بیشک دار آخرت حیات ہے پس جب شیطان نے قسم کھائی۔ اور کوئی بُرا اثر اُس کے لئے ظاہر نہ ہُوا۔ تو حضرت آدمؑ کو اور بھی اطمینان ہو گیا۔ کہ یہ سچ کہتا ہے۔ کیونکہ اُن کو خیال تھا۔ کہ اگر یہ جھوٹ بولتا ضرور اس کا اثر ظاہر ہوتا۔ اور اس کو اس کی سزا ملتی۔ لیکن یہ امر کہ جب شیطان نے دار الجزا اور دار آخرت میں جھوٹ بولا۔ تو اس کا اثر شیطان پر کیوں نہ مرتب ہُوا۔ اور کیوں سزا نہ ملی۔ اسکی

اُن کے لئے توبہ کرنے کے ثواب کا ضامن ہوا۔ اور جو شخص معصیتِ آدمؑ کو گناہ صغیرہ سمجھتا ہے۔ اس کے لئے یہی جواب ضروری ہے۔ کیونکہ جب اس سے کہا جائیگا۔ کہ ان کی توبہ کیونکر قبول کی گئی۔ اور کیوں ان کو معاف کیا گیا۔ حالانکہ ان کی معصیت دراصل مکفّرہ تھی۔ کہ اس کے مرتکب ہونے پر کسی قسم کے عقاب کے سزاوار نہ تھے۔ تو اس کو ہمارے مذکورہ بالا قول کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ چارہ نہیں ہے۔ اور جو شخص کہ اپنے نفس میں کسی قسم کی بُرائی نہیں

(بقیہ نوٹ) وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ شیطان پہلے خدا سے مہلت مانگ چکا تھا۔ کہ مجھ کو قیامت تک عذاب سے محفوظ رکھا جائے۔ اس لئے اس پر اثر ظاہر نہ ہوا۔ اور سزا نہ ملی۔ پس ظاہر ہے۔ کہ حضرت آدمؑ نے خلاف شریعت نہیں کیا۔ اور نہ شیطان کو شیطان سمجھ کر اُس کے بہکانے میں آئے ہیں۔ کیونکہ وہ اصل صورت میں نہ آیا تھا۔ بلکہ اس نے ایک فریب دیا۔ کہ حضرت آدمؑ تعظیم اسم حق کی وجہ سے اکل شجرہ پر مائل ہو گئے۔ اسی واسطے خدا فرماتا ہے۔ فدلّٰهما بغرور۔ کہ شیطان نے انکو دھوکے سے اس کی طرف مائل و آمادہ کیا۔ یہ نہیں کہ فاغولهما یعنی ان کو بہکایا۔ اور گمراہ کیا۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اگر ہم میں سے کوئی قسم اسم حضرت حق کی وجہ سے کسی فعل کا مرتکب ہو جائے۔ تو وہ گنہگار شمار نہ ہوگا۔ نہ اس کو گناہ صغیرہ کہا جاتا ہے اور نہ کبیرہ۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ اُس نے تعظیم اسم حضرت حق کی وجہ سے اُس فعل کو کیا ہے کچھ بعید نہیں کہ وہ مستحق ثواب ہو۔ لیکن چونکہ حضرت آدمؑ پیغمبر تھے۔ اور اُن کو بلا واسطہ خدا کی طرف سے وحی ہوتی تھی۔ وہ بلا واسطہ و وسیلہ خدا سے دریافت کرتے تھے اور کر سکتے تھے۔ لہذا شایان شان نبوت یہ تھا۔ کہ جس طرح اون کو بلا واسطہ خدا کی طرف سے نہی پہنچی تھی۔ کہ اس درخت کے پاس نہ جانا۔ اُسی طرح جب شیطان نے اُن سے یہ چال چلی تھی اور قسم کھائی تھی۔ کان الانسب والاولیٰ له لشان النبوة ان یسئل الله تعالیٰ هل الامر کذالک پس مناسب تھا کہ وہ خود خداوند عالم سے دریافت کرتے۔ کہ کیا یہ بات اسی طرح ہے جو یہ شخص کہتا ہے۔ یا ہم سے نہی اب مرتفع ہو گئی ہے۔ فترک ما کان اولیٰ له و انسب۔ پس انہوں نے وہ چیز ترک کی جو اُن کی شان کے لئے اولیٰ و انسب تھی۔ کہ انہوں نے دوبارہ خدا سے دریافت نہ کیا۔ اس واسطے کہا گیا۔ کہ حضرت آدمؑ نے ترک اولےٰ کیا۔ یہ یاد رہے۔ کہ ترک اولےٰ اُن کی شان کی جہت سے ہے۔ ورنہ ہمارے واسطے تو ترک اولےٰ بھی نہیں۔ کیونکہ قسم اسم حضرت حق سے حجت تمام ہو چکی تھی۔ یہ تھی اولےٰ لغزش جو حضرت آدمؑ سے صادر ہوئی۔ اگر نبی سے کوئی لغزش ہوتی ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ نہ اُن سے گناہ صغیرہ صادر ہوتے ہیں نہ کبیرہ۔ نہ قبل بعثت نہ بعد بعثت۔ اور یہی معنی ہیں ترک اولےٰ کے کہ

پاتا۔ اس کا محض انابت اور رجوعیت الی اللہ کی نیت سے توبہ کرنا مستحسن اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس موقع پر اس کے استحسان اور خوبی کی وجہ یہ ہے۔ کہ شخص اس کی وجہ سے مستحق ثواب ہوا۔ اور لطف الٰہی اس کے شامل حال ہوا۔ جیسا کہ توبہ کرنا اس شخص سے بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ جو قطعی طور پر جانتا ہو۔ کہ وہ عقاب الٰہی کا سزاوار نہیں۔ اور یہ کہ توبہ مستحق اور مقرر شدہ عقاب و عذاب کے ساقط کرنے میں ذرا بھر موثر نہیں ہے۔ اسی وجہ

(بقیہ نوٹ) اُن کی شان کے لئے جو اولےٰ و انسب ہوتا ہے۔ وہ اُن سے بعض اوقات ترک ہو جاتا ہے۔ گو ہماری شان کے لحاظ سے وہ کچھ بھی نہیں۔ اور انہی امور کے ترک سے وہ استغفار کیا کرتے ہیں۔ کہ خدا اپنی رحمت سے ہماری ان کمیوں کو ہمارے اعلےٰ اعمال حسنہ کے برابر کر دے۔ اور انہی امور کی وجہ سے توبہ کرتے ہیں یعنی نادم ہوتے ہیں۔ کہ اگر ہم سے یہ اولےٰ بھی ترک نہ ہوتا تو ہم کو ایک اور مرتبہ حاصل ہوتا۔ اور ثواب ملتا۔

یہاں سے حضرات ناظرین معنی قول اناظلمنا انفسنا (کہ ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا) کو بخوبی سمجھ گئے ہونگے۔ کہ وہ ظلم یہ نقص ثواب ہے۔ جو اولےٰ کے بجالانے سے ملتا۔ اصل ظلم کے معنی وضع الشئی فی غیر موضعہ کسی شئے کو اُس کے غیر مقام پر رکھنا۔ اور نقصان کے ہیں۔ پس چونکہ حضرت آدمؑ نے اُس اولےٰ کو اُس کے مقام پر نہیں رکھا۔ اور اُس کو بجا نہیں لائے۔ اس واسطے فرمایا۔ کہ ہم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا۔ کہ اگر اُس کو بجالاتے۔ تو یہ نقص وارد نہ ہوتا۔ اور یہ اثر نہ دیکھتے۔ جو کشف عورتین وغیرہ ظاہر ہوا۔ اسی سے تاب علیہ کا مطلب بھی حل ہو گیا۔ کہ خدا نے اُن کی توبہ قبول کی۔ کیونکہ توبہ کے اصل معنی اُس فعل سے رجوع کرنا اور اُس پر نادم ہونا ہیں۔ خواہ وہ فعل کیسا ہی ہو۔ لہٰذا مطلب یہ ہے۔ کہ جب حضرت آدمؑ اپنے اُس ترک اولےٰ پر نادم ہوئے۔ اور فرمایا۔ کہ اے خدا ہم نے ظلم کیا۔ اگر تو اس نقصان کو پورا نہ کریگا۔ اور ہم پر رحم نہ فرمائیگا۔ تو ہم خسارے میں رہینگے۔ غفر کے معنی لغت میں ڈھانپنے اور چھپانے اور کسی سوراخ اور فرجہ وغیرہ بھرنے اور پورا کرنے کو کہتے ہیں۔ اور چھپانیکی چیز یعنی پوشش۔ پس ان لم تغفر لنا کا یہ مطلب ہے۔ کہ اگر تو ہمارے نقص کو پورا نہ کریگا۔ جو ہمارے اس ترک اولےٰ سے واقع ہو گیا۔ تو ہم کو خسارہ رہیگا۔ پس ہم پر رحم کر۔ اور ہماری اس کمی کو پورا کر۔ ثم اجتبٰہ ربہ فتاب علیہ۔ جب حضرت آدمؑ اس طرح سے اپنے کئے پر شرمندہ ہوئے۔ تو خدا نے اُن کو برگزیدہ کیا۔ اور اُن کی اس التجا کو قبول کیا۔

یہ ہیں معنی توبہ اور ظلم کے۔ غور و تامل سے کام لینا چاہئے۔ یہ مناسب نہیں۔ کہ جہاں ظالمین آیا

سے علما نے صغائر سے توبہ کرنا جائز رکھا ہے۔ اگرچہ وہ ذم اور عقاب کے ساقط کرنے میں ذرا بھی مؤثر نہیں ہے ٭

اگر کوئی یہ کہے۔ کہ ظاہر قرآن سے تو تمہارے مذکورہ بالا بیان کے برخلاف ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن خبر دیتا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام کو درخت کے کھانے سے منع کیا تھا چنانچہ آیہ ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین اور آیہ الم انھکما عن تلکما الشجرۃ اس

(بقیہ نوٹ) تو گنہگار سمجھ لیا جہاں توبہ کا لفظ آیا۔ تو گناہ سے توبہ مراد لے لی۔ خصوصاً جب کہ یہ الفاظ انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہوں ٭

اب رہا یہ امر کہ خدا نے عصیان وغیرہ سے کیوں منسوب کیا۔ جیسا کہ فرمایا۔ وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ۔ اس کا جواب ضمناً تو آچکا ہے۔ کلام اول کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اور قبل اس کے کہ یہاں اس کی وجہی علت بیان کی جائے۔ ایک ضروری مقدمے کا بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ استعمال میں ہر ایک لفظ تین درجے رکھتا ہے۔ اوّل صحت اطلاق لفظ۔ کہ اُس لفظ کا اطلاق (بولنا استعمال کرنا) صحیح ہو خواہ کسی وجہ سے ہو۔ اور کسی مناسبت اور ملابست سے ہو حقیقۃً ہو یا مجازاً۔ من حیث الظاہر ہو یا باطن میں وغیرہ وغیرہ۔ دوم صدق مفہوم۔ کہ مفہوم اُس کا صادق آئے۔ اور وہ معنی نفس الامر میں اُس میں پائے جاتے ہوں۔ سوم مطابقت حقیقت واقعیہ۔ پس درجہ اطلاق لفظ عصیان۔ مطلق مخالفت و عدم متابعت ہے۔ خواہ منہی عنہ کے ارتکاب سے ہو۔ یا مامور بہ کے ترک سے۔ خواہ وہ واجب ہو۔ یا مندوب و سنت۔ اور درجہ دوم یہ ہے۔ کہ اُس نافرمانی و عدم متابعت کا مفہوم بھی متحقق ہو۔ اور نفس الامر میں واقع ہوئی ہو۔ اور درجہ سوم کفر مطلق اور اوس کی حقیقت واقعیہ ہے۔ کہ اصل حقیقت معصیت و نافرمانی وہاں پائی جاتی ہے۔ اور یہ تمام بدیہی و ضروری و مشاہد ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہے۔ کہ درجہ اول میں یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ معصیت نفس الامر میں واقع بھی ہوئی ہو۔ تب اطلاق ہو۔ بلکہ معمولی مناسبت اور ملابست سے لفظ بولا جا سکتا ہے۔ اور یہ وجہ حضرت آدمؑ میں ظاہر ہے۔ کہ صورت ظاہر میں حضرت آدمؑ کا یہ فعل خلاف تھا۔ گو حقیقۃً و نفس الامر میں انہوں نے معصیت نہیں کی۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن صورت ظاہر صورت معصیت ہے۔ اور یہی ظاہری عدم متابعت لفظ عصیان کے اطلاق کے واسطے کافی ہے۔ اور اطلاق باعتبار حاقِ معنیٔ لفظ ہے۔ اور غویٰ کے معنی یہاں گمراہی نہیں ہیں اُس کے معنی ناامیدی اور ناکامی کے ہیں۔ اور یہی صحیح ہیں۔ اور ناکامی حضرت آدمؑ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں۔

پر دال ہیں* اور اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت آدمؑ نے عصیان اور نافرمانی کی ہے۔ کہ منہی عنہ کو عمل میں لاتے ہیں۔ اور مامور بہ کو ترک کر کے عاصی نہیں ہوتے ہیں*

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ نہی اور امر دونو ہمارے نزدیک کسی خاص صیغہ سے مختص نہیں ہیں۔ جس میں احتمال اور اشتراک نہ ہو۔ کبھی تو لفظ نہی سے امر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی لفظ امر سے نہی کی جاتی ہے۔ اور نہی صرف اسی وقت نہی کے حکم میں داخل ہوتی ہے

(بقیہ نوٹ) اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہونگے۔ کہ جہاں عصیان و معصیت کا لفظ بولا جائے۔ اُس سے یہ ضروری نہیں۔ کہ گناہ ہی کے معنی سمجھے جائیں۔ بلکہ اُس کے منسوب الیہ اور مضاف الیہ اور قرائن حالیہ و مقالیہ کو ملحوظ رکھ کر معنی کرنے چاہئیں۔ پس عصیٰ اٰدمُ ربّہ و غویٰ سے ہرگز صدور گناہ حضرت آدمؑ سے ثابت نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اُس کا وقوع نفس الامر میں ثابت نہ کیا جائے۔ وھو عسیر جداً الا یمکن لاحد انشاء اللہ تعالیٰ*

اور یہ امر کہ اگر حضرت آدمؑ سے گناہ صادر نہیں ہؤا۔ تو پھر حضرت کیوں بہشت سے نکالے گئے۔ کیوں اہانت کی گئی۔ اور کس واسطے معتوب قرار پائے۔ پس جواب یہ ہے۔ کہ نہ حضرت گناہ کی وجہ سے نکالے گئے۔ اور نہ اُن کی اہانت کی گئی بہشت سے نکالا جانا اہانتہً و عقاباً نہ تھا۔ نتیجہ اور اثر تھا اُس درخت کے کھانے کا۔ کیونکہ ایک شئے کا اثر اور چیز ہے۔ اور اُس کی سزا و جزا اور چیز۔ اثر ضرور ہوتا ہے۔ اور وہ لازم ہے۔ اُس سے جدا نہیں ہوتا۔ لیکن سزا جزا دوسری شرائط پر موقوف ہے۔ دیکھو فرض کرلو۔ کہ تریاک (افیون) ممنوع اور منہی عنہ ہے۔ پس اگر کوئی شخص ہم کو زبردستی کھلادے۔ تو ہم گنہگار و تقصیروار نہیں کہلا سکتے۔ اور مستحق مذمت نہیں ہوسکتے لیکن افیون کا اثر جو نشہ اور سستی بدن وغیرہ ہے وہ کبھی سلب نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور ظاہر ہوگا۔ یا مثلاً کوئی شخص ہم کو اپنی شیطنت سے شیرینی میں زہر ملا کر کھلادے۔ تو ہم قصوروار نہیں ٹھہر سکتے۔ نہ عقلاً نہ شرعاً۔ لیکن اُس کا اثر سلب نہ ہوگا۔ وہ ضرور ظاہر ہوگا۔ یا فرض کرو۔ کہ ہم ایک ایسے باغ میں ہوں۔ جس میں جملہ سامان عیش موجود ہو۔ لیکن اُس کا کوئی دروازہ نہ ہو۔ یا اتنا بلند ہو۔ کہ ہم پہنچ نہ سکتے ہوں۔ اور اتفاق سے جب کہ ہم اُس کی فصیل پر ٹہل رہے ہوں۔ کوئی شخص دھوکے سے ہمارا پیر پھسلا دے۔ اور ہم گر پڑیں۔ تو ہرگز ہم مستحق مذمت نہیں ہوسکتے۔ اور تقصیروار نہیں ٹھیرائے جاسکتے۔ لیکن باغ سے خارج ہونا اور اُس کی نعمتوں سے محروم رہنا یہ ضروری امر ہے۔ یہ امور بطور نظیر ہم نے لکھے ہیں۔ انہی پر حضرت آدمؑ کو قیاس کر لیجئے۔ جس پر فازلھما

جب کہ منہی عنہ سے کراہت کی جائے۔ پس جبکہ اللہ تعالے فرمائے۔ لا تقربا ھٰذہ الشجرۃ (یعنی اس درخت کے قریب نہ جاؤ)۔ اور اس کے قرب کو مکروہ نہ جانتا ہو۔ تو فی الحقیقت نہی کا حکم نہیں دیتا۔ چنانچہ جب اللہ تعالے نے فرمایا۔ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ۔ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا۔ اور اس کا ارادہ نہو۔ تو وہ آمر نہ ہوگا۔ پس جبکہ صحیح طور پر ثابت ہوجائے کہ آیۂ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ سے ترک تناول کا ارادہ کیا گیا ہے۔ تو بالضرور

(بقیہ نوٹ) الشیطان عنہا شاہد ہے۔ کہ شیطان نے پیر پھسلا کر اُن کو بہشت سے نکالا۔ اور شیطان کی طرف نکالنے کی نسبت اور اضافت بھی ادنٰے مناسبت اور ملابست سے ہے۔ ورنہ فاعل حقیقی اخراج کا وہ نہیں ہے۔ بلکہ باعث و موجب ہے۔ بہرحال حضرت کا بہشت سے نکلنا از روئے عتاب نہ تھا۔ بلکہ اُس درخت کے کھانے کا اثر تھا جس طرح اور اثر کشف عورتین وغیرہ تھے۔ اور حضرت کا بہشت میں رہنا اسی شرط پر مشروط تھا۔ کہ وہ پھل نہ کھائیں۔ اور اب مصلحت اُن کے بہشت میں رہنے کی نہ تھی۔ اور وقت آگیا تھا۔ کہ اب وہ اپنے مقام خلافت پر جائیں۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ صاف دلالت کرتا ہے۔ کہ حضرت آدمؑ زمین ہی کے واسطے بنائے گئے تھے۔ پھر اُن کو زمین میں بھیجا جانا اہانت و عقاب کیسے ہوسکتا ہے۔ یا للعجب حضرت کا زمین میں اُتارا جانا اہانت و عقاب کہا جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت اُس وقت سے خلافت الٰہیہ پر مامور و مبعوث ہوتے ہیں۔ یہ عجب اہانت ہے۔ کہ خلافت فی الارض عطا ہوتی ہے۔ اور برگزیدہ بنائے جاتے ہیں۔ ثم اجتبٰہ ربّہ۔ ان اللہ اصطفٰے آدم و نوحاً و آل عمران علی العالمین۔

واقعاً مقام غور و تامل ہے۔ کس طرح ہوسکتا ہے۔ کہ ایک گنہگار مرتکب فعل قبیح برگزیدۂ خدا و مصطفٰے عند اللہ و خلیفہ و جانشین ہو۔ حالانکہ لا ینال عہدی الظالمین عام و مطلق ہے۔ یہاں سے مقام نبوت و شان نبوت معلوم ہوتی ہے۔ کہ حضرت آدمؑ کا ادنٰے لغزش سے طلب مغفرت کرنا بغرض اظہار عبودیت و کمال خشوع و خضوع تھا۔ نہ ارتکاب معصیت کے سبب۔ کہ یہ بزرگوار ایک نہایت معمولی لغزش اور مراتب عالیہ کے حصول میں ادنٰے پس افتادگی کو بھی بسبب اپنی علو شان اور کمال معرفت معبود بُرا سمجھتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کے اسی اظہار کمال عبودیت کو دیکھ کر رحمت واسعہ الٰہیہ جوش میں آئی۔ اور فوراً مجتبٰے کا خطاب عطا ہوا۔ اور خلافت دی گئی۔ واقعاً ان بزرگواروں کی کچھ شان ہی اور ہے۔ یہ مجسم اسرار لاہوتی ہوتے ہیں۔ اور اُس کی توحید کی دلائل وجودیہ۔

نکتہ۔ حضرت آدمؑ کو خلافت فی الارض کے لئے خلق فرمانے اور پھر بہشت میں ساکن کرنے اور

یہ قول امر ہوگا۔ اور سوا اس کے نہیں۔ کہ مامور بہ کو منہی عنہ اور نہی کو امر اس وجہ سے کہا کہ اس میں نہی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ تاکہ فعل سے باز رہنے اور اس سے بالکل پرہیز کرنے کی ترغیب دے۔ اور نفس فعل کی خواہش سے روکے۔ اور جب امر ہو۔ تو مامور بہ کی ترغیب اور اس کے ترک سے پرہیز پایا جائیگا۔ لہذا اس کو نہی کے نام سے نامزد کرنا جائز ہے۔ اور کبھی ان دونوں صفوں کا تداخل مشاہدے میں بھی آتا ہے۔ مثلاً کوئی کہے۔ قَدْ اَمَرْتُ

(بقیہ نوٹ) اس طرح وہاں سے علیحدہ کرنے میں عجیب نکتہ ہے۔ اور نہایت اعلےٰ مصلحت اور حکمت پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ حضرت آدمؑ ابوالبشر نبی اور خلیفہ خدا بنائے گئے تھے۔ تاکہ وہ بندگان خدا کی ہدایت کریں۔ اور اس ابدی اور لازوال زندگی کا رستہ بتائیں۔ جس کو دارالسلام۔ دارالقرار۔ دارالآخرۃ اور جنت (بہشت) کہا جاتا ہے۔ جو خلقتِ انسان کی غرض وغایت ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے واسطے اول خلیفہ۔ اول پیغمبر اور ابوالبشر کو پہلے اُس بہشت میں جگہ دی گئی۔ کہ اُس کی سیر کریں۔ اور اُس کی نعمتوں سے ایک خاص وقت تک متلذذ ہوں۔ اور علم الیقین سے گذر کر عین الیقین کا درجہ حاصل ہو۔ تاکہ بندگان خدا سے اُس کے چشم دید حالات اور اُس کی نعمتوں کی مفصل اور واقعی کیفیت نہایت آسانی اور سہولت سے بیان کر سکیں۔ اور سمجھا سکیں۔ کیونکہ منزلِ مقصود کی صحیح راہ نمائی اور ٹھیک تعریف وہی خوب کر سکتا ہے۔ جس نے خود دیکھا ہو۔ اور مشاہدہ کیا ہو۔

پھر اُن کا اس اضطراری اور مغضوبیت ومحزونیت کی حالت میں اُن نعمتوں سے جدا ہونا یہ دوسرا لطف پروردگار کا اپنے بندوں پر ہے۔ کیونکہ حضرت کا اس حالت اضطرار میں بہشت سے جدا ہونا اور اُس کے فراق میں سینکڑوں برس گریہ وبکا کرنا ہر ایک سننے والے اور دیکھنے والے کو یقین دلائیگا کہ واقعاً بہشت ایک چیز ہے۔ اور ایسی چیز ہے۔ کہ ایک خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور مخلص بندہ اُس کے فراق میں ایسا بے چین وبے قرار ہے۔ لہذا یہ فعل اُس کو طاعت خدا سے قریب کریگا۔ اور وہ بندہ اس پر آمادہ ہوگا۔ کہ کوشش کرنی چاہئے۔ اور ایسے عمل کرنے چاہئیں۔ جن کی وجہ سے ہم کبھی اُس بہشت کی سیر کریں۔

اگر حضرت آدمؑ خوشی کی حالت میں بہشت سے جدا ہوتے۔ تو تھوڑے ہی دنوں میں لوگ بھول جاتے۔ اور خیال بھی نہ رہتا۔ کیونکہ شادی کا موقع کم یاد رہتا ہے۔ اور جلد بھول جاتا ہے۔ لیکن غم ومصیبت کی داستان اور رنج والم کا قصہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ بچے

فُلاَنًا اَن لاَ یُلْقِیَ الاَمِیْرَ (میں نے فلاں کو حکم دیا ہے۔ کہ امیر سے نہ ملے)۔ حالانکہ قائل کی مراد صرف یہ ہے۔ کہ اس کو امیر کی ملاقات سے نہی کی ہے۔ اور یوں کہے۔ نَھَیْتُکَ عَنْ ھِجْرِ زَیْدٍ (میں نے تجھ کو زید کی جدائی سے نہی کی ہے)۔ حالانکہ قائل کی مراد صرف یہ ہے۔ کہ میں نے تجھ کو اس کی مواصلت کا حکم دیا ہے ؛

اگر یوں کہا جائے۔ کہ کیا تم نے نہی کو دو قسموں پر منقسم نہیں کیا؟ (۱) قبیح سے نہی کرنا۔

(بقیہ نوٹ) بچے کی زبان پر ہے۔ کہ آدمؑ بہشت سے نکلے۔ اور بہشت ایک چیز ہے۔ یہ مصلحت و حکمت کی۔ کہ زمین کے لئے بنایا۔ اور بہشت میں بسایا۔ کون جان سکتا ہے اُس کے اسرار کو لایسئل عما یفعل وھم یسئلون۔ وتعالی اللہ عما یصفون ؛

الغرض یہ کہنا کہ حضرت آدمؑ ازروئے عتاب وعقاب واہانت بہشت سے نکالے گئے قلت تدبر و عدم معرفت پر مبنی ہے۔ خصوصاً جب کہ بعض آیات اس امر پر دال ہیں۔ کہ ھبوط بعد قبول توبہ واقع ہوا ہے۔ فتلقی آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ انہ ھو التواب الرحیم و قلنا اھبطوا منہا جمیعًا۔ الخ۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ بعد قبول توبہ زمین پر اُتارے گئے ہیں۔ اور بعد قبول توبہ عتاب وعقاب کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے ؛

ہم نے کافی تشریح قصۂ حضرت آدمؑ کی کر دی ہے۔ اُس کے تفکر سے انسان بخوبی جملہ حالات کو سمجھ سکتا ہے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ اس بیان کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں۔ کہ تکلف کیا جائے۔ کہ نہی کو بمعنی امر لیا جائے۔ جس سے بظاہر بہت سی خرابیاں اصول احکام اسلام میں لازم آتی ہیں۔ اور جو بالکل مذہب محققین کے خلاف ہے۔ کہ نہ کوئی منہی عنہ رہتا ہے نہ مامور بہ۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ قرآن میں صاف ما نھٰکما و العرا نھٰکما وارد ہوا ہے۔ اور یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہی ہے۔ جس پر ظواہر آیات دال ہیں۔ اور جو ہر مسلمان کے لئے حجت ہیں۔ لہٰذا اگر اس کے برخلاف کوئی روایت وغیرہ پائی جائے یا سنی جائے۔ تو مسموع نہیں ہو سکتی۔ و ھذا ما الھمنی ربی۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ ؛

گو سیّد علیہ الرحمہ نے شجرے وغیرہ سے بحث نہیں کی۔ کہ وہ درخت کیا تھا جو حضرت آدمؑ نے کھایا۔ کیونکہ اس کا عصمت سے تعلق نہیں۔ لیکن اکثر مومنین سوال کیا کرتے ہیں۔ اس واسطے یہاں پر آپکی دلچسپی کیلئے کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔ جو انشاء اللہ فائدے سے خالی نہ ہوگا ؛

اس باب میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے۔ کہ وہ درخت گندم تھا۔ اور بعض علماء کے

(۲) ایسی چیز سے نہی کی نا جو قبیح نہیں۔ بلکہ اس کا نہ کرنا اس کے کرنے سے بہتر ہے۔ جیسا کہ امر کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ امر واجب۔ اور غیر واجب۔ تو ہم اس کا یہ جواب دینگے۔ کہ دونوں امروں میں فرق ظاہر ہے۔ کیونکہ ماموربہ کا ظاہر ہیں دو قسموں واجب اور غیر واجب پر منقسم ہونا غیر مدفوع ہے۔ اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ اور کوئی شخص اس امر کی تردید اور انکار نہیں کر سکتا۔ کہ افعال حسنہ جن کا بجا لانے والا مستحق مدح و ثواب ہوتا ہے۔

(بقیہ نوٹ) نزدیک درخت انگور تھا۔ اور بعض کے نزدیک درخت حسد تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک درخت تھا جس کے کھانے کا یہ اثر ہوتا ہے۔ اور بعض فرماتے ہیں۔ کہ وہ درخت علم تھا۔ اور وہ ایک درخت ہے۔ کہ جو اُس کا پھل کھائے۔ وہ بلا تعلیم علم غیب کا عالم ہو جاتا ہے وغیر ذالک من الاقوال۔ اور جو عام طور سے مشہور ہے۔ وہ درخت گندم ہے۔ اور اکثر محققین کے نزدیک درخت علم ہے۔

بہرحال یہ امر ظاہر ہے۔ کہ قرآن مجید اس باب میں ساکت ہے۔ ظواہر آیات سے بالکل ثابت نہیں۔ کہ وہ درخت کیا تھا۔ صرف اُس میں لفظ شجرہ آیا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ چونکہ قرآن میں لفظ شجرہ استعمال ہوا ہے۔ اور شجر عربی میں ایسے درخت کو کہتے ہیں۔ جس میں ساق (تنہ) ہو مثل درخت کھجور و انار وغیرہ۔ اور نجم درخت بے ساق کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں بھی ہے۔ کہ نبات کو ان دو قسموں پر منقسم کیا ہے۔ والنجم والشجر یسجدان۔ یعنی چھوٹے اور بڑے نبات سب اُس کو سجدہ کرتے ہیں۔ لہذا شجرہ کا اطلاق گندم و انگور پر مشکل ہے۔ نجم ہونا چاہئے تھا +

اور سب سے قوی احتمال یہی ہے۔ کہ وہ درخت علم تھا۔ اور اسی کو ہمارے اکثر مفسرین نے بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن قرائن حالیہ و نیز منطوق آیات اس کی کافی تائید نہیں کرتے۔ کیونکہ ظواہر آیات دلالت کرتی ہیں۔ کہ نقص مثل کشف عورتین وغیرہ اُس کے کھانے کا اثر تھا۔ جو فوراً کھاتے ہی ظاہر ہوا۔ پس اگر درخت علم ہوتا۔ تو ہرگز اُس کا یہ اثر نہ ہوتا۔ کیونکہ علم ہی اصل کمال اور عین کمال ہے۔ لہذا بعد حصول علم ناقصین و خاسرین نہیں ہو سکتے۔ حصول علم سے فاضلین و کاملین بلکہ عالین میں ہونا چاہئے تھا۔ نہ کہ ناقصین و خاسرین میں۔ نیز کوئی آیت یا حدیث اس بات کی شہادت نہیں دیتی۔ کہ اُس درخت کا پھل کھانے کے بعد حضرت آدمؑ کا علم کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ یا اسرار غیب و حقایق اشیا سے آگاہ ہو گئے تھے۔ اُن کا علم وہی علم اسماء رہا جو تعلیم اوسلے لنفخ روح قدس نے ہی

ان میں سے بعض تو واجب ہیں۔ اور بعض غیر واجب یعنی مندوب۔ پس جبکہ فعل واجب بجالانے کے ارادے اور استحقاق ثواب اور قابلیت مدح میں فعل مندوب کا شریک ہوا۔ تو اُس کو کراہتِ ترک کے سوا کوئی شے اس سے جدا نہیں کرتی۔ اس لئے کہ واجب کا ترک کرنا مکروہ ہے۔ اور نفل (فعل مندوب) کا یہ حال نہیں ہے۔ اب اگر ہم اس حکیم متعال کی کراہت کو قبیح اور غیر قبیح دو قسم پر منقسم کریں۔ اور اسی طرح نہی پروردگار کی بھی دو قسمیں کریں۔ جیسا کہ امر حق

(بقیہ نوٹ) سے حاصل ہوا تھا۔ لہذا اگر یہ درست ہو۔ کہ وہ علم کا درخت تھا۔ تو اگر بفرض محال آدمؑ گنہگار بھی ہو جاتے۔ لیکن علم کا اثر ضرور ظاہر ہوتا۔ اور وہ کامل ہو جاتے۔ کیونکہ علم ہی اصل کمال و فضیلت ہے۔ و اصل فائدہ و عین نعمت ہے۔ اور کوئی نعمت نعمت علم اور کوئی فضیلت فضیلت علم سے بڑھ کر نہیں۔

پس حق یہ ہے۔ کہ وہ درخت درخت دنیا کی حقیقۂ واقعیہ تھی۔ اس جملے کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ہر ایک شے کی اشیاء عالم سے ہر ایک نشاء اور عالم میں ایک صورت موجود ہے۔ اور ہر ایک عالم کی صورت دوسرے عالم کی صورت سے جدا اور مختلف ہوتی ہے۔ اور اُس کے احکام اور آثار بھی جدا ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک شے کی ایک حقیقت اصلیہ ہے۔ جہاں سے یہ متنزل ہو کر آئی ہے۔ ان من شیٔ الا وعندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔ نہیں ہے کوئی چیز مگر یہ کہ اُس کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور ہم نہیں نازل کرتے ہیں مگر بقدر معلوم۔ یہ آیہ شریفہ صریح دلالت کرتی ہے۔ کہ ہر ایک شے عند اللہ بہت سے خزانے اپنے وجود کے رکھتی ہے۔ اور ہر ایک عالم اور ہر ایک نشاء میں اُس کا وجود ایک خاص صورت و خاص کیفیت و کمیت میں ہوتا ہے۔ اور اُس کی حقیقت کے خزانوں اور اُس کی کلی و جزئی کیفیات سے وہی آگاہ ہے جس کے پاس وہ خزانے ہیں۔ یا جن کو اُس نے بتلایا۔ یا جن کے سامنے وہ حقایق بنائی گئیں۔ ہم بفحوائے منطوق آیہ اجمالاً اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہر ایک شے کے بہت سے وجود ہیں۔ اور ہر ایک شے کی ایک حقیقت اصلیہ ہے۔ جہاں سے وہ اس موجودہ مخصوصہ صورت میں حکم صانع سے متنزل ہوئی ہے۔ بنا علیہ ہم کہتے ہیں۔ کہ جملہ نباتات دنیا بھی من حیث المجموع ایک حقیقت واقعیہ اصلیہ رکھتے ہیں۔ اور اُسی حقیقت سے یہ متنزل اور متفرع ہوئے ہیں۔ پس وہ درخت جو حضرت آدمؑ نے کھایا درخت دنیا کی صورت اصلی و واقعی تھا۔ اور چونکہ درختہائے دنیا کی مجموعی صورت تھا۔ اُس میں جملہ درختوں کی حقیقت موجود تھی۔ اس واسطے احادیث میں اُس کو مختلف و متعدد ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اُس کے کھانے سے لباس بہشت و دار البقا اتر گیا۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ اُس کے کھانے کے بعد حضرت آدمؑ وہاں نہ ٹھیر سکے۔ اور دنیا ہی اُن کا

تعالےٰ کو واجب اور غیر واجب پر تقسیم کیا ہے۔ تو واجب اور مندوب کا باہمی فرق بالکل اُٹھ جائیگا۔ حالانکہ عقل کے نزدیک ان دونو کا جدا جدا ہونا ثابت اور متحقق ہے +

اب اگر کوئی کہے کہ قولہ تعالےٰ ربنا ظلمنا انفسنا جو حضرت آدمؑ و حواؑ کی زبانی ارشاد فرماتا ہے۔ اور قولہ تعالےٰ فتکونا من الظالمین کے کیا معنی ہیں؟

تو ہم اس کے جواب میں کہینگے کہ آیۂ اوّل کے معنی یہ ہیں۔ کہ اے پروردگار جو طاعت ہم سے طلب کی گئی تھی۔ اس کے بجالانے سے جو ثواب ہم کو ملتا۔ اس کے نہ بجالانے سے

(بقیہ نوٹ) مسکن قرار پایا۔ اس دنیا میں آنا اسی درخت دنیا کے پھل کھانے پر موقوف تھا۔ اور اسی مصلحت پر مشروط۔ اسی واسطے خداوند عالم نے فرمایا تھا۔ یا ادم ان ھذا عدو لک ولزوجک فلا یخرجنکما من الجنۃ فتشقی۔ کہ اے آدمؑ یہ (شیطان) تیرا اور تیری زوجہ کا دشمن ہے۔ (دیکھو) ایسا نہ ہو۔ کہ تم کو بہشت سے نکالے۔ اور تو پھر تم زحمت و تکلیف (دنیا) میں گرفتار ہو جاؤ۔ فتکونا من الظالمین۔ پس اسی وجہ سے حضرت آدمؑ اُس درخت کے کھاتے ہی تکالیف دنیا میں مبتلا ہو گئے۔ اسی واسطے سابقاً عرض کیا گیا۔ کہ حضرت آدمؑ کا بہشت سے نکلنا اور دنیا میں آنا از روئے عقاب و عتاب خداوندی نہ تھا۔ بلکہ اُس درخت کا اثر یہی تھا۔ اور خلافت فی الارض کے لئے دنیا میں آنا اسی پر مشروط تھا۔ اور اسی وقت پر موقوف فافھم و تدبر و ھذا وان لم یقرع سمعک ولکنہ ھو التحقیق فی النظر الدقیق واللہ عالم بالصواب والیہ المرجع والمآب +

ع۲ و خلقکم من نفس واحدۃ الخ۔ قال الرضا علیہ السلام ان حوا ولدت خمسمائۃ بطن فی کل بطن ذکرا و انثی۔ وحوا عاھد اللہ عج ودعواہ وقال لئن اتینا صالحا لنکونن من الشاکرین۔ فلما اتٰھما صالحا النسل خلقا بریا من الزمانۃ والعاھۃ وکان ما یاتیھما صنفین صنفا ذکرا وصنفا اناثا فجعل الصنفان للہ تعالےٰ ذکرہ شرکاء فیما اتٰھما فلم یشکراہ کشکر ابویہ لہ عج قال اللہ تعالےٰ فتعالی اللہ عما یشرکون۔ خلاصہ ترجمہ۔ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ کہ حضرت حواؑ پانچ سو بار جنیں۔ اور ہر ایک مرتبہ ایک نر اور ایک مادہ جنتی تھیں۔ اور حواؑ نے خدا سے عہد کیا تھا۔ اور دونو نے خدا سے دعا کی تھی۔ کہ اگر ہمارے صحیح و سالم اولاد ہو۔ تو ہم شکریہ ادا کرینگے۔ پس جب کہ خدا نے اُن کو اولاد صحیح الخلقہ اور تمام عیوب و نقائص و امراض سے سالم و محفوظ نر و مادہ عطا کی۔ تو دونو (نر و مادہ یا عورت و مرد) نے اللہ تعالےٰ عزوجل کے واسطے شریک قرار دئے۔ اُس چیز (اولاد) میں

ع نوٹ نمبر ۲ صفحہ ۳۳ سطر ۱۳ کے متعلق ہے +

ہم نے اپنے نفسوں کو نقصان اور خسارے میں ڈالا۔ اور اس ثواب عظیم کے سبب جو فائدہ جلیل ہم کو حاصل ہوتا۔ اس سے اپنے نفسوں کو ہم نے محروم کر دیا۔ اگرچہ ہم اس طاعت کے بجالانے سے پہلے اس ثواب کے مستحق نہ تھے جس کے بجالانے سے مستحق ہو جاتے پس استحقاق حکمی حاصل ہوا+ پس جائز ہے کہ جو شخص اپنے نفس سے ایسے استحقاق کو فوت کر دے۔ اس کو اپنے نفس کے حق میں ظالم کہا جائے۔ جیسا کہ اس شخص کو بھی ظالم کہتے ہیں کہ جو منافع مستحقہ کو اپنے نفس سے زائل کر دے۔ اور قول تعالے فتکونا من الظالمین کے یہی معنی ہیں +

اگر کوئی کہے۔ کہ جب کہ تمہارے قول کے بموجب حضرت آدمؑ سے معصیت سرزد نہیں ہوئی۔ تو اس صورت میں وہ بسبیل عقوبت بہشت سے کیوں نکالے گئے۔ اور ان کا لباس کس لئے اتار لیا گیا۔ اور اگر جنت سے نکالنا اور لباس اتارنا بسبیل عقوبت نہ ہوتا تو خدا یوں کیوں فرماتا۔ فوسوس لھما الشیطان لیبدی لھما ماوری عنھما من سوآتھما۔ اور دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔ فاخرجھما مما کانا فیہ +

(بقیہ نوٹ) جو اُن کو دی گئی۔ اور انہوں (اولاد حضرت آدمؑ) نے مثل اپنے والدین کے خدا کا شکر نہ کیا (بلکہ کفران نعمت کیا کہ اُس کے شریک قرار دئے)۔ فرمایا اللہ تعالے نے۔ فتعالی اللہ عما یشرکون خدا بزرگ و برتر ہے اُس سے جس کو شریک قرار دیتے ہیں۔ یہ حدیث اس آیہ کے جواب میں سید کی پہلی توجیہ کی تائید کرتی ہے۔ اور یہی بظاہر اشبہ بالحق ہے۔ ظاہراً یہ اس پر دال ہے کہ اصل خطاب مشرکین بنی آدم سے ہے۔ صدر آیہ میں بھی بصیغہ جمع خطاب ہے۔ وخلقکم من نفس واحدۃ الخ۔ اور ساقہ آیہ میں بصیغہ جمع ذکر کیا ہے۔ فتعالے اللہ عما یشرکون۔ لہذا اس آیہ شریفہ کو محض حضرت آدمؑ سے منسوب کرنا اور کچھ تخطیہ کرنا عدم وقوف پر مبنی ہے۔ خداوند عالم نے اول اس آیہ مبارکہ میں اپنی نعمت اولے یعنی اعطائے خلعت وجود اور اس کی کیفیت اور خلقت اور ولادت انسان کی کیفیت بیان فرمائی ہے۔ بعد ازاں نافرمان انسانوں کی ناشکر گذاری کا ذکر کیا ہے۔ اور مفہوم آیہ شریفہ توبیخ و سرزنش مشرکین ہے اُن کے شرک پر۔ اور مابعد آیہ بھی اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔ اور مسئلہ بالکل صاف ہے۔ ایشرکون ما لا یخلق شیئا وھم یخلقون ولا یستطیعون لھم نصرا ولا انفسھم ینصرون۔ (ترجمہ) کیا وہ شریک کرتے ہیں (طاعت و عبادت خدا میں)۔ اُن کو جو کچھ خلق نہیں کرتے۔ بلکہ خود مخلوق خدا ہیں اور

توہم اس کے جواب میں کہینگے کہ جنت سے نکال دینا عقاب کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ لذات اور منافع کا سلب کرنا داخل عقوبت نہیں ہے۔ اور عقوبت صرف مارنے اور رنج والم پہنچانے کو کہتے ہیں۔ جو بطور استخفاف اور اہانت کے وقوع میں آئیں اور ایسا ہی لباس اُتارنا اور کشف عورتین کرنا بھی اسی وقت داخل عقوبت ہو سکتے ہیں جبکہ استخفاف اور اہانت کے طور پر ہوں۔ اور جب کہ یہ امور عقاب اور غیر عقاب دونو طور پر ہو سکتے ہیں۔ توہم ان کو اس مقام پر عقوبت میں داخل نہیں کر سکتے۔ بلکہ غیر عقوبت پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ جائز نہیں ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام عذاب و عقاب کے سزاوار ہوں۔ پس جب کہ ان امور میں جو عقوبت کے طور پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ توان امور میں جو بطور عقوبت کے وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ بدرجہ اولےٰ ایسا کر سکتے ہیں۔

اب اگر کوئی کہے۔ کہ اگر بطور عقوبت ان امور کا وقوع نہیں ہوا۔ تو پھر کیوں ایسا ظہور میں آیا۔

توہم اس کا یہ جواب دینگے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے علم میں گزرا ہو۔ کہ مقتضائے مصلحت یہ ہے۔ کہ جب تک حضرت آدمؑ درخت کا پھل نہ کھائیں۔ اس وقت تک جنت ہی ان کا مسکن اور دار تکلیف رہے۔ پس جبکہ انہوں نے درخت کا پھل کھالیا۔ تو جنت سے ان کا نکالنا اور غیر جنت کو ان کے لئے دار تکلیف مقرر کرنا ہی مصلحت ہوا۔ اور سلب لباس میں بھی یہی جواب درست ہے۔ کہ جس طرح پھل کھانے سے پہلے لباس کے باقی رکھنے میں مصلحت تھی۔ اسی طرح بعد پھل کھانے کے اس کا اتارنا مصلحت ٹھیرا۔ اور ابلیس ملعون کو محض اس وجہ سے آدمؑ وحوا کو جنت سے نکالنے والا کہا گیا۔ کہ اس نے ان کو وسوسے میں ڈالا تھا۔ اور اس فعل کو ان کی نظروں میں زینت دی تھی۔ جس کے عمل میں لانے سے جنت سے نکالے گئے۔ اگرچہ جنت سے نکالنا اس فعل کی جزا دینے کے طور پر وقوع میں نہیں آیا۔ لیکن اس فعل کو نکالنے سے الشرط فے المصلحۃ کا تعلق ہے۔ یعنی یہ مصلحت مشروط

(بقیہ نوٹ) وہ اُن کی (مشرکین کی) کسی قسم کی مدد نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ اپنی ہی مدد کر سکتے اور اپنے واسطے کچھ کر سکتے ہیں پس مستحق عبادت واطاعت وہی خالق اور صانع ہے جس نے سب کو اس طرح نفس واحدہ سے خلق فرمایا۔ سبحان اللہ عما یصفون۔ بہرحال آیہ مجیدہ مشرکین کی توبیخ وسرزنش میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے تخطیہ سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

تھی شیطان کے بہکانے پر۔ **اسی طرح** ابلیس کو آدمؑ و حواؑ کے کشف عورتین کرنے والا کہا گیا۔ اس لئے کہ اس نے ان کو اغوا کیا کہ انہوں نے اس فعل پر اقدام کیا جس کی بابت علم الٰہی میں پہلے ہی گذر چکا تھا۔ کہ اس کے کرنے سے ان کا لباس اترجائیگا۔ **اور** جو شخص کہ معصیت آدمؑ کو گناہ صغیرہ خیال کرتا ہے۔ کہ شخص اس کے مرتکب ہونے سے عقاب کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس کو بھی ایسی ہی تاویل کرنی لازم و ضروری ہے۔ اور بھلا یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ اپنے نبی کو جنت سے نکالنے کی پاکرتی اور بہت اہانت۔ حالانکہ سزا میں استخفاف اور اہانت پائی جاتی ہے۔ اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ جس شخص کی اللہ تعالےٰ نہایت تعظیم اور بزرگی کے ساتھ ہم سے فرمانبرداری چاہتا ہے۔ وہ ہم سے اور اس جل شانہ سے استخفاف اور اہانت کا مستحق ہو۔ اور ایسا کون شخص ہے۔ جو ایسے شخص سے مطمئن ہو سکے۔ جس کا استخفاف اور اہانت کی گئی ہو۔ اور اس کی توبیخ اور سرزنش ہو چکی ہو۔ اور ایسی باتوں کو انبیا علیہم السلام کے حق میں وہی شخص جائز رکھ سکتا ہے۔ جو ان کے حقوق کی معرفت نہیں رکھتا۔ اور ان کے منازل اور مراتب کو نہیں پہچانتا۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے کہ تم آیۂ ذیل میں کیا کہتے ہو۔ کہ خدا فرماتا ہے۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا فَلَمَّا تَغَشّٰھَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِہٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰہَ رَبَّھُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰھُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰھُمَا فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ کیا اس آیت کے ظاہری معنی حضرت آدمؑ سے شرک کے وقوع پر دلالت نہیں کرتے کیونکہ اس سے پیشتر آدمؑ اور ان کی زوجہ حوا کے سوا اور کسی کا ذکر نہیں کیا۔ کہ اس تمام کلام میں اس کنایہ کو اس کی طرف پھیر سکیں۔ کیونکہ یہاں نفس واحدہ سے حضرت آدمؑ اور زوجہا سے مراد ان کی بیوی ہے جو ان سے پیدا ہوئی ہے۔ پس ظاہر آیات سے جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔ ہمارے ہی بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ حدیث میں مروی ہے۔ کہ حوا کا کوئی بچہ زندہ نہ رہتا تھا۔ ایک بار حالت حمل میں ابلیس ملعون اس کے پاس آیا۔ اور کہا۔ کہ اے حوا۔ اگر تو چاہتی ہے کہ تیرا بچہ جیتا رہے۔ تو اس کا نام عبد الحارث رکھنا۔ اور حارث ابلیس کا نام تھا الغرض جب حوا کا بیٹا جیتی۔ تو اپنے فرزند کا نام عبد الحارث رکھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰھُمَا۔

---

[1] دیکھو حاشیہ نمبر ۲ صفحہ ۳۰۲۔

اس کے جواب میں کہا جائیگا۔ کہ ہم جانتے ہیں۔ کہ دلالت عقلی جو ہم نے دیباچہ میں ذکر کی ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام کو کفر شرک اور معاصی سے منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔ غیر محتمل ہے۔ یعنی اس میں کسی قسم کا احتمال اور شبہ نہیں ہے۔ اور اس میں مجاز کو داخل کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور کلام الٰہی میں من الجملہ احتمال اور اقسام مجاز کو داخل کرنا صحیح ہے۔ پس اس لئے ضروری ہے۔ کہ محتمل کو غیر محتمل پر مبنی رکھا جائے۔ اگرچہ ہم کو اس آیت کی تاویل مفصل طور پر معلوم نہیں ہے۔ لیکن من الجملہ اتنا ہم کو معلوم ہے۔ کہ اس کی تاویل دلالت عقلی کے ضرور مطابق ہے۔ اور اس آیت کی تاویل دلیل عقلی کے مطابق منقول بھی ہوئی ہے۔ اور جو چند صورتیں لغت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مفصلہ ذیل ہیں ✤

صورت اول یہ کہ قولہ تعالے جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰھُمَا میں کنایہ حضرت آدمؑ اور حوّاؑ کی طرف راجع نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کی اولاد کے مردوں اور عورتوں کی طرف یا ان کی نسل میں سے دو مشرک جنسوں کی طرف راجع ہے۔ اگرچہ کنایہ اوّلے انہی دونو حضراتؑ سے متعلق ہے۔ اور تقدیر کلام الٰہی یہ ہے۔ فَلَمَّآ اٰتَی اللّٰہُ اٰدَمَ وَحَوَّآ الولد الصالح الذی تمنیاہ وطلباہ جعل کفار اولادھما ذلک مضافا الی غیر اللّٰہ تعالےٰ۔ یعنی جب اللہ تعالے نے آدمؑ و حوّاؑ کو فرزند صالح عطا فرمایا جس کی ان دونو نے اللہ سے خواہش کی تھی۔ تو ان کی کافر اولاد نے اس کو غیر خدا سے منسوب کیا ✤ اور اس تاویل کے قوی ہونے پر قولہ تعالے فتعالے اللہ عما یشرکون دلالت کرتا ہے۔ کہ اس میں یشرکون صیغہ جمع ہے۔ (جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مشرک بہت تھے۔ اور وہ اولاد آدمؑ میں سے تھے۔ نہ کہ خود آدمؑ و حوّاؑ اگر معاذ اللہ ان دونو کے شرک سے مراد ہوتی۔ تو یشرکان تثنیہ کا صیغہ آتا۔ مترجم) اور اس تاویل کی بنا اس امر پر ہے۔ کہ تثنیہ سے دو جنسیں یا دو نوعیں مراد لی جائیں جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ✤ اور یہ لازم اور ضروری نہیں ہے۔ کہ جس طرح کنایہ اوّلے آدمؑ اور حوّاؑ کی طرف راجع ہے۔ اسی طرح باقی تمام کلام کے کنایات بھی انہی دونو کی طرف راجع ہوں۔ اس لئے کہ فصیح شخص کبھی اپنے خطاب کو مخاطب سے غیر مخاطب کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اور ایک کنایہ کو چھوڑ کر اس کے مخالف کنایہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ پہلے رسول صلعم کی طرف خطاب کیا۔ پھر ان کو چھوڑ کر امت کی طرف مخاطب ہو گیا۔ پھر

فرمایا۔ وتعزروہ وتوقروہ۔ اس میں ضمیر رسول کی طرف راجع ہے۔ پھر فرمایا۔ وتسبحوہ۔ اس میں مُرسِل رسول یعنی خدا کی طرف پھرتی ہے۔ حالانکہ یہ کلام واحد اور متصل ہے۔ اور باہم فصل نہیں۔ اور کنائے باہم مختلف ہیں۔ اور شاعر ھذلی کہتا ہے ؎

یا لھف نفسی کان جدۃ خالد + وبیاض وجھک للتراب الاعفر

ترجمہ۔ (افسوس خالد کی کوشش اور اس کے منہ کی سفیدی خاک کے لئے تھی)۔ اس میں بیاض وجھہ نہ کہا +

اور کثیر کہتا ہے۔ شعر

اسیئی بنا او احسنی لا ملومۃ + لدینا ولا مقلیۃ ان تقلت

(تو ہم سے بُرائی کر یا بھلائی۔ ہم ملامت نہیں کرتے۔ اگر وہ دشمنی کرے۔ تو ہم دشمنی نہ کریں گے) پہلے (اسیئی اور احسنی) خطاب کا صیغہ اختیار کیا۔ پھر اس کو چھوڑ کر (تقلت) غائب کا صیغہ استعمال کیا۔

اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

فدی لک ناقتی وجمیع اھلی ومالی انہ منہ اتانی

ترجمہ شعر۔ (میرا ناقہ اور میرے تمام اہل وعیال اور مال سب تجھ پر فدا ہے۔ کیونکہ وہ اس سے یعنی تجھ ہی سے مجھ کو حاصل ہوا ہے)۔ اس شعر میں منک کی جگہ منہ استعمال کیا ہے (یعنی ضمیر مخاطب پہلے ذکر کی۔ بعد ازاں اس کی جگہ ضمیر غائب استعمال کی گئی۔ مترجم) +

اگر کوئی یہ کہے۔ کہ جس چیز کا ذکر پہلے نہ ہو چکا ہو۔ اس کی طرف کنایہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے۔ کہ یہ ممکن ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ حتیٰ توارت بالحجاب۔ یعنی آفتاب پردہ میں پوشیدہ ہو گیا۔ حالانکہ آفتاب کا ذکر پہلے نہیں آیا +

اور شاعر کہتا ہے شعر

لعمرک ما یغنی الثراء عن الفتی + اذا حشرجت یوما وضاق بھا الصدر

ترجمہ تیری جان کی قسم ہے۔ کہ جوان کو اس کی دولت وثروت کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ جبکہ گھنگرو بولنے لگے۔ اور سینہ تنگ ہو جائے +

حشرجت کی ضمیر نفس کی طرف راجع ہے۔ حالانکہ اس کا ذکر پہلے نہیں آیا + اور مثلہ

مذکورہ بالا کے سوا اس نے منہ اپنے بیان کرتے ہیں۔ اور اس مقام پر تو اولادِ آدمؑ کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ **نیز** ان کا ذکر آیۂ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ میں بھی آچکا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ خَلَقَكُمْ میں کُمْ سے تمام اولادِ آدمؑ مراد ہے۔ **نیز** آیۂ فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا میں بھی ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ کیونکہ معنی یہ ہیں۔ فلما آتاھما ولدًا صالحًا یعنی جب ان (مرد و عورت) دونوں کو **ولدِ صالح** عطا فرمایا۔ اور یہاں پر لفظ (صالحًا) اگرچہ واحد ہے۔ مگر مراد اس سے جنس ہے۔ اور جبکہ دو چیزیں پہلے مذکور ہو چکی ہوں۔ اور ان کے بعد ایسا امر ذکر کیا جائے۔ جو ان دونوں میں سے ایک کے مناسب نہ ہو۔ تو ضروری ہے۔ کہ اس کو ایسی چیز کی طرف منسوب کیا جائے۔ جس کے وہ مناسب ہو۔ اور شرک آدم علیہ السلام کے لئے سزاوار نہیں ہے۔ اس لئے کہ نفی شرک اس جناب علیہ السلام سے ضروری ہے۔ گو ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور شرک آدمؑ کی نسل اور اولاد کے کفار کے شایانِ حال اور مناسب ہے۔ اس لئے اس (شرک) کو انہی (اولادِ آدمؑ) سے منسوب کرنا ضروری اور واجب ہے +

صورت دوم وہ ہے۔ جو ابو مسلم محمد بن بحر اصفہانی نے ذکر کی ہے۔ کہ وہ آیۂ مذکورہ کو اس بات پر محمول کرتا ہے۔ کہ اس تمام میں کنایہ آدمؑ اور حواؑ سے متعلق نہیں ہے۔ اور تغشھا کی ہا اور دعوا اللہ ربھما اور اتاھما صالحا میں کنایہ کو مشرکوں کی طرف راجع کرتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ سوائے آیۂ خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا کے اور کسی آیت میں خطاب آدم علیہ السلام سے متعلق نہیں ہے۔ اور خلقکم میں عام طور پر خلائق کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ان میں سے بعض کو خاص کیا گیا ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ **ترجمہ** وہ خدا وہ ہے۔ جو تم کو خشکی اور دریا میں سیر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو۔ اور کشتیاں موافق ہوا کی مدد سے تم کو لے کر چلتی ہیں پہلے تمام کو تلبیہ سے مخاطب کیا۔ پھر راکب بحر کو خاص کیا۔ اسی طرح یہ آیت تمام بنی بشر کی بابت خبر دیتی ہے۔ کہ وہ نفس واحدہ اور اس کی زوجہ یعنی آدمؑ و حواؑ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پھر اس شخص کے ذکر کی طرف رجوع کی۔ جس نے اللہ تعالیٰ سے اپنا مدعا طلب کیا۔ پس جب اللہ نے اس کی مراد اس کو عطا فرمائی۔ تو اس کے عطیہ میں غیر خدا کو خدا کا شریک قرار دیا +

نیز ابومسلم کہتا ہے۔ کہ یہ بھی جائز ہے۔ کہ خدا نے ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ میں خاص مشرکین ہی سے مراد لی ہو۔ جب کہ تمام بنی آدمؑ نفس واحدہ اور اس کی زوجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس حالت میں آیہ خلقکم من نفس واحدۃ کے معنی یہ ہونگے۔ کہ خَلَقَ کُلَّ وَاحِدٍ مِنْکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَۃٍ یعنی تم میں سے ہر ایک کو نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے۔ اور اس کے نظائر قرآن اور کلام عرب میں کثرت سے موجود ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَاءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمَانِیْنَ جَلْدَۃً۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدَۃٍ مِنْھُمْ (یعنی ان میں سے ہر ایک کو اسّی کوڑے مارو) اور یہ صورت بلحاظ معنی کے پہلی صورت کے قریب ہے۔ گو ترتیب میں اس کے مخالف ہے ✤

صورت سوم یہ ہے۔ کہ قولہ تعالیٰ جَعَلَا لَہٗ شُرَکَاءَ میں ھا کی ضمیر ولد کی طرف راجع ہو۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف۔ اور معنی یہ ہونگے۔ انّہما طلبا من اللہ تعالیٰ امثالا للولد الصالح۔ یعنی ان دونوں نے اللہ تعالیٰ سے امثال ولد صالح طلب کئے۔ یعنی ویسی ولد صالح اور طلب کئے۔ اور دو درخواستوں میں اشتراک کیا۔ اور یہ قول خدا بمنزلہ اس شخص کے قول کے ہوگا جو کہے۔ طَلَبْتَ مِنِّیْ دِرْھَمًا فَلَمَّا اَعْطَیْتُکَ اَشْرَکْتَہٗ بِاٰخَرَ یعنی تو نے مجھ سے درہم طلب کیا جب میں نے تجھ کو درہم دے دیا۔ تو اس کو تو نے دوسرے کے ساتھ شریک کر دیا۔ یعنی اس کے ساتھ ہی دوسرا طلب کیا۔ اور اس صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ کنایہ اول سے لیکر آخر تک آدمؑ اور حواؑ کی طرف راجع ہو ✤

اب اگر کوئی کہے۔ کہ اس صورت میں قولہ تعالیٰ فَتَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ کے کیا معنی ہونگے اور یہ کہنا کیونکر درست ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بزرگ و برتر ہے۔ کہ اس سے ایک فرزند دوسرے فرزند کے بعد طلب کیا جائے ✤

تو ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کو اس اشتراک سے پاک نہیں کیا۔ بلکہ اپنے ساتھ شریک کرنے سے اپنے نفس کو بری کیا ہے ✤ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلام حکم اول سے جدا ہو۔ اور اس سے متعلق نہ ہو۔ اس لئے کہ خدا فرماتا ہے۔ اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ (یعنی کیا تم شریک کرتے ہو۔ اس چیز کو جو کچھ پیدا نہیں کرتے۔ اور وہ خود پیدا کئے گئے ہیں) اس سے معلوم ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے

نفس کو اس قسم کے شرک سے پاک کرتا ہے۔ نہ کہ قسم مذکورہ بالا سے۔ اور لفظ کا حکم میں ان الفاظ سے جدا ہونا ممتنع نہیں ہے جن سے وہ صورت میں متصل ہے۔ اور اس کی مثالیں قرآن اور کلام عرب میں بہت ہیں۔

شریف مرتضےٰ (یعنی خود مصنف) فرماتے ہیں۔ کہ قولہ تعالیٰ جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ میں خوبی ہے۔ جبکہ لفظ اول لفظ ثانی کے سوا ہو (یعنی پہلے لفظ سے ایک معنی لئے جائیں۔ اور دوسرے لفظ سے اور معنی لئے جائیں۔ مترجم)۔ اس لئے کہ عرب کی عادت یہ ہے۔ کہ الفاظ کی رعایت معانی سے زیادہ کرتے ہیں۔ بنا بریں جب اللہ تعالےٰ نے جعلا لہ شرکاء فیما آتاھما فرمایا۔ اور شرکاء سے اشراک فی طلب الولد مراد لیا۔ تو گویا دوسرے قول عما یشرکون کو لفظاً پہلے قول کے مطابق فرمایا۔ اگرچہ لفظ ثانی اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ کیونکہ وہ ذات پاک کسی کو بیٹا اور اس کی امثال بنانے سے بزرگ و برتر ہے۔ اور اسی کی مثل آنحضرت صلعم کا قول ہے۔ کہ کسی نے آپ سے عقیقہ کی بابت سوال کیا تھا۔ فرمایا لا احب العقیقة (العقوق) ومن شاء منکم ان یعق عن ولدہ فلیعق (فلیفعل)۔ ترجمہ (میں عقوقت یعنی نافرمانی والدین کو دوست نہیں رکھتا۔ اور جو شخص تم میں سے اپنے فرزند کا عقیقہ کرنا چاہے۔ وہ (عقیقہ) ضرور کرے) پس لفظ تو دونوں جگہ مطابق ہیں۔ گو معنی میں دونو مختلف ہیں۔ اور ایسا ان کے کلام میں بہت ہے۔

اور اس **باب میں** حدیث کو جو نظیراً پیش کیا گیا ہے۔ سو وہ قابل التفات نہیں۔ کیونکہ ضروری ہے۔ کہ احادیث دلائل عقلی پر مبنی ہوں۔ اور جو احادیث مقتضائے عقلی کے مخالف ہوں۔ وہ قبول نہیں کی جاتیں۔ اسی لئے ہم اخبار جبر و تشبیہ کو قبول نہیں کرتے۔ یا تو ان کی تردید کرتے ہیں۔ یا کچھ تاویل کر لیتے ہیں۔ اگر آسانی سے ہو سکے۔ یہ بھی اس حالت میں ہوتا ہے۔ جب کہ اس کی سند مطعون اور اس کا طریق مقدوح نہ ہو۔ اب اس حدیث کو لیجئے۔ اس کا راوی قتادہ ہے حسن سے اور وہ سمرہ سے۔ اور وہ حدیث منقطع ہے۔ کیونکہ بقول اہل بغداد حسن نے سمرہ سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ اور ایک اور وجہ سے اس حدیث پر وہن (ضعف) داخل ہوتا ہے۔ کیونکہ خود حسن نے اس حدیث کو اس روایت کے برخلاف بیان کیا ہے جس کو خلف بن

سالم نے اسحاق بن یوسف سے اور اس نے عوف سے اور اس نے حسن سے قولہ تعالےٰ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا میں قال ھم المشرکون روایت کی ہے۔ اور اس حدیث کے مقابلے میں وہ حدیث ہے۔ جو سعید بن جبیر اور عکرمہ اور حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس آیت میں شرک آدمؑ اور اُن کی زوجہ کی طرف منسوب نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ان دونو کے سوا اور لوگ مراد ہیں۔ اور یہ جملہ خوب واضح اور ظاہر ہے +

بیان تنزیہ نوح علیہ السلام

مسئلہ۔ اگر کوئی دریافت کرے۔ کہ آیہ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ (ترجمہ۔ اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا۔ اور عرض کی۔ کہ اے میرے رب۔ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ اور تیرا وعدہ حق ہے۔ اور تو احکم الحاکمین ہے۔ فرمایا پروردگار نے۔ اے نوحؑ۔ وہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نیک عمل نہیں۔ پس مجھ سے ایسا سوال نہ کر جس کا تجھ کو علم نہیں۔ میں تجھ کو نصیحت کرتا ہوں۔ کہ جاہل نہ بن) میں ظاہر قول تعالیٰ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ دلالت کرتا ہے۔ کہ اس میں قول نوح علیہ السلام إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي کی تکذیب ہے۔ جبکہ پیغمبر خدا پر جھوٹ کا بولنا تجویز نہیں کیا جا سکتا تو پھر فرمایئے۔ یہاں کیا صورت ہے +

جواب۔ اس سے کہا جائیگا۔ کہ اس آیت کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اور سب صحیح اور دلیل عقلی کے مطابق ہیں +

صورت اول یہ ہے۔ کہ پسر نوحؑ کا اہل سے نفی کرنا نسب کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کو صرف اس اہل سے نفی کرتا ہے۔ جن کی نجات کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا۔ کیونکہ خداوند متعال نے حضرت نوحؑ سے وعدہ فرمایا تھا۔ کہ میں تیرے اہل کو نجات دونگا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ (ترجمہ۔ ہم نے نوحؑ سے کہا۔ کہ کشتی میں ہر چیز کا جوڑا اور اپنے

اہل کو (سوائے اس کے جس پر میرا قول سبقت کر چکا ہے سوار کو لے) پس حضرت نوحؑ کے اہل میں سے جن کے غرق کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کو اہل سے مستثنیٰ کر دیا۔ اور اس تاویل کی صحت پر قول نوحؑ اِنَّ ابنی من اھلی و ان وعدک الحق دلالت کرتا ہے۔ اور اس صورت میں دونو خبریں باہم مطابق ہیں۔ اور ان میں ذرا منافات نہیں۔ اور بعینہٖ یہی تاویل ابن عباسؓ اور ایک جماعت مفسرین سے مروی ہے۔

صورت دوم یہ ہے۔ کہ قولہٖ تعالیٰ لیس من اھلک سے مراد یہ ہے۔ اِنَّہٗ لَیْسَ عَلٰی دِیْنِکَ یعنی وہ تیرے دین پر نہیں ہے۔ اور مقصود اس سے یہ ہے۔ کہ وہ کافر اور اپنے باپ کا مخالف تھا۔ گویا کفر نے اس کو حکم اہلبیت سے خارج کر دیا۔ اور قولہٖ تعالیٰ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ بطریق تعلیل وارد ہے۔ اس تاویل پر بتاتا ہے۔ پس ظاہر ہوا۔ کہ وہ شخص کفر اور بداعمالی کے سبب حکم اہلبیت سے خارج ہوا۔ اور یہ تاویل بھی ایک جماعت اہل تاویل سے منقول ہے۔

صورت سوم یہ ہے۔ کہ وہ درحقیقت ان کا بیٹا نہ تھا۔ بلکہ صرف ان کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ پس نوحؑ نے حسب ظاہر اس کو اپنا بیٹا کہا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کو جتلا دیا۔ کہ امر واقعی اس کے خلاف ہے۔ اور ان کو ان کی بیوی کی خیانت سے خبردار کر دیا۔ اور اس میں حضرت نوحؑ کی خبر کی تکذیب نہیں ہے۔ کیونکہ اس جناب نے اپنے ظن اور حکم شریعت کے مقتضا کے موافق یہ خبر دی تھی۔ پس اللہ نے ان کو غیب کی بات سے مطلع فرمایا۔ جس کو اس ذات متعال کے سوا کوئی معلوم نہیں کر سکتا۔ اور یہ تاویل حسن اور مجاہد اور ابن جریج سے مروی ہے۔ اور یہ تاویل عقل و قیاس سے بعید ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کے مخالف ہے۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَنَادٰی نُوحٌ ابْنَہٗ۔ یعنی اس پر فرزندی کا اطلاق کیا ہے۔ نیز اس لئے کہ خدا نے اس کو آیہ اھلک اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْہِ الْقَوْلُ سے اس کو اہل ہونے سے مستثنیٰ کیا ہے۔ نیز ایک یہ بھی وجہ ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام کا ایسی برائیوں سے پاک اور منزہ ہونا بھی واجب اور ضروری ہے۔ کیونکہ نہایت شرم و عار اور نقص قدر و منزلت کا باعث ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو ان کی تعظیم اور توقیر کے سبب اور ایسے امور کے دفع کرنے کے باعث جو ان کے اقوال کی قبولیت سے نفرت دلانے والے ہوں۔ اس سے بھی اپنے لئے

عیبوں سے پاک اور بری کر دیا ہے۔ اور ہماری مذکورہ بالا[1] دلیل کا قوی ہونا ابن عباسؓ کے قول سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جو قول تعالیٰ فخانتاھما کی تفسیر میں جو زنانِ نوحؑ و لوطؑ کے باب میں ہے۔ یہ تاویل فرماتے ہیں۔ کہ زنان نوحؑ و لوطؑ نے ان دو توبزرگواروں کی خیانت زنا سے نہ کی تھی۔ بلکہ ان کی خیانت یہ تھی۔ کہ زن نوحؑ تو لوگوں سے کہتی تھی۔ کہ نوحؑ (معاذ اللہ) مجنون ہے۔ اور زن لوطؑ اپنے گھر میں مہمانوں کے آنے کی خبر قوم لوطؑ کو پہنچاتی تھی۔ الغرض پہلی دونوں صورتیں نہایت معتمد اور معتبر ہیں۔ اب اگر کوئی یہ اعتراض کرے۔ کہ آیا مفسرین کی ایک جماعت اس بات کی قائل نہیں ہے۔ کہ آیۂ انہ عمل غیر صالح میں ھا کی ضمیر سوال کی طرف راجع ہے۔ اور معنی اس آیت کے یہ ہیں۔ کہ اے نوحؑ تیرا مجھ سے ایسا سوال کرنا جس کی بابت تجھکو علم نہیں ہے عمل غیر صالح ہے۔ کیونکہ نوحؑ کا سوال اور آپ کی رغبت کلام پاک میں اس طرح وارد ہے۔ ربّ انّ ابنی من اھلی وانّ وعدک الحق۔ اور حاصل معنی اس کے یہ ہیں۔ کہ اے پروردگار میرے اس بیٹے کو بھی نجات دے جس طرح تو نے میرے باقی اہلبیت کو نجات دی ہے ✦

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ آیۂ انہ عمل غیر صالح میں ھا کی ضمیر سوال کی طرف راجع ہو۔ بلکہ وہ ابن کی طرف پھرتی ہے۔ اور اس کلام کی تقدیر یہ ہے۔ ان ابنک ذو عمل غیر صالح۔ پس یہاں پر مضاف محذوف ہے۔ اور مضاف الیہ اس کا قائمقام ہے۔ اور اس تاویل کی صحت پر خنساء کا قول شاہد ہے

اشعار

مَا اُمٌّ سقب علی بوٍّ تطیف بہ ۔۔۔ قد ساعدتھا علی التحنان اطیارٌ

ترتع ما رتعت حتی اذا ادّکرت ۔۔۔ فانما ھی اقبالٌ و ادبارٌ

یہاں پر بھی اقبالٌ و ادبارٌ کے معنی بھی ذات اقبال و ادبار ہیں ✦

اور ایک جماعت کا قول ہے۔ کہ صورت سوم میں انہ عمل غیر صالح کے معنی انّہ اصلہ عمل غیر صالح ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت نوحؑ کے فراش پر پیدا ہوا تھا۔ اور در اصل ان کا بیٹا نہ تھا ✦ یہ جواب اس شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے جو در اصل اس کو حضرت نوحؑ کا

---

[1] تحقیق مذہب حقہ یہی ہے۔ کہ وہ حضرت نوحؑ ہی کا بیٹا تھا۔ ہرگز ولد الزنا نہ تھا (معاذ اللہ) اور یہ روایت مجہول موضوع ہے۔ اور کچھ تعجب نہیں۔ کہ توریت میں یہودیوں کی مخترعات و مفتریات سے لی گئی ہو ✦

پسر نہ جانتا ہو۔ حالانکہ ہمارا مختار اس کے برخلاف ہے۔ اور بعض قرائتوں میں آیۂ اِنَّہٗ عَمِلَ غَیْرَ صَالِحٍ بنصب لام وکسرۂ میم اور نصب غیر یعنی عَمِلَ غَیْرَ صَالِحٍ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس حالت میں بے شک و شبہ معنی کلام پسر نوح کی طرف راجع ہونگے۔ سوال نوح ؑ سے کچھ تعلق نہ ہوگا۔ اور ایک جماعت نے اس قرأت کو ضعیف ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ضروری ہوگا۔ کہ اِنَّہٗ عَمِلَ عَمَلاً غَیْرَ صَالِحٍ کہا جائے۔ اس لئے کہ عرب ھو یعمل غیر حسن نہیں کہتا۔ بلکہ ھُوَ یعمل عملاً غیر حسن کہتا ہے۔ حالانکہ یہ قرأت ضعیف نہیں ہے۔ اس لئے کہ اُن کا مذہب ظاہر یہ ہے۔ کہ انکشاف معنی اور عدم التباس کے وقت صفت کو موصوف کا قائمقام کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کہتا ہے۔ قد فعلتُ صوابا وقلتُ حسناً یعنی قد فعلتُ فعلاً صوابًا وقلت قولاً حسناً۔ اور عمرو ابن ابی ربیعہ مخزومی نے کہا ہے۔ شعر

اَیُّھَا القَائِلُ غَیْرَ الصَّوَاب ٭ اَخِّرِ النُّصْحَ وَاَقْلِلْ عِتَابِی

یعنی قولاً غیر الصواب۔ نیز دوسرے مقام پر کہا ہے۔ شعر

وَکَمْ مِنْ قَتِیْلٍ مَا یُبَاءُ بِہٖ دَمٌ ٭ وَمِنْ غَلِقٍ رَھْنًا اِذَا لَفَّہٗ الدَّمَا

وَمِنْ مَالِیٍٔ عَیْنَیْہِ مِنْ شَیْءٍ غَیْرِہٖ ٭ اِذَا رَاحَ نَحْوَ الْجَمْرَۃِ الْبِیْضُ کَالدُّمَا

اس میں کم من قتیل سے کم من انسان قتیل مراد ہے۔

اور ایک شخص بنی بجیلہ میں سے کہتا ہے۔ شعر

کَمْ مِنْ ضَعِیْفِ الْعَقْلِ مُنْتَکِثِ الْقُوٰی ٭ مَا اِنْ لَہٗ نَقْضٌ وَّ لَا اِبْرَامٌ

پہلے مصرع سے کم من انسان ضعیف العقل والقوی مراد اور مقصود ہے ٭

اگر کوئی اعتراض کرے۔ کہ اگر در اصل امر واقعی تمہارے ہی قول کے موافق ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے نوح ؑ سے یہ کیوں فرمایا۔ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ اِنِّیْ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ ٥ ترجمہ۔ تو مجھ سے وہ سوال مت کر جس کا تجھ کو علم نہیں میں تجھ کو نصیحت کرتا ہوں۔ کہ تو جاہل نہ بن ٭ اور حضرت نوح ؑ نے اس کے بعد یہ کیوں عرض کیا۔ رَبِّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْ اَکُنْ مِّنَ الْخَاسِرِیْنَ ٥ ترجمہ۔ اے پروردگار میں تجھ سے ایسا سوال کرنے سے پناہ مانگتا ہوں جس کا مجھ کو علم نہیں۔ اور اگر تو مجھ کو نہ بخشیگا اور مجھ پر رحم نہ کریگا۔ تو میں خسارہ

اٹھانے والوں میں ہونگا۔

ہم اس کے جواب میں کہینگے ممکن ہے۔ کہ نوح کو سوال ما لیس لہ بہ علم یعنی امر غیر معلوم کے سوال کرنے سے منع کیا گیا ہو۔ اگرچہ آپ سے ایسا سوال وقوع میں نہ آیا ہو۔ اور آپ نے اس سے درگاہ خدا میں استعاذہ کیا ہو۔ گو وہ سوال منہی عنہ وقوع پذیر نہ ہوا ہو۔ دیکھو۔ ہمارے جناب ختمی مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شرک اور کفر سے نہی کی گئی ہے۔ گو وہ آنحضرت صلعم سے کبھی وقوع میں نہیں آئے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ لئن اشرکت لیحبطن عملک (یعنی اے محمدؐ اگر تو شرک کریگا۔ تو ضرور تیرے اعمال حبط ہو جائینگے)۔ اور نوحؑ نے اپنے فرزند کی نجات کا سوال قطعی طور پر نہ کیا تھا۔

سلہ ظاہر آیہ سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے سوال کیا چنانچہ آیہ شریفہ ونادی نوح ربہ ان ابنی من اہلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین (اور نوحؑ نے اپنے پروردگار کو پکارا۔ کہ اے خدا) میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ اور تیرا سچا وعدہ سچا اور حق ہے۔ اور تو سب سے زیادہ حکم کرنے والا ہے) صاف بتلا رہا ہے۔ کہ حضرتؑ سے سوال واقع ہوا۔ اور مطلب حضرت کا یہی تھا۔ کہ اے خدا تو نے میرے اہل کی نجات اور اُن کے غرق سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور یہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ اس کو بھی نجات دے۔ اور غرق ہونے سے بچا۔ اُس وقت درگاہ الٰہی سے ندا آئی۔ کہ اے نوحؑ یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے یعنی تمہارا اہل وہی ہے جو تمہارا مطیع۔ پیرو اور فرمانبردار مومن ہو۔ اور یہ در اصل کافر ہے۔ اور تمہارا مطیع اور تمہارے دین پر نہیں۔ اور تمکو اس کے باطن کا علم نہیں ہے۔ لہذا شایان شان تمہارے یہ ہے۔ کہ تم ایسے امر کا سوال نہ کرو۔ جس کا تمکو علم نہ ہو۔ کیونکہ ہم نے جو تمہارے اہل کی نجات کا وعدہ کیا ہے۔ وہی اہل مراد ہیں جو تمہارے دین پر اور تمہارے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اور یہ ایسا نہیں ہے۔ پھر ہم اسکو کیسے نجات دے سکتے ہیں چونکہ تمکو اُس کے باطن کا علم نہیں۔ فان اللہ علیم بذات الصدور کہ دلوں کا حال خدا ہی جانتا ہے اس واسطے تمکو اُسکی بابت سوال کرنا مناسب نہیں۔ پس اس سے نہ حضرت نوحؑ کا جھوٹ بولنا ثابت ہے۔ اور نہ خدا کا اُن کے قول کی تکذیب کرنا۔ کیونکہ حضرت نوحؑ نے باعتبار ظاہر اپنا بیٹا ہونیکی وجہ سے اس کو اہل میں داخل کیا تھا جو ٹھیک اور درست ہے اور حضرت پر اُس کا کافر ہونا ثابت نہ ہوا تھا۔ خداوند عالم نے اُس کے باطن سے خبر دی۔ کہ یہ کافر ہے۔ اور تمہارے اہل سے نہیں۔ جن کی نجات کا ہم نے وعدہ کیا ہے۔ کیونکہ ہم نے

بلکہ صرف بشرط مصلحت کیا تھا۔ مگر جب اللہ تعالےٰ نے ظاہر کر دیا۔ کہ اس کے نجات نہ پانے ہی میں مصلحت ہے۔ تو یہ بات مضمون سوال سے خارج نہ ہوئی۔ اور قولہ تعالےٰ اِنِّیٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ کے معنی یہ ہیں۔ کہ میں تجھ کو نصیحت کرتا ہوں۔ کہ تو جاہلوں میں سے نہ ہو جائے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ کہ اللہ کا وعظ وہی ہے جو جہل سے ہٹائے۔ اور جہالت کو عمل میں لانے سے پاک کر دے۔ اور یہ بالکل واضح اور ظاہر ہے ٭

(بقیہ نوٹ) وعدہ ان اہل کی نجات کا کیا ہے۔ جو تمہارے دین پر اور تمہارے پیرو ہیں۔ اور باقی مستثنٰی ہیں۔ بہرحال اس کا انکار مشکل ہے۔ کہ سوال واقع نہیں ہوا۔ اور آیۂ لَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کا مطلب یہ ہے۔ کہ تم اُس کی نجات ہم سے طلب نہ کرو جس کی بابت تم کو علم نہیں۔ کہ وہ دراصل باطن میں کافر ہے۔ لہذا شان نبوت کے لحاظ سے اسلئے دانسب یہ تھا۔ کہ حضرتؑ کچھ ایسا سوال نہ کرتے۔ لیکن حضرتؑ نے اس اولےٰ کو ترک کیا۔ جو انبیاء پر جائز ہے۔ اور دراصل نہ یہ کوئی گناہ ہے۔ اور نہ قبیح اور ترک اولےٰ بھی وہی شان نبوت کے لحاظ سے ہے۔ ورنہ بہ نسبت اور مخلوق کے کچھ بھی نہیں ٭

اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس بیان سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کو اپنے بیٹے کے کفر کا علم نہ تھا اور اُس سے لاعلم و جاہل تھے اسی واسطے انکو نصیحت کی گئی۔ کہ تم کو جس بات کا علم نہیں اُسکا سوال نکرو میں تمکو نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں لاعلموں میں سے نہ بنو۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ بیشک ایسا ہی تھا اور حضرت نوحؑ کو باطن کا علم نہ تھا۔ اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ علیم مطلق ہر وقت اور ہر حالت میں ظاہر و باطن کا جاننے والا وہی حق سبحانہ تعالیٰ ہے۔ واللہ علیم بذات الصدور۔ واللہ یعلم ما تعلنون وما تخفی الصدور۔ دلوں کا حال وہی خوب جانتا ہے۔ عالم بالذات وہی ہے۔ انبیاء اُس کی تعلیم سے جانتے ہیں۔ اور اس باب میں انبیاء مختلف و متفاوت ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ پس حضرت نوحؑ کا اپنے بیٹے کے باطن سے اُس وقت تک آگاہ نہ ہونا جب تک کہ خدا نے اُن کو خبر نہ دی کسی طرح بھی اُن کی نبوت و عصمت میں نقص پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا۔ ظواہر آیات کے موافق ہے۔ واللہ عالم بالصواب ٭

بیان تنزیہ ابراہیم علیہ السلام

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ آیۂ ذیل جس میں اللہ تعالےٰ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰى كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِّيْنَ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ آیا اس آیت کے ظاہر معنی سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وہ جناب ایک زمانے میں کواکب کی خدائی کا اعتقاد رکھتے تھے۔ اور بقول تمہارے اس بات کا انبیاء علیہم السلام میں پایا جانا جائز نہیں ہے +

جواب۔ اس سے کہا جائیگا۔ کہ اس آیت کے دو جواب ہیں۔ (۱) یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام[1] نے یہ بات اس وقت کہی تھی۔ جب کہ آپ معرفت الٰہی میں غور و فکر کر رہے تھے۔ اور ان کی عقل کامل ہو چکی تھی۔ اور وہ سامان مہیا ہو چکے تھے۔ جن کے سبب

---

[1] ناظرین پر پوشیدہ نہ ہے۔ کہ کلام مجید میں جو تعریف و تمجید حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی وارد ہے محتاج بیان نہیں۔ اور حضرت کا روز ولادت سے عارف باللہ ہونا احادیث کثیرہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں جناب رسول خدا صلعم سے منقول ہے۔ کہ جب حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے۔ تو شام کا وقت تھا۔ اور غروب میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ پس جب حضرت ابراہیمؑ شکم مادر سے زمین پر تشریف لائے۔ تو آپ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سر و منہ پر ہاتھ پھیرا۔ اور چند مرتبہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ فرمایا۔ اور بعد ازاں کپڑا اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ اون کی مادر گرامی یہ عجیب حال دیکھ کر بہت ڈریں۔ پس حضرت ابراہیمؑ اپنی والدہ ماجدہ کے سامنے دوڑنے لگے۔ الیٰ آخر الحدیث۔ اور غالباً اس کی طرف خداوند عالم اپنے کلام پاک میں یوں اشارہ فرماتا ہے۔ ولقد اٰتینا ابراھیم رشدہ من قبل وکنا بہ عالمین ۔ بیشک ہم نے پہلے ہی سے ابراہیمؑ کو معرفت و ہدایت عطا کی ہے۔ اور ہم اُس کو جانتے ہیں۔ اور اُس کے حال سے آگاہ ہیں۔ اور شان نبوت بھی اسی کو مقتضی ہے۔ اور یہی دلائل عقلیہ نقلیہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ نبی مجبول و مخلوق بر نبوت ہوتا ہے۔ اور روز ولادت ہی سے وہ

اس جناب پر نظر قلبی سے دیکھنا واجب ہوگیا تھا۔ اور فکر اور تامل کے اسباب نے آپ کو تحریک کی تھی۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیمؑ عارف باللہ نہیں پیدا ہوتے تھے۔ بلکہ معرفت الٰہی کو اسی وقت حاصل کیا جب کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی عقل کو کامل کر دیا۔ اور ان کو اس بات سے ڈرایا کہ خواطر ودواعی یعنی خیالات قلبی اور خواہشات کی وجہ سے فکر و غور کو ترک نہ کرو۔ الغرض جب انہوں نے ستارہ کو کہ بروایت اہل تفسیر وہ زہرہ تھا۔ دیکھا۔ اور اسکی

(بقیہ نوٹ) نبی ہوتا ہے۔ اور عارف بعد پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا سید علیہ الرحمہ کا یہ قول کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ اُس وقت فرمایا تھا۔ کہ جب آپ غور و فکر کر رہے تھے۔ کیونکہ آپ عارف باللہ پیدا نہ ہوئے تھے خلاف تحقیق ہے۔ غالباً سید علیہ الرحمہ نے بنا بر مذہب مخالف و مخاصم بطور فرض و تقدیر فرمایا ہو۔ اور یہ ممکن ہے۔ ورنہ حضرت ابراہیمؑ پر سخت الزام آتا ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ استدلال بعد ولادت ہی تھا۔ جب کہ آپ کپڑا گند سے پرڈال کر چلے ہیں اور آسمان کی طرف نظر کی ہے۔ (کما فی البحار) +

احباب کو معلوم ہو کہ بفحوائے حکم رب العالمین ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ وجادلہم بالتی ھی احسن (بلا اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت سے اور موعظہ حسنہ سے۔ اور مناظرہ کر اُن سے ساتھ اُن (دلائل) کے جو نہایت اچھی ہوں)۔ انبیاء علیہم السلام کو ہدایت بندگان الٰہی میں مختلف طرق ہدایت و ارشاد اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ اور وہ ہدایت و ارشاد خلق اللہ پر نہایت ہی حریص ہوتے ہیں۔ اور یہی چاہتے ہیں۔ کہ کسی طرح یہ ہدایت پائیں۔ اور راہ راست پر آئیں۔ اور اس کی خاطر وہ طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کرتے ہیں۔ اور اس راہ میں وہ اپنی جان و مال و اولاد و عزت و آبرو کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتے۔ اور ہر طرح حجت تمام کرتے ہیں۔ اور نیز جن حکمت عملیوں کو وہ کام میں لاتے ہیں۔ اور جو اُن کو تعلیم کرتے ہیں سب من جانب اللہ اور بتعلیم الٰہی ہوتی ہیں +

اور نیز مطابق عقل اس حکم کو بھی ضرور مدنظر رکھتے ہیں۔ کہ شر قلیل بمقابلہ شر کثیر ہمیشہ خیر ہوتا ہے۔ اور برعکس اس کے خیر قلیل بمقابلہ خیر کثیر شر ہوتا ہے۔ مثلاً اپنی اولاد کو ہلاک کرنا۔ اور دیدہ و دانستہ اُن کو مخاطرہ میں ڈالنا یقیناً شر ہے۔ لیکن یہ شر بمقابلہ بربادیٔ دین و غلبہ کفر قلیل ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں شر اول جو قلیل ہے۔ اُس کو اختیار کرنا خیر ہے۔ اور مناسب ہے کہ اپنی اولاد کو قربان کر دے۔ اور دین کو بچائے۔ وقس علیٰ ذالک۔ اور یہ حکم

روشنی کو دیکھ کر اور اس کی عجیب خلقت سے متعجب ہو کر اس کو بڑا سمجھا۔ اور حضرتؑ کی قوم کے لوگ ستارہ پرست تھے۔ اور ان کو خدا سمجھتے تھے۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے اس ستارہ میں فکر و تامل کی راہ سے فرمایا۔ ھٰذَا رَبِّیْ (یہ میرا پروردگار ہے)۔ مگر جب وہ چھپ گیا۔ اور نظر سے غائب ہو گیا۔ اور معلوم کیا کہ غروب ہونا اِلٰہ (معبود) کے لئے جائز نہیں ہے۔ تو جان لیا کہ وہ حادث اور متغیر اور منتقل ہے۔ اور جس شے میں یہ اوصاف پائے جائیں

(بقیہ نوٹ) میں مطابق شریعت و موافق عقل ہے۔ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور اسی پر بناءِ اسلام ہے۔ اور اسی پر ہدایت انبیاء مبنی ہے۔ (اس اصول کو سمجھنے سے بہت سے شبہات رفع ہوتے ہیں۔ اور یہ اصول بہت سے مقام پر کام دیگا۔ قائل) ❖

بعد اس تمہید کے ہم کہتے ہیں۔ کہ اس شبہ کا بالحق جواب کی وہی شق ہے۔ جو سید علیہ الرحمہ نے سب سے آخر میں اختیار کی ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ فرمانا بطور استفہام انکاری تھا۔ جیسا کہ امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے۔ قال الرضا علیہ السلام ان ابراھیم وقع الی ثلثة اصناف صنف یعبد الزھرة وصنف یعبد القمر وصنف یعبد الشمس وذالک حین خرج من السرب الذی اخفی فیہ فلما جن اللیل ورای الزھرة فقال ھذا ربی علی الانکار والاستخبار فلما افل قال لا احب الآفلین لان الافول من صفات الحادث لا من صفات القدیم فلما رای القمر بازغًا قال ھذا ربی علی الانکار والاستخبار فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین۔ یقول لو لم یھدنی لکنت من القوم الضالین فلما اصبح رای الشمس بازغة قال ھذا ربی ھذا اکبر من الزھرة والقمر علی الانکار والاستخبار لا علی الاخبار والاقرار فلما افلت قال للاصناف الثلثة من عبدة الزھرة والقمر والشمس یا قوم انی بریٓء مما تشرکون انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین وانما اراد ابراھیم بما قال ان یبین لھم بطلان دینھم ویثبت لھم ان العبادة لا تحق لما کان بصفة الزھرة والقمر والشمس وانما تحق العبادة لخالقھا وخالق السماوات والارض وکان ما احتج بہ علی قومہ مما الھمہ اللہ و اٰتاہ کما قال عزّ و جلّ و تلک حجتنا اٰتیناھا ابراھیم علی قومہ ❖

وہ خدا نہیں ہو سکتی۔ یہی حالت چاند اور سورج کے دیکھنے میں گزری۔ اور جب آپ نے ان دونوں کا غروب ہونا دیکھا۔ تو قطعی طور پر جان لیا۔ کہ وہ حادث ہیں۔ اور ان کا معبود ہونا محال ہے۔ اور اپنے آخری کلام میں فرمایا۔ یَا قَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اور یہ قول اس وقت کا ہے جب کہ آپ کو معرفت الٰہی حاصل ہو گئی۔ اور ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ

(بقیہ نوٹ) یعنی حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ ایک گروہ وہ تھا۔ جو زہرہ کو پوجتے تھے۔ اور ایک گروہ وہ تھا۔ جو چاند کی عبادت کرتا تھا۔ اور ایک گروہ وہ تھا۔ جو آفتاب کی پرستش کرتا تھا۔ اور یہ اس وقت کا قصہ ہے۔ کہ جب آپ اُس غار سے نکلے جس میں پوشیدہ تھے۔ پس جب رات ہوئی۔ اور آپ نے زہرہ کو دیکھا۔ تو آپ نے بطور استفہام فرمایا۔ کہ کیا یہ میرا رب ہے۔ جب وہ غروب ہوا۔ فرمایا میں غروب ہونیوالے کو دوست نہیں رکھتا۔ کیونکہ غروب ہونا اور ڈوبنا حادث کی صفت ہے۔ نہ قدیم و واجب الوجود کی۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا۔ تو پھر بطور استفہام انکاری کہا۔ کیا یہ میرا پروردگار ہے۔ جب وہ غروب ہوا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ اگر مجھ کو میرا خدا ہدایت نہ کرتا تو میں ضالین میں سے ہو جاتا یعنی اگر مجھ کو خدا نے ہدایت نہ کی ہوتی۔ تو میں اسی قوم ضالین سے ہو جاتا (یعنی میں پہلے سے ہدایت یافتہ ہوں)۔ پھر جب صبح ہوئی۔ اور آفتاب کو چمکتا دیکھا۔ تو پھر فرمایا۔ کہ کیا یہ میرا رب ہے۔ یہ اُن دونوں یعنی زہرہ و قمر سے بڑا ہے۔ یعنی بطور استفہام انکاری (یعنی یہ میرا رب نہیں ہے) نہ اخبار و اقرار کے طور پر۔ پس جب وہ غروب ہوا۔ تو پھر آپ۔ نے تینوں گروہ زہرہ و قمر و شمس کی پرستش کرنے والوں سے فرمایا۔ اے قوم میں بری ہوں اُس شرک سے جس کے تم مرتکب ہو۔ میں نے اپنی وجہ کو اُس کے سپرد کر دیا ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ در آنحالیکہ میں اُسی کی طرف مائل و متوجہ ہوں۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی مراد اس بیان سے یہ تھی۔ کہ اُن کو اُن کے دین کا باطل ہونا ظاہر کریں۔ اور ثابت کر دیں۔ کہ عبادت اُس کے لئے لائق نہیں ہے۔ جو زہرہ و قمر و شمس یہی صفت رکھتا ہے۔ جو ممکن کی صفتیں ہیں۔ (بلکہ) بس عبادت اُسی کو شایاں ہے۔ جو ان (زہرہ۔ قمر۔ شمس) کا خالق اور زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور یہ جو کچھ حضرت ابراہیمؑ نے احتجاج و استدلال کیا۔ الہام خداوندی تھا جیسا کہ خداوند عالم

مخلوقین کی صفات سے اللہ تعالیٰ کو موصوف کرنا جائز نہیں ہے ؛

اب اگر کوئی اعتراض کرے۔ کہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ حضرتؑ نے ھٰذَا رَبِّی بطور اخبار کے فرمایا۔ حالانکہ آپ مخبر بہ کا علم نہ رکھتے تھے۔ اور ایسی چیز کی نسبت خبر دینا جس میں مخبر اپنے کاذب ہونے سے مطمئن نہ ہو قبیح ہے۔ اور جس وقت کہ آپ کی عقل کامل ہوگئی۔ اور غور و فکر آپ پر لازم ہوگیا۔ اس وقت آپ کو کذب اور اس قسم کے اور قبایح سے اجتناب کرنا بھی لابد اور ضروری ہوا ؛

(بقیہ نوٹ) خود فرماتا ہے۔ کہ یہ ہماری حجت اور دلیل تھی۔ جو ہم نے ابراہیمؑ کو دی اور الہام کی (اور اس طرح سے ابراہیمؑ نے اُن کے مذہب کو باطل ثابت کیا۔ اور حق کو ظاہر فرمایا) پس تھی وہ حکمت عملی جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کی ہدایت اور اُن کے مذہب کے ابطال کے واسطے اختیار فرمائی تھی۔ اور یہ تعلیم الٰہی اور وحی خداوندی تھی۔ جس کی خدا خود تصدیق فرماتا ہے۔ پس کون مسلمان ہے۔ جو اس آیت سے حضرت ابراہیمؑ پر کسی قسم کا الزام قایم کر سکتا ہے۔ الا من یقال فیہ اتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ اگر کوئی اعتراض کرے بھی۔ تو در اصل یہ اعتراض خدا پر ہوگا۔ نہ حضرت ابراہیمؑ پر۔ تعالی اللہ عما یصفون ؛

صدر آیہ مذکورہ اس امر پر دال ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو خداوند عالم نے حقایق و بواطن آسمان و زمین دکھلائے تھے۔ اور حضرت آسمان۔ چاند۔ تاروں کی حقیقت سے واقف تھے۔ اور جو کچھ حضرت نے ستاروں کے طلوع و غروب اُن کی حرکت و سکون اُن کے جھوٹے معبود ہونے پر استدلال فرمایا۔ وہ سب علی وجہ البصیرۃ تھا۔ نہ بطور ظن و گمان و بحیثیت تدبر و تفکر۔ چنانچہ آیہ یوں ہے — واذ قال ابراھیم لابیہ آزر اتتخذ اصناما الھۃ انی اراک وقومک فی ضلال مبین۔ وکذالک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض ولیکون من الموقنین فلما جن علیہ اللیل راٰ کوکبا۔ الآیۃ۔ ترجمہ۔ اور جب ابراہیمؑ نے اپنے مربّی و باپ آزر سے کہا۔ کیا تو بتوں کو معبود سمجھتا ہے۔ اور اُن کی پرستش کرتا ہے۔ میں تجھکو اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں (یعنی تم ظاہر بظاہر کھلے گمراہ ہو)۔ اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو دکھلاتے ہیں ملکوت سموات و ارض (حقایق و بواطن زمین و آسمان) تاکہ اسکو یقین کامل یعنی عین الیقین حاصل ہو۔ تاکہ ہماری قدرت کاملہ پر اُن سے استدلال کرے۔ اور ثابت کرے۔ کہ مستحق عبادت وہی ہے۔ جو ان کا خالق و صانع ہے۔ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ ستاروں وغیرہ کے حقایق و بواطن سے آگاہ تھے۔

اس اعتراض کے دو جواب ہیں +

جواب اول۔ یہ کہ حضرت نے یہ بات بطور اخبار کے نہ کہی تھی۔ بلکہ بسبیل فکر وتامل فرضی اور تقدیری طور پر فرمائی تھی۔ دیکھو ہم میں سے جب کوئی شخص ایک چیز میں غور کرتا ہے اور اس میں دو متضاد صفتوں میں سے کسی ایک صفت کے پائے جانے میں متردد ہو۔ تو اس کو زیبا ہے۔ کہ کسی ایک صفت کو اس میں فرض کرے۔ تاکہ اس مفروض کی صحت یا غلطی ٹھیک طور پر معلوم ہو جائے۔ اور ایسا کرنے سے وہ شخص اصل واقعہ کا خبر دینے والا نہیں کہلاتا + اسی سبب سے جب کوئی شخص اجسام کے حادث یا قدیم ہونے میں متردد ہو۔ تو اس کو ان کا قدیم فرض کر لینا صحیح ہے۔ تاکہ اس کو اس فرض کرنے کی خرابی معلوم ہو جائے +

جواب دوم۔ یہ ہے۔ کہ حضرت نے اپنے ظن سے یہ خبر دی تھی۔ اور جائز ہے۔ کہ فکر وتامل کرنیوالا شخص حالت غور وفکر میں بے اصل چیز کا گمان کر لے۔ اور بعد ازاں دلائل عقلی کے ساتھ اس سے رجوع کرے۔ اور یہ بات اس شخص سے قبیح نہیں سمجھی جاتی +

اشکال۔ اب اگر کوئی یہ کہے۔ کہ آیہ مذکورہ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت سے پہلے ان ستاروں کو نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ آپ ان کے مشاہدے سے ایسے متعجب ہوئے تھے۔ جیسے نہ دیکھنے والا متعجب ہوا کرتا ہے۔ پس یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ آپ نے عقل کے کامل ہونیکے وقت تک آسمان اور ستاروں کو کبھی نہ دیکھا ہو +

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے ممکن ہے۔ کہ حضرت نے اس وقت سے پہلے آسمان کو نہ دیکھا ہو۔ کیونکہ مروی ہے کہ آپ کو آپ کی والدہ ماجدہ نے نمرود کے خوف سے ایک غار میں جنا تھا۔ کہ مبادا وہ آپ کو قتل نہ کرا دے۔ اور جو شخص غار میں رہتا ہے۔ وہ آسمان کو نہیں دیکھا کرتا۔ پس جب آپ بالغ ہوئے۔ اور حد تکلیف کو پہنچے۔ غار سے

(بقیہ نوٹ) چہ جائیکہ صورت ظاہریہ۔ لہذا اُن کا ستاروں کی نسبت یہ استدلال فرمانا محض ستارہ پرستوں کے مذہب کا بطلان ثابت کرنے کی غرض سے تھا۔ نہ کسی اور جہت سے۔ نہ بغرض تدبر و تفکر۔ نہ برائے تعجب و استعجاب۔ نہ اخبار کے طور پر۔ اور نہ اپنی تسلی و اطمینان کے واسطے۔ (بعض احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُس وقت اُن کا سن شریف پندرہ مہینے کا تھا) فافہم وتدبر +

نکلے۔ اور آسمان کو دیکھا۔ اور اس میں غور و فکر کی + اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ آپ نے اس سے پہلے بھی آسمان کو دیکھا ہو۔ مگر اس کے نشانات و علامات میں غور نہ کی ہو۔ اس لئے کہ فکر کرنا اس سے پیشتر آپ پر واجب نہ تھا۔ جب عقل کامل ہوئی۔ اور خواطر قلبی نے آپ کو تحریک کی۔ تو جس چیز کو پہلے دیکھا تھا۔ اور اس میں غور و فکر نہ کی تھی۔ اب اس میں غور و فکر کی +

اور ایک وجہ اصل مسئلہ میں یہ ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کا قول جو آیات بالا میں مذکور ہے۔ نہ تو بطور شک کے تھا۔ اور نہ غور اور فکر کی حالت میں تھا۔ بلکہ آپ کو یقین حاصل تھا۔ اور خوب طرح جانتے تھے۔ کہ پروردگار عالمین میں کواکب کی صفات کا پایا جانا جائز نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ فرمایا۔ اپنی قوم کے عقاید کے انکار اور انکی تنبیہ کے طور پر تھا۔ کہ جو چیز غائب ہو جائے۔ اور چھپ جائے۔ وہ خدائے معبود نہیں ہو سکتی۔ اور آپ کا ھٰذا ربی فرمانا ہر دو وجوں میں سے ایک وجہ پر محمول ہوگا۔ اسے ھو کذالک عندکم وعلی مذاھبکم یعنی وہ تمہارے نزدیک اور تمہارے مذہب کے مطابق ایسا ہی ہے۔ جیسے ہم میں سے کوئی شخص مشبہ (تشبیہ دینے والا) سے اس کے قول کے انکار کے طور پر کہے۔ ھٰذا ربہ جسم یتحرک ویسکن (یہ اس کا پروردگار ہے؟ کہ ایک جسم ہے۔ جو متحرک ہوتا ہے اور ساکن ہوتا ہے) +

اور ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ حضرتؑ نے بطور استفہام کے فرمایا ہو۔ اور بوجہ عدم ضرورت کے حرف استفہام گر گیا ہو۔ اور اشعار میں ایسا اکثر ہوتا ہے چنانچہ اخطل شاعر کہتا ہے۔ شعر

کذبتک عینک ام رایت بواسط + غلس الظلام من الرباب خیالا

یعنی اکذبتک عینک۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

لعمرک ما ادری وان کنت داریا + بسبع رمین الجمر ام بثمان

یعنی ابسبع

اور ابن ابی ربیعہ کہتا ہے۔ شعر

ثم قالوا تحبہا قلت بہرًا + عدد الرمل والحصا والتراب

یعنی اَنحیہا۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے۔ کہ حرف استفہام کا حذف کرنا اس وقت بھلا لگتا ہے۔ جب کہ کلام میں کوئی قرینہ اس کے حذف کرنے کا پایا جائے۔ اور کوئی اور لفظ اس کے عوض میں مذکور ہو۔ پس بلا عوض کے ہرگز حذف ہمزہ مستعمل نہیں۔ اور جو اشعار مثالاً پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں پہلے حرف استفہام کا عوض موجود ہے۔ مگر آیت مذکورہ میں ایسا نہیں پایا جاتا۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ کبھی تو صرف استفہام عوض کی موجودگی میں حذف کیا جاتا ہے۔ اور جبکہ معنی استفہام میں کسی قسم کا التباس اور شک نہ ہے۔ تو بلا عوض بھی حذف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ابن ابی ربیعہ کا شعر حرف استفہام اور عوض سے بالکل خالی ہے۔ اور ابن عباس رض سے قولہٖ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ کی تفسیر میں اَفَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ مروی ہے بنابراں روایت کے الف استفہام یہاں سے محذوف ہے۔

پس جب کہ حرف استفہام کا حذف کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ خطاب اس پر دلالت کرتا ہے تو دلالت عقلی کی وجہ سے اس کا حذف کرنا کیونکر ناجائز ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ دلالت عقلی دلالت غیر عقلی سے اقویٰ ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ آیہ ذیل کے کیا معنی ہیں جس میں اللہ تعالےٰ حضرت ابراہیمؑ[1] کا حال بیان فرماتا ہے جب کہ آپ کی قوم نے آپ سے کہا۔ ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يَا اِبْرَاهِيْمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا

---

[1] انبیاء سابقین میں سے صرف حضرت ابراہیمؑ ہی ہیں۔ جن سے اخذ قصاص و اجرائے حدود و جہاد وغیرہ امور جو خصوصیات امامت سے ہیں صادر ہوئے۔ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ اور ظاہر بظاہر کھلم کھلا مخالفین سے مقابلہ و مجادلہ و مناظرہ کیا۔ ابتدائے عمر میں غار سے نکلتے ہی اپنی قوم کے مذہب کا ابطال عجیب و غریب حق براہین سے شروع کیا۔ اور اس طرح اُن کو قائل کیا۔ کہ جواب نہ دے سکے۔ اول غار سے نکلتے ہی ستارہ پرستوں کی خبر لی۔ اور اُن کے مذہب کو باطل کیا۔ جب گھر تشریف لائے۔ اور شہر میں بود و باش اختیار فرمائی۔ بُت پرستوں سے مناظرہ و مجادلہ شروع کیا۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔ کہ آزر اُن کا چچا بُت تراش و بُت فروش تھا اور بت خانے کا منتظم۔ بُت بنا بنا کر بیچنے کے واسطے اپنے بیٹوں کو دیا کرتا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام

يَنْطِقُوْنَ ۝ یہاں پر کبیر سے حضرت کی مراد صنم اکبر ہے۔ اور یہ جھوٹ ہے۔ کیونکہ کچھ شک نہیں ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ ہی نے ان بتوں کو توڑا تھا۔ مگر ان کا توڑنا ایسی چیز کے نام لگایا۔ جو کسی چیز کے کرنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔ پس حضرتؑ کا یہ فرمانا کہ بڑے بُت نے ان بتوں کو توڑا ہے۔ سراسر جھوٹ ہوا۔

(بقیہ نوٹ) اُس کے گھر میں آتے۔ اُن کو بھی وہ حسب قاعدہ بُت دیتا۔ کہ جاؤ۔ ان کو بازار میں فروخت کرو۔ حضرت ابراہیمؑ اُس بُت کی گردن میں رسی باندھتے اور بازار میں کھینچتے پھرتے اور فرماتے۔ ہے کوئی جو اس خدا کو خریدے۔ جو نہ سنتا ہے۔ نہ دیکھتا ہے۔ نہ کسی کو نفع بخشتا ہے۔ نہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اور پانی و کیچڑ میں اوس کو ڈالتے۔ اور فرماتے پی اس کو۔ پھر گھر لاکر آزر کے سامنے پٹخ دیتے۔ اور فرماتے تیرے اس خدا کو کوئی نہیں خریدتا۔ لوگ آکر آزر سے ابراہیمؑ کی شکایت کرتے تھے۔ اور حضرتؑ کو تنبیہ کرتا۔ جواب میں فرماتے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ کہ ایسی بیجان جماد کو پوجتے ہو۔ کہ اُس سے کسی قسم کا نفع و ضرر متصور نہیں۔ نہ وہ سنتا ہے۔ نہ دیکھتا ہے۔ اور حضرتؑ اس باب میں کچھ خوف نہ کرتے اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور برابر جہاد علمی کرتے رہتے تھے۔ جیسا کہ صاف و صریح طور پر قرآن میں مذکور ہے۔ ولقد اٰتینا ابراھیم رشدہ من قبل وکنا بہ عالمین۔ اذ قال لابیہ وقومہ ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون۔ قالوا وجدنا اٰباءنا لھا عابدین۔ قال لقد کنتم انتم واٰباؤکم فی ضلال مبین۔ قالوا اجئتنا بالحق ام انت من اللاعبین۔ قال بل ربکم رب السموات والارض الذی فطرھن وانا علیٰ ذالکم من الشاھدین۔ وتاللہ لاکیدن اصنامکم بعد ان تولوا مدبرین۔ الخ (سورہ انبیاءؑ) ایضاً (سورۂ مریمؑ) واذکر فی الکتاب ابراھیم انہ کان صدیقا نبیا۔ اذ قال لابیہ یا ابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا۔ یا ابت انی قد جاءنی من العلم مالم یاتک فاتبعنی اھدک صراطاً سویا۔ یا ابت لا تعبد الشیطان ان الشیطان کان للرحمان عصیا۔ یا ابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن فتکون للشیطان ولیا۔ (ترجمہ) اور البتہ ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی سے (قبل بلوغ۔ کما فی الحدیث) ہدایت و معرفت جو اُس کی شان نبوت کے لایق تھی عطا کی ہے۔ اور ہم اُس کو جانتے ہیں۔ اور اُس کے حالات سے واقف ہیں جب کہ اُس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا۔ کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن کو

جواب۔ اس سے کہا جائیگا۔ کہ اس آیت میں خبر مشروط ہے۔ کیونکہ حضرت نے فرمایا ہے اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ (اگر وہ بولتے ہیں) اور یہ معلوم ہے۔ کہ بُت بولتے نہیں۔ اور انکا بولنا محال ہے۔ پس جو فعل اس محال سے متعلق کیا جائیگا۔ وہ بھی محال ہوگا۔ اور اس قول سے حضرت ابراہیمؑ کی غرض صرف یہ تھی کہ بتوں کی عبادت کرنے پر کہ جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ نہ بولتے ہیں۔ نہ اپنی بات کی کسی کو خبر دے سکتے ہیں۔ اپنی قوم کو تنبیہ اور سرزنش کرے۔

(بقیہ نوٹ) تم پوجتے ہو۔ اور اُن کے مجاور بنے ہوئے ہو۔ انہوں نے کہا۔ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی ہی عبادت کرتے پایا ہے۔ (حضرت ابراہیمؑ نے) فرمایا۔ تم اور تمہارے باپ دادا سب گمراہ ہو۔ انہوں نے کہا۔ کہ تو سچ کہتا ہے یا ہنسی کرتا ہے۔ فرمایا (میں سچ کہتا ہوں۔ یہ معبود نہیں ہیں۔ جن کو تم پوجتے ہو۔ بلکہ) تمہارا ربّ وہ ہے۔ جو زمین و آسمان کا پروردگار اور اُن کا خالق ہے۔ اور میں اس بات پر گواہ ہوں۔ اور از رُوئے تحقیق و از راہ حجت و برہان میں یہ شہادت دیتا ہوں۔ نہ بطو تقلید کہتا ہوں۔ اور خدا کی قسم میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک حیلہ خفیہ کرونگا۔ جب تم ان کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ الیٰ آخرالآیہ۔ (سورہ انبیاء) (سورہ مریم) یاد کر کتاب میں ابراہیمؑ کو کہ وہ سچا اور نبی تھا۔ جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا۔ اے باپ کیوں ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے۔ جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے۔ اور نہ تجھ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اے باپ مجھ کو خدا سے وہ علم عطا ہوا ہے۔ جو تجھ کو نہیں پس تو میری پیروی کر۔ میں تجھ کو سیدھا رستہ بتلاؤنگا۔ اے باپ شیطان کی عبادت مت کر۔ کیونکہ شیطان خدا کا گنہگار و نافرمان ہے۔ اے باپ میں ڈرتا ہوں کہ تجھ پر خدا کا عذاب ہو۔ اور تو شیطان کا دوست بنے۔ الآیۃ +

بہرحال حضرت ابراہیمؑ ہمیشہ کھلم کھلا اپنے چچا آزر اور اُس کی قوم کو بدلائل عقلیہ و براہین حسیہ مجادلہ فرماتے رہتے تھے۔ اور اُن کے مذہب کا بطلان ثابت فرماتے اور ہر طرح اتمام حجت کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ کسی طرح یہ لوگ راہ راست پر آئیں +

جب اس استدلال سے بھی وہ لوگ راہ راست پر نہ آئے۔ تو حضرتؑ نے پھر ایک حیلہ کیا۔ اور ایک دوسری فکر کی۔ کہ جس سے اُن کے مذہب کا بطلان۔ اُن کے بتوں کی خدائی کا ابطال اور اُن کا اعدام بھی ہو جائے۔ لہذا حضرتؑ نے اُن کے توڑنے کا انتظام کیا۔ اور اپنے اُس قول کی تصدیق کی فکر کی۔ جو آپ نے فرمایا تھا۔ کہ میں تمہارے بتوں کے لئے ایک حیلہ خفیہ کرونگا۔ جبکہ تم اُن کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ اور اُن سے غافل ہو جاؤ گے۔ پس جب اُن کی کسی عید کا دن آیا۔

اس لئے فرمایا۔ اگر یہ بُت بولتے ہیں۔ تو یہ تحسیر یعنی بُت شکنی بھی انہی کا کام ہے۔ کیونکہ جو بول سکتا ہے۔ وہ کام بھی کر سکتا ہے۔ پس جب معلوم ہُوا۔ کہ ان کا بولنا محال ہے۔ تو یہ بھی معلوم ہُوا۔ کہ ان کا کام کرنا بھی محال ہے۔ اور ان دو امروں کے محال ہونے سے ثابت ہُوا کہ ان کا خدا سے معبود ہونا ناجائز اور نادرست ہے۔ اور جو کوئی ان کی پرستش کرتا ہے۔ وہ خود بھی گمراہ ہے۔ اور اوروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اور بلحاظ معنی اور مطلب کے

(بقیہ نوٹ) اور وہ سب وہاں جانے کو طیار ہوئے۔ حضرتؑ سے بھی کہا۔ کہ چلو۔ آپ تو اس موقع کے منتظر ہی تھے۔ اور اسی فکر میں تھے۔ اور متردد رہتے تھے۔ پس آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ کہ یہ سب عیدگاہ کو چلے جائیں۔ اور میں یہاں رہ جاؤں۔ اور جو مجھ کو کرنا ہے۔ کر گزروں۔ پس آپ نے یہاں رہ جانے کے واسطے ایک تدبیر سوچی۔ اور آپ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ کہ میں بیمار ہوں۔ (اور مراد جسمانی بیماری نہ تھی۔ بلکہ اپنی قوم کی ضلالت کی وجہ سے جو حزن و غم آپکو لاحق تھا وہ مراد ہے۔ اور جس طرح ایک علیل بیمار فکر علاج کرتا ہے۔ آپ اپنے اس حزن و غم کے علاج کی فکر میں متردد تھے۔ اور ستاروں کی طرف غالباً اس وجہ سے دیکھا کہ مشرکین کو آپ کے قول کا یقین ہو جائے۔ کیونکہ وہ لوگ ستارہ پرست تھے۔ اور ان میں منجم بھی تھے۔ اور اسی پر عمل کرتے تھے) پس جب وہ لوگ سب کے سب عیدگاہ کو چلے گئے۔ تو آپ بُت خانے میں تشریف لے گئے۔ اور ہر ایک بُت کے پاس جاتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ کھاؤ اس کو۔ کیوں نہیں کھاتے۔ اور پھر تیشہ مارتے تھے اور توڑ ڈالتے تھے۔ یہاں تک کہ سب کو توڑ ڈالا سوائے ایک بُت کے جو سب سے بڑا تھا۔ جس کو خداوند عالم یوں فرماتا ہے۔ وان من شیعتہ لابراھیم اذ جاء ربہ بقلب سلیم۔ اذ قال لابیہ وقومہ ماذا تعبدون ائفکا الھۃ دون اللہ تریدون فما ظنکم برب العالمین فنظر نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم فتولوا عنہ مدبرین فراغ الی الھتھم فقال الا تاکلون مالکم لا تنطقون فراغ علیھم ضربا بالیمین۔ الآیۃ۔ اور بیشک اُس (نوح علیہ السلام) کے شیعوں میں سے ابراہیمؑ ہے۔ کہ آیا وہ اپنے خدا کی طرف خلوص دل سے۔ جب کہ اُس نے (ابراہیمؑ) اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا۔ یہ کس کی عبادت کرتے ہو۔ کیا خدا کے سوا دوسرے جھوٹے معبودوں کو پوجتے ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا خداوند عالم رب العالمین کی نسبت (کہ در اصل وہ مستحق عبادت ہے اُس کی عبادت کرنی چاہیئے۔ نہ ان

قول اِنَّہُمْ فَعَلُوْا ذٰالِکَ اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ اور اِنَّھُمْ مَا فَعَلُوْا ذٰالِکَ وَلَا غَیْرَہٗ لِاَنَّھُمْ لَا یَنْطِقُوْنَ وَلَا یَقْدِرُوْنَ میں کچھ بھی فرق نہیں ہے ÷

رہا آپ کا قول فَاسْئَلُوْھُمْ سو یہ امر بھی بالشرط تھا۔ اور ان کا بولنا دونوں امروں میں شرط ہے۔ گویا آپ نے یہ فرمایا۔ اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ فَاسْئَلُوْھُمْ فَاِنَّہٗ لَا یَمْتَنِعُ اَنْ یَکُوْنُوْا فَعَلُوْہُ۔ (اگر یہ بولتے ہیں پس تم ان سے پوچھ لو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ کام کیا ہو) اور

(بقیہ نوٹ) اینٹ پتھروں بیجان چیزوں کی)۔ پھر آپ نے ستاروں کو دیکھا۔ اور کہا۔ میں سقیم القلب ہوں۔ پس وہ اُس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پس وہ چپکے سے اُن کے معبودوں کی طرف گئے۔ اور کہا۔ کہ تم کیوں نہیں کھاتے۔ اور تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم بولتے نہیں۔ پس پھر اُس نے اُن بتوں کو مارنا شروع کر دیا۔ فجعلھم جذاذا الا کبیرا لھم لعلھم الیہ یرجعون پس سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا سوائے ایک بڑے بت کے۔ تاکہ اُس کے پاس آئیں۔ اور اُس کی طرف رجوع کریں۔ فاقبلوا الیہ یزفون۔ پس وہ لوگ حضرت کی طرف دوڑتے ہوئے آئے۔ قالوا من فعل ھذا بالھتنا انہ لمن الظالمین۔ اور کہا کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ فعل کیا۔ بیشک اُس نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ قالوا سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیمؑ۔ کہا کہ ایک جوان ہے۔ جوان کو (بتوں کو) بری طرح یاد کرتا ہے۔ اور اوس کو ابراہیمؑ کہتے ہیں۔ قالوا فاتوا بہ علی اعین الناس لعلھم یشھدون۔ کہا کہ اُس کو لوگوں کے سامنے لاؤ۔ تاکہ اُس کو دیکھیں۔ جب حضرت تشریف لائے۔ قالوا انت فعلت ھذا بالھتنا یا ابراھیم اور کہا انہوں نے۔ کہ اے ابراہیمؑ کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ فعل کیا ہے۔ پس حضرت ابراہیمؑ نے بطور تعریض و استہزاء اور اُن کو شرمندہ و لاجواب کرنے اور اُن کی غلطی پر تنبیہ اور اُن کے مذہب کا بطلان حسی طور پر ثابت کرنے کی غرض سے فرمایا۔ بل فعلہ کبیرھم فاسئلوھم ان کانوا ینطقون۔ بلکہ اس بڑے (بت) نے کیا ہے۔ اس سے پوچھو۔ اگر یہ بولتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا یہ جواب لاجواب سُن کر سب خاموش رہ گئے۔ اور شرمندہ ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگا۔ کہ دراصل تم ہی ظالم ہو۔ اور تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ کہ اس سے جھگڑے۔ اور بحث کی۔ فرجعوا الی انفسھم فقالوا انکم انتم الظالمون۔ جب کچھ نہ بن پڑا۔ اور شرمندہ ہوئے۔ تو پھر کہنے لگے۔ لقد علمت ما ھؤلاء ینطقون۔ البتہ تو تو جانتا ہے۔ کہ یہ بولتے نہیں۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ اتعبدون من

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے سے پوچھے۔ مَنْ فَعَلَ ھٰذَا الفِعل (یہ کام کس نے کیا ہے)۔ وہ جواب دے۔ زَیْدٌ اِنْ کَانَ فَعَلَ کَذَا وَکَذَا (زید نے کیا ہے۔ بشرطیکہ اس نے فلاں کام کیا ہو)۔ اور اس کام کی طرف اشارہ کرے جس کو پوچھنے والا زید کی طرف منسوب کرتا ہے۔ حالانکہ دراصل وہ کام اس نے نہیں کیا۔ اور مسئول (جواب دینے والا شخص) کی غرض یہ ہے۔ کہ دونوں کاموں کی زید سے نفی کرے۔ اور سائل کو اپنی خطا پر متنبہ کر دے۔ کہ اس نے اس فعل کے زید کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کی ✦

(بقیہ نوٹ) دون اللہ مالا ینفعکم شیئاً ولا یضرکم اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ افلا تعقلون۔ پس کیا تم خدا کے سوا ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو۔ کہ تمکو نہ کچھ نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان (نہ تمہاری بات کا جواب دے سکتے ہیں۔ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ نہ اپنی حفاظت پر قادر ہیں۔ تم کیوں ان کی عبادت کرتے ہو۔ مستحق عبادت وہی ذات واجب الوجود ہے۔ جو متصرف فی الامور نفع وضرر پر قادر ہے) کیا تم نہیں سمجھتے۔ پس وائے ہو تم پر اور تمہارے جھوٹے معبودوں پر۔ اتعبدون ما تنحتون واللہ خلقکم وما تعملون۔ کیا تم اُن کی عبادت کرتے ہو۔ جن کو خود اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو۔ حالانکہ خدا نے پیدا کیا ہے تمکو اور ان مورتوں کو جو تم بناتے ہو۔ پس عبادت اُس کی شان کے شایاں ہے۔ جو خالق کل شئی ہے۔ نہ ان اینٹ پتھروں کی۔ حضرت ابراہیمؑ کا یہ مسکت اور بُرھانی جواب سُن کر وہ لوگ نہایت خفیف ہوئے۔ اور جب کچھ نہ بن پڑا۔ تو مناظرہ سے گذر کر لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہوئے۔ جو جہال کی عادت ہے۔ اور ایک ملعون نے کہا حرقوہ۔ اس کو آگ میں جلاؤ۔ (یہ کہنے والا نمرود مردود تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک کُرد تھا۔ اور نام اُس کا صیون تھا جو زمین میں دھنس گیا تھا) وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ اور اس شخص سے انتقام لو۔ اگر تم مدد کرنا چاہتے ہو۔ وابنوا الہ بنیانا فالقوہ فی الجحیم۔ ایک عمارت بناؤ (اور اُس میں آگ روشن کرو)۔ اور اُس کو اُس آگ میں ڈال دو۔ جب اُن ظالمین نے یہ تدبیر حضرت ابراہیمؑ سے انتقام لینے کی سوچی اور آگ روشن کر کے حضرتؑ کو اُس میں ڈالا۔ حضرتؑ خلیل اللہ تھے۔ نصرت ورحمتِ خدا ہر حال میں شامل حال تھی۔ کیونکہ جو کچھ آپ کر رہے تھے۔ سب بحکم خدا دین خدا کے قایم کرنے کے واسطے کیا تھا۔ پس اُس ارحم الراحمین کا حکم پہنچا۔ یانار کونی بردا وسلاما علیٰ ابراھیمؑ۔ اے آگ ابراہیمؑ پر سرد اور سلامتی ہو جا۔ (یعنی کسی قسم کی اذیت اُن کو پہنچنے پائے۔ (الفاظ سر نازل

اور ایک قاری محمد بن سمیفع یمانی نے فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ کو فَعَلَّہٗ بتشدید لام پڑھا ہے جو فلعلہ کے معنی میں ہے۔ یعنی فَلَعَلَّ فَاعِلُ ذٰلِکَ کَبِیْرُھُمْ (شاید اس فعل کا فاعل بڑا بُت ہے)۔ اور عرب کی عادت ہے کہ لَعَلَّ کے پہلے لام کو حذف کر دیتے ہیں۔ اور عَلَّ کہتے ہیں چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ شعر

عَلَّ صُرُوفَ الدَّھْرِ اَوْ دَوْلَاتِھَا ٭ تُدِیْلُنَا اللَّمَّۃَ مِنْ لَمَّاتِھَا

فَتَسْتَرِیْحَ النَّفْسُ مِنْ زَفَرَاتِھَا

ایک اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

یَا اَبَتَا عَلَّکَ اَوْ عَسَاکَا ٭ یَسْقِیْنِیَ الْمَآءَ الَّذِیْ سَقَاکَا

(بقیہ نوٹ) ہوتے ہی حضرت ابراہیمؑ کو ایسی سردی محسوس ہوئی کہ کانپنے لگے۔ اگر لفظ سلام نہ ہوتا۔ تو شدت سردی سے تکلیف اُٹھاتے۔ اور برداشت نہ کر سکتے) یہ تدبیر اُنکی کارگر نہ ہوئی۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ اور سوائے حسرت و افسوس و خسر الدنیا والآخرہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ فان کلمۃ اللہ ھی العلیا فارادوا بہ کیدا فجعلنا ھم الاخسرین انھوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ مکر و فریب کا ارادہ کیا۔ ہم نے اُن کو سب سے زیادہ زیاں کار بنا دیا۔ اور اُن کو کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا ٭

یہ تھی وہ سری حکمت عملی جو حضرت ابراہیمؑ نے بُت پرستوں کی غلطی اور اُن کے مذہب کا بطلان حسی طور پر ثابت کرنے کے واسطے اختیار کی۔ یہ حضرت ابراہیمؑ ہی کا جگر تھا کہ ہزاروں ظالم بیدین دشمنوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہے۔ ایک تن تنہا شخص نے ہزاروں سے مناظرہ و مباحثہ کیا۔ اور اپنی حکمت عملی سے سب پر غالب آئے۔ اور ایک قسم کا جہاد بھی کیا۔ اُن کے بتوں کو فنا کر دیا۔ اور اون کو ایسا لاجواب کیا۔ کہ بول نہ سکتے تھے۔ بُت خانے میں بتوں سے کھانے پینے بولنے کا سوال کرنا۔ سب بتوں کو توڑ ڈالنا۔ اور سب سے بڑے بُت کو سالم چھوڑ کر اُس کے گلے میں تیشہ ڈال کر چلے جانا۔ اور پھر توڑنے کے فعل کو مجازاً بڑے بُت کی طرف منسوب کرنا۔ اور بنظر توریہ یہ فرمانا۔ بل فعلہ کبیرھم ھذا فاسئلوھم ان کانوا ینطقون۔ اور پھر اُن سے محاجہ کرنا۔ سب بغرض اثبات حق و ابطال باطل بالباطل تھا۔ کہ مذہب باطل کو براہین حسیہ سے اس طرح باطل کریں۔ کہ کسی کو شبہ نہ رہے۔ اور حجت و بحث کا موقع نہ ملے۔ واقعاً جہال کے سمجھانے اور اُن کو اپنی غلطی پر متنبہ

سوال۔ اگر کوئی کہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کو جس امر کے محال اور ناممکن ہونے کا علم حاصل تھا۔ اس کے دریافت کرنے میں کیا فائدہ ہُوا؟ اور دونو قرأتوں میں کیا فرق ہے؟

جواب۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ حضرتؑ نے نہ تو دریافت کیا۔ اور نہ امر واقعی میں آپ کو کچھ شک و شبہ ہوا۔ بلکہ اس قول سے فقط ان لوگوں کو بُت پرستی میں خطا پر ہونے پر متنبہ کیا۔ گویا حضرتؑ نے اُن لوگوں سے فرمایا۔ کہ اگر یہ بُت نفع اور نقصان پہنچانے

(بقیہ نوٹ) کرنے کے لئے اس سے بہتر حکمت عملی نہیں ہو سکتی۔ اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے براہین جسیہ و دلائل عقلیہ سے اپنی جاہل قوم سے مجادلہ کیا۔ اس سے بہتر صورت ہمکو نظر نہیں آتی۔ اور جس طرح حضرتؑ نے اپنے چچا آزر اور قوم کو نصیحت کی۔ قابل ہزار آفرین ہے۔ وادع الی سبیل ربّك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن سے فی الحقیقت یہ نبی ہی کی شان ہے۔ اور وہی کر سکتا ہے۔ جو مؤید من اللہ اور اور معلم بتعلیم الٰہی ہو۔ تلك حجّتنا اٰتینٰھا ابراھیم علٰی قومه نرفع درجاتٍ من نشاء انّ ربّك حکیم علیم۔

یہ مہتم بالشان کام جو حضرت ابراہیمؑ نے اساس دین قایم کرنے کفر توڑنے اور شرک کا نام مٹانے کے واسطے کیا تھا۔ اگر اس میں آپ سے کسی قسم کا ظاہری کذب بھی صادر ہو جاتے۔ تو وہ ہرگز مذموم نہیں ہو سکتا۔ وہ کذب جس سے اثبات حق و ابطال باطل اقامہ دین الٰہی ہو۔ کونسی عقل سلیم اُس کے مذموم و قبیح ہونے پر حکم کر سکتی ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں ضروری و واجب ہونا چاہئے۔ کہ باتفاق عقل و نقل شر قلیل بمقابلہ شر کثیر خیر ہے بلاشبہ۔ اور خیر قلیل بمقابلہ خیر کثیر شر ہے بلاریب۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ پس کونسی قباحت ہے۔ اگر حضرت ابراہیمؑ سے ایسے اہم کام کے بجالانے میں ظاہری کذب صادر ہو جائے۔ حالانکہ حضرتؑ نے اس ظاہری کذب سے بھی اجتناب کیا ہے۔ اور بطور توریہ فرمایا۔ کیونکہ حضرتؑ نے جو توڑنے کی نسبت بڑے بُت کی طرف دی ہے۔ معلق بالمحال ہے۔ اس لئے کہ آپ نے یہ فرمایا ہے۔ کہ اس بڑے بُت نے یہ کیا ہے۔ اسی سے پوچھو۔ اگر یہ بولتے ہیں۔ لہٰذا صاف طور سے معلوم ہے۔ کہ حضرت نے اُس بُت کو حقیقتاً اُس فعل کا فاعل نہیں قرار دیا۔ بلکہ اُن کی تبکیت و توبیخ کے واسطے اور اُن کو اُن کی غلطی پر متنبہ کرنے کے واسطے یہ فرمایا تھا۔ کہ اگر یہ ذی حیات

ہیں۔ اور کسی پر بخشش کرتے ہیں۔ اور کسی سے اپنی بخشش کو بند رکھتے ہیں۔ تو شاید یہ بتوں کا توڑنا بھی ان ہی سے وقوع میں آیا ہو۔ کیونکہ جن سے ایک قسم کا فعل سرزد ہو سکتا ہے۔ ان سے دوسری قسم کا کام بھی وقوع میں آسکتا ہے۔ اور جب کہ بت شکنی کا ان بتوں سے وقوع میں آنا اس قوم کے نزدیک ناجائز ہے۔ تو جو کام اس سے بڑھ کر ہیں۔ ان کا ان سے وقوع میں آنا اور ان کی طرف ان افعال کو منسوب کرنا بدرجۂ اولےٰ ناجائز ہوگا۔

اور دونو قرأتوں میں فرق ظاہر ہے۔ اس لئے کہ قرأت اولےٰ کے موافق ظاہراً خبر ہے۔ اس لئے ہم کو ضرورت پڑی کہ ہم اس کو شرطِ خاص سے متعلق کریں۔ تاکہ وہ خبر کذب ہونے

(بقیہ نوٹ) صاحب قدرت ہیں۔ اور بولنے جواب دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ تو اس بت نے یہ کام کیا۔ اور اس سے دریافت کرو۔ اور چونکہ ان کا نہ بولنا یقینی امر ہے۔ اس لئے اُن سے اس فعل کا صدور بھی ناممکن ہے۔ لہٰذا حقیقۃً حضرت نے فعل کو اُس بت کی طرف منسوب نہیں کیا۔ بلکہ بطور معارضہ و الزام اس امر کا انکار کیا ہے۔ اور یہ جھوٹ کیونکر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ حضرت پہلے ہی فرما چکے تھے۔ کہ میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک حیلہ کرونگا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اُن لوگوں کو یہ شبہ نہ ہوا۔ اور نہ سمجھے۔ کہ ابراہیمؑ نے درحقیقت اس فعل کا فاعل بت کو قرار دیا ہے۔ بلکہ وہ یہی سمجھے تھے۔ کہ یہ بطور استہزاء ادر ہم کو شرمندہ و لاجواب کرنے کے اور قائل کرنے کے واسطے ایسا کہتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شرمندہ ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے انکم انتم الظالمون۔

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے اپنے قول کو شرطِ محال سے معلق فرما کر جھوٹ ہونے سے خارج فرما دیا۔ اور درصل جواب بھی اس اعتراض کا یہی ہے۔ جو ظواہر الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس مختصر قصے سے جو عرض کیا گیا۔ ناظرین بخوبی سمجھ گئے ہونگے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات اقدس اُن تمام شبہات و الزامات سے بری ہے جو کئے جاتے ہیں۔ اور یہ جسقدر آیات مذکور ہوئی ہیں سب حضرت کی تعریف و تمجید میں وارد ہوئی ہیں۔ اور کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے۔ جس سے یہ پایا جائے۔ کہ خدا نے کسی قسم کا الزام حضرت ابراہیمؑ پر قایم کیا ہے۔ نیز حضرت کی صداقت و صدق پسندی و صدق طلبی آپ کی اس دعا سے ظاہر ہے۔ واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین۔ میرے واسطے پچھلے آنے والوں میں لسان صدق

سے خارج ہو جائے۔ اور قرأت ثانیہ میں حرف شک اور استفہام پایا جاتا ہے۔ لہذا دونو قرأتیں مختلف اور جدا جدا ہیں*

سوال۔ اگر کوئی کہے۔ آیا بشیر بن مفضل نے عوف سے اور اس نے حسن سے یہ روایت نہیں کی۔ کہ حسن کہتا ہے مجھ کو خبر پہنچی ہے۔ کہ جناب رسول خدا صلعم نے فرمایا ہے کہ ابراہیمؑ علیہ السلام نے کبھی والسنہ جھوٹ نہیں بولا۔ مگر تین بار۔ کہ ہر دفعہ کا جھوٹ اپنے دین کی طرف سے مجادلہ اور مباحثہ میں پیش کیا*

(۱) قولہ اِنّی سَقِیۡم۔ یعنی میں بیمار ہوں۔ اور بات صرف یہ تھی۔ کہ اپنے کو بہ تکلف بیمار بنا کر ان پر ظاہر کیا تھا۔ اس لئے کہ ان کی قوم روز عید ہونے کی وجہ سے گاؤں سے باہر گئی تھی۔ اور حضرتؑ پیچھے رہ گئے تھے۔ تاکہ ان کے معبودوں کے ساتھ وہ کام کریں۔ جو آخر انہوں نے کیا*

(۲) ان کا یہ فرمانا۔ بَلۡ فَعَلَہٗ کَبِیۡرُھُمۡ (یعنی بڑے بُت نے یہ حرکت کی ہے)*

(۳) اپنی زوجہ سارہ کو اپنی بہن کہنا۔ جب کہ جباروں نے ارادہ کیا۔ کہ سارہ کو ان سے چھین لیں*

جواب۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ہم نے دلائل عقلی سے جن میں کسی قسم کا احتمال اور خلافِ ظاہر کرنا جائز نہیں ہے۔ ثابت کر دیا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں کذب کا تجویز کرنا ناجائز ہے۔ پس جو حدیثیں اس کے برخلاف وارد ہوئی ہیں۔ وہ قابل التفات نہیں۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے جھوٹ بولنے کا یقین کر لیا جاتا۔ اگر دلائل عقلی کے موافق ان آیات کی کوئی صحیح اور درست تاویل نہ ہو سکتی۔ پس اگر کوئی تاویل ہو سکے۔ جو دلائل عقلی کے مطابق ہو۔ تو ہم اس قول کی تاویل کر لینگے۔ اور اس قول اور دلائل عقلی میں موافقت کر دینگے۔ اور ہم ان اخبار میں بھی ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ جن کے ظاہر معنی جبر و تشبیہ پر دلالت کرتے ہیں* اس مسئلہ کے اختتام پر قولہ اِنّی سَقِیۡم کی وجہ بیان کرینگے۔ اور ثابت کر دینگے۔ کہ آپ کا یہ فرمانا جھوٹ نہیں ہے* اور قولہ تعالیٰ بَلۡ فَعَلَہٗ کَبِیۡرُھُمۡ کے معنی نہایت وضاحت سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اور آپ نے جو

(بقیہ نوٹ) یعنی سچائی کی زبان قرار دے۔ پس جس شخص کی دعا ہی یہ ہو۔ اُس کی نسبت کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ اُس سے واقعی کذب صادر ہو۔ فتفکر وا یا اولے الالباب*

اپنی بیوی سارہ کو اُختی (میری بہن) کہا۔ اگر یہ روایت صحیح ہو۔ تو اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ میری دینی بہن ہے۔ اور یہ مراد حضرت کی نہ تھی۔ کہ وہ میری نسبی بہن ہے۔ رہی وہ روایت۔ کہ حضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے تمام عمر میں تین دفعہ جھوٹ بولا ہے۔ اس کے جواب میں اولے اور افضل تو یہی ہے۔ کہ راوی نے آنحضرت صلعم پر بہتان اور افترا کیا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلعم اس بات کو ہم سے بہتر جانتے تھے۔ کہ فلاں امور انبیاء علیہم السّلام کے لئے جائز ہیں۔ اور فلاں ناجائز۔ بالفرض اگر روایت کو صحیح مان لیا جائے۔ تو یہ احتمال ہوسکتا ہے۔ کہ اس بات سے حضرت کی مراد یہ تھی۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسی خبر صرف تین بار دی ہے۔ جن کی ظاہری عبارت کذب پر دلالت کرتی ہے۔ پس از روئے ظاہر معنی کے اس خبر پر کذب کا نام اطلاق کیا گیا۔ حالانکہ دراصل وہ کذب نہیں ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اللہ تعالےٰ جو حضرت ابراہیمؑ کے حال سے خبر دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور اس آیت میں دو وجہ سے تم پر سوال ہوسکتا ہے۔ اول یہ کہ خدا فرماتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں میں نظر کی۔ اور تم مانتے ہو۔ کہ منجم لوگ جو اس قسم کا کام کرتے ہیں۔ وہ ضلالت اور گمراہی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ إِنِّي سَقِيمٌ۔ یعنی میں بیمار ہوں۔ اور یہ جھوٹ ہے۔

جواب۔ اس سائل سے کہا جائیگا۔ کہ اس آیت کا مطلب کئی طرح پر بیان ہوسکتا ہے۔ اوّل۔ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو کوئی بیماری تھی۔ جو خاص وقتوں میں آیا کرتی تھی۔ جب قوم نے ان کو اپنے ہمراہ جانے کے لئے طلب کیا۔ تو آپ نے ستاروں کو دیکھا۔ تاکہ بیماری کی نوبت کا قریب ہونا معلوم ہو جائے۔ تب آپ نے فرمایا۔ إِنِّي سَقِيمٌ (میں بیمار ہوں)۔ مراد حضرت کی یہ تھی۔ کہ بیماری کا وقت اور اس کی نوبت کا زمانہ قریب آپہنچا۔ اور عنقریب اس میں مبتلا ہوا چاہتا ہوں۔ اور عرب کا قاعدہ ہے۔ کہ کسی شے کے قریب ہونے والے شخص کو اس شے میں داخل شدہ کے نام سے نامزد کر دیتے ہیں۔ لہٰذا جس شخص کو مرض نے نہایت کمزور کر دیا ہو۔ اور اس کے مرنے کا خوف ہو۔ اس کے لئے کہتے ہیں۔ هُوَ مَيِّتٌ یعنی وہ مردہ ہے۔ اور اللہ تعالےٰ اپنے نبی صلعم سے

مخاطب ہوکر ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (تو بھی مردہ (یعنی یقینی مرنیوالا) ہے۔ اور وہ بھی مر چکے ہیں) *

سوال۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اگر حضرت ابراہیمؑ کی یہی مراد ہوتی۔ جو تم کہتے ہو۔ تو خدا اس کا اس طرح ذکر فرماتا۔ فَنَظَرَ نَظْرَةً اِلَى النُّجُوْمِ۔ اور فِی النجوم نہ کہتا۔ کیونکہ لفظ فی اسی شخص کے لئے بولا جاتا ہے۔ جو ستاروں کو نجومیوں کی طرح دیکھے *

جواب۔ تو ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ نظر فی النجوم سے نظر الی النجوم مراد لینا ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ حروف صلہ میں سے بعض حروف بعض حروف کی جگہ مستعمل ہوتے ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ بمعنی علیٰ جذوع النخل۔ اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

اِشْهَرْ مَا سَهِرَتْ اُمُّ حَكِيْمٍ + وَاَقْعَدْ مَا صَرَّةَ لِذَالِكَ وَقُوْمِيْ
كَمْ عَلَيْنَا مِنْ قَطْعِ لَيْلٍ بَهِيْمٍ + وَاَفْتَحِيْ الْبَابَ وَالْظُرِيْ فِي النُّجُوْمِ

یعنی وانظری الی النجوم لتعرفی الوقت

وجہ دوم یہ ہے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت ابراہیمؑ کو مطلع فرما دیا ہو۔ کہ ہم زمانہ آئندہ میں مرض سے تمہارا امتحان لینگے۔ گو وہ حضرت اس مرض کے عادی نہ تھے۔ اور اس وقت کے لئے بذریعہ ستاروں کے نشانی مقرر کر رکھی تھی۔ مثلاً خاص طرح پر کسی ستارے کا طلوع ہونا۔ یا غروب ہونا۔ یا خاص طور پر دو ستاروں کا ملنا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے وہ علامت مقررہ ستاروں سے معلوم کی۔ تو اللہ تعالیٰ کی خبر سابق کی تصدیق کر کے فرمایا۔ اِنِّیْ سَقِیْمٌ (میں بیمار ہوں) *

وجہ سوم یہ ہے۔ جو اس آیت میں مفسرین کی ایک جماعت کا مقولہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جب شخص کا آخری امر موت ہے۔ تو وہ بیمار ہے۔ اور یہ بہت درست ہے۔ اس لئے کہ زندگی جو موت پر پہنچانے والی ہے۔ اس کو بیماری سے تشبیہ دینا بہت اچھی تشبیہ ہے *

وجہ چہارم یہ ہو سکتی ہے۔ کہ قولہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ کے یہ معنی ہوں۔ کہ اِنِّیْ سقیم القلب او الرای یعنی میرا دل یا رائے سقیم ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں قوم بتوں کی پرستش کر کے ضرر نہ پہنچائیں۔ حالانکہ وہ نہ سنتے ہیں۔ نہ دیکھتے ہیں۔ اور بنابریں فنظر نظرۃ فی النجوم

کے یہ معنی ہونگے۔ کہ حضرتؑ نے غور وفکر کی۔ کہ وہ حادث ہیں۔ گول ہیں۔ گردش کرتے ہیں۔ اور مخلوق ہیں۔ اور تعجب ہے۔ کہ عقلمند کیونکر ایسی چیز کی عبادت کرے۔ جو ان صفات بالا سے موصوف ہو +

اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ قولہ تعالےٰ فنظر نظرۃً فی النجوم کے یہ معنی ہوں۔ کہ حضرتؑ نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی ہو۔ جیسا کہ فکر و تامل کرنے والا شخص کیا کرتا ہے۔ کہ کبھی تو زمین کی طرف سر جھکاتا ہے۔ اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ تا کہ فکر کرنے میں امداد ملے +

اور یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ نجوم سے اس جگہ نجوم نبت یعنی بے تنے پودے مراد ہیں۔ کیونکہ جو چیز زمین وغیرہ سے نکلے اور طلوع کرے۔ اس کے لئے کہتے ہیں۔ انہ ناجم و قد انجم۔ اور سب کو نجوم کہتے ہیں۔ نیز کہتے ہیں۔ نجم قرن الظبی (ہرن کے سینگ نکلے۔ نجم ثدی المراۃ (عورت کے پستان ابھرے) + اس صورت میں یہ معنی ہونگے۔ کہ حضرتؑ نے حالت تفکر میں زمین کی طرف گردن جھکائے ہوئے نظر کی۔ تو زمین سے نکلی ہوئی اور اگی ہوئی چیزوں کو دیکھا +

نیز یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ نجوم سے مراد وہ بات ہے۔ جو پہلے معلوم نہ تھی پھر غور و فکر سے سمجھ میں آگئی۔ اگرچہ کلام سے اس معنی کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ مگر ظاہر اس کے برخلاف ہے۔ کیونکہ قائل جب لفظ نجوم کہتا ہے۔ تو اس کے ظاہر سے نجوم السماء سمجھ میں آتے ہیں۔ نہ کہ نجوم الارض اور نجوم الرائے۔ اور یہ ضروری نہیں۔ کہ جس چیز کی نسبت یہ کہا جائے۔ انہ نجم (وہ طالع ہوئی) اور در حقیقت وہ ناجم (طالع) ہے۔ اس کو مطلقاً بلا قید نجوم بھی بولیں۔ اور اس باب میں عرف اہل زبان مستند ہے +

اور ابو مسلم محمد بن بحر اصفہانی کہتا ہے۔ کہ فنظر نظرۃً فی النجوم کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب حضرت نے زمانہ غور و فکر میں شمس و قمر کو معبود گمان کیا۔ جیسا کہ سورۃ انعام میں مذکور ہے۔ اور جب ان کا چھپنا اور غروب ہونا دیکھا۔ تو سمجھا۔ کہ یہ دونوں حادث ہیں۔ نہ قدیم ہیں اور نہ معبود۔ اور قولہ انی سقیم کے معنی یہ ہیں۔ کہ مجھ کو اس امر کا یقین نہیں ہے۔ اور اس باب میں تسلی اور تشفی بخش علم مجھ کو حاصل نہیں ہوا۔ اور شک کو سقم (بیماری) اور علم کو شفا (تندرستی) کہا جاتا ہے + اور حضرتؑ کا یہ

سقم شک کے زائل ہونے اور معرفت الٰہی کے کامل ہونے سے زائل ہوگیا تھا۔ اور یہ وجہ ایک سبب سے ضعیف ہے۔ کیونکہ جس قصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ کلام مذکور ہے۔ اس کا ظاہر شہادت دیتا ہے۔ کہ وہ اس قصہ سے جدا ہے۔ جو سورۂ انعام میں مذکور ہے۔ اور دونوں قصے مختلف ہیں۔ اس لئے کہ خدا اس قصے کو یوں ذکر فرماتا ہے۔ وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرَاھِیْمَ۔ اِذْ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔ اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ وَقَوْمِہٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ۔ اَئِفْکًا اٰلِھَۃً دُوْنَ اللّٰہِ تُرِیْدُوْنَ۔ فَمَا ظَنُّکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ظاہر کیا کہ حضرت ابراہیمؑ قلب سلیم سے اپنے ربّ کی طرف آئے۔ اور یہاں پر قلب سلیم سے مراد یہ ہے۔ کہ آپ کا قلب شک و ریب سے بالکل سالم اور معرفت الٰہی اور یقین خداوندی کے لئے خالص تھا۔ پھر خدا فرماتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم پر بُت پرستی کی وجہ سے عتاب کیا۔ اور فرمایا۔ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ۔ پس ان کی عبادت اور پوجا پاٹ کو افک اور باطل سے نامزد کیا۔ پھر فرمایا فَمَا ظَنُّکُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ اور یہ ایسے شخص کا قول ہے۔ جو خداوند متعال کا عارف ہے۔ اور اس کی صفات کو اس کے لئے ثابت کرتا ہے۔ اور ناظر اور متامّل اور شاکّ نہیں ہے۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ ایسا شخص نجوم کو ارباب اور آلہ گمان کر کے ان کی طرف نظر کرے۔ اور کیونکر وہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ کہہ سکتا ہے۔ باین معنی کہ مجھ کو یقین اور شفاء علمی حاصل نہیں ہے۔ اور اس کی معتبر تاویل وہی ہے جس کو ہم نے پیشتر بیان کیا ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے کہ تم اس آیت میں کیا کہتے ہو۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔ اور اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی پہلی دلیل میں مات ہو گئے۔ اور اس کی تائید سے عاجز ہو گئے۔ اس لئے اسے چھوڑ کر دوسری دلیل کو اختیار کیا۔ اور احتجاج کنندہ جبھی ایک حجت کو ترک کر کے دوسری کو پکڑا کرتا ہے۔ جبکہ پہلی حجت کی تائید سے عاجز رہ جایا کرتا ہے۔

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ حضرت

ابراہیمؑ پہلی دلیل میں مات ہو گئے تھے۔ اور اس کی تائید کرنے سے عاجز رہ گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے دلیل اول کو چھوڑ کر دوسری دلیل اختیار کی تھی۔ بلکہ جب اس جبار اور کافر بادشاہ نے قول حضرت رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ کے جواب میں اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ کہا۔ تو آپ اس کے جواب دینے پر بیشک قادر تھے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ اس بادشاہ نے دو شخصوں کو طلب کیا۔ ایک کو قتل کر دیا۔ اور ایک کو زندہ رکھا۔ اور اس وقت کہا۔ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ۔ میں بھی زندہ کرتا ہوں۔ اور مارتا ہوں۔ اور اس کافر نے اپنے اس قول سے حاضرین مجلس پر حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کو مشتبہ کر دیا تھا۔ کہ جو اس کے جواب میں حضرتؑ اس سے کہتے۔ کہ میرے قول ربی الذی یحیی و یمیت سے یہ مراد نہیں ہے۔ جو تو نے سمجھی ہے۔ کہ ایک زندہ شخص کو زندہ رہنے دینا۔ بلکہ میری مراد یہ ہے۔ کہ میرا پروردگار اس میت کو زندہ کر دیتا ہے۔ جس میں جان نہیں ہے۔ مگر یہ کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے جان لیا تھا کہ اگر میں اس وقت یہ جواب دونگا۔ تو حاضرین مجلس پر یہ امر مشتبہ رہیگا۔ اور اشتراک اسم کی وجہ سے شبہ قوی ہو گیا ہے۔ لہذا اس دلیل کو چھوڑ کر واضح اور روشن اور ایسی دلیل کو اختیار کیا جس میں شبہ ہو ہی نہ سکے۔ اور فرمایا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ۔ کہ اللہ تعالے سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تو اس کو مغرب سے نکال۔ یہ سن کر وہ کافر مبہوت اور لاجواب ہو گیا۔ اور اس بیان میں کسی قسم کا شبہ اور شک بھی نہ رہا۔ اور جس شخص کا ارادہ واضح اور ظاہر طور پر بیان کرنے کا ہو۔ اس کو چاہئے کہ وضاحت کرنے اور شبہ دور کرنے کے لئے ایک دلیل کو چھوڑ کر دوسری دلیل اختیار کرے۔ گو دونو دلیلیں حق پر پہنچانے والی ہوں۔ اور دوسری دلیل پہلی دلیل کی موید ہو۔ اور اس کی تائید کے طریق سے خارج نہ ہو۔ اس لئے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے۔ جو زندہ کرتا ہے۔ اور مارتا ہے۔ اور اس کافر نے ان کے جواب میں کہا۔ کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں۔ اور مارتا ہوں۔ تب حضرت نے اس سے فرمایا۔ کہ جو شخص زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس کے شان میں یہ ہے۔ کہ وہ اس بات پر قادر ہے۔ کہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اور جس طرح چاہتا ہے۔ اس کو چلاتا ہے۔ پس اگر تو بھی پروردگار عالم کی قدرت اپنے آپ میں موجود ہونا

دعوے کرتا ہے۔ تو تو اس کو مغرب سے نکال دے۔ جیسا کہ میرا پروردگار اس کو مشرق سے نکالتا ہے۔ پس جب کہ تو سورج کو مغرب سے نکالنے میں عاجز رہیگا۔ تو ہم جان لینگے۔ کہ تو زندہ کرنے اور مارنے سے بھی عاجز ہے۔ اور اس دونوں امروں میں تیرا دعوی بے اصل اور بے دلیل ہے۔

اشکال۔ اب اگر کوئی کہے۔ کہ اگر وہ بادشاہ حضرتؑ کے جواب میں یہ کہتا۔ کہ تیرا پروردگار بھی سورج کو مغرب سے نکالنے پر قادر نہیں ہے۔ تو تو مجھ پر کیوں لازم کرتا ہے۔ کہ میں اس کو مغرب سے نکالوں۔

جواب۔ تو ہم اس کا جواب یہ دینگے۔ کہ اگر وہ کافر حضرت ابراہیمؑ سے یہ کہتا۔ تو ضرور حضرت اپنے پروردگار سے یہ سوال کرتے۔ کہ سورج کو مغرب سے چڑھا۔ اور پروردگار ان کی اس دعا کو قبول کر لیتا۔ اور یہ آپ کا معجزہ اور خارق عادت ہوتا۔ اور شاید اسی وجہ سے اس کافر نے یہ سوال نہ کیا ہو۔ کہ وہ جانتا ہو۔ کہ جب وہ حضرت خدا سے اس امر کی دعا کرینگے۔ تو خدا ان کی دعا کو قبول کر لیگا۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اس آیت کے معنی کیا ہیں۔ جو خدا حضرت ابراہیمؑ کی زبانی قرآن میں فرماتا ہے۔ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ۔ ترجمہ۔ اے میرے پروردگار مجھکو دکھلا۔ کہ تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ پروردگار عالم نے فرمایا۔ کہ اے ابراہیمؑ کیا تو ایمان نہیں لایا۔ عرض کی۔ کہ ہاں۔ ایمان لایا ہوں۔ لیکن صرف اس وجہ سے سوال کرتا ہوں۔ کہ میرا دل مطمئن ہو۔ آیا حضرتؑ کا یہ کلام اور آپ کی یہ استدعا اس امر پر دال نہیں ہے؟ کہ حضرت کو اس بات کا اطمینان نہ تھا۔ کہ اللہ تعالے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور جس شخص کو اس امر میں شک ہو۔ وہ نبی کیونکر ہو سکتا ہے؟ کیا مفسرین نے اپنی تفسیروں میں یہ روایت نہیں کی؟ کہ حضرت

سلہ آیہ بالصراحت دال ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کو خدا کے مردہ زندہ کرنے میں کسی قسم کا شک و تردد نہ تھا۔ اور آپ کو یقین کامل حاصل تھا جیسا کہ سوال و جواب سے ظاہر ہے۔ لیکن کیفیت زندہ کرنے کی کہ کس طرح خداوند عالم خالق ارض و سماء اجزاء متفرقہ اور دور افتادہ کو جمع کرتا ہے۔ اور پھر وہ کس طرح زندہ ہو جاتے ہیں۔ سوائے اس کے کون جان سکتا ہے۔ جو خالق و صانع اور مارنے و جلانے والا ہے۔ یا وہ جس کے سامنے وہ پیدا کئے گئے ہیں اور زندہ کئے جائیں۔

ابراہیمؑ کا گزر ایک مچھلی پر سے ہوا جس کا آدھا جسم خشکی میں تھا۔ اور آدھا پانی میں۔ اور خشکی اور تری کے جانور اس میں سے کھاتے تھے۔ اور شیطان نے حضرت کے دل میں ڈالا کہ اس مچھلی کا پھر زندہ ہونا اور اس کے متفرق اجزا جو ہی کا جو مختلف حیوانات بری اور بحری کے اجسام میں منتشر ہوگئے ہیں ایک جگہ جمع ہو کر مل جانا مستبعد ہے۔ پس آپ کے دل میں شک پڑا۔ اس وقت اللہ تعالےٰ سے یہ سوال کیا۔ جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں ذکر ہے۔ اور ابوہریرہ نے جناب رسالت مآب صلعم سے روایت کی ہے۔ نحن احق بالشک من ابراھیم علیہ السلام ہم ابراہیمؑ کی نسبت شک کرنے کے زیادہ تر سزاوار ہیں۔

جواب ۔ آیۂ مذکورہ میں کوئی امر ایسا مذکور نہیں ہے۔ جو مُردوں کے زندہ کرنے کے باب میں حضرت ابراہیمؑ کے شک کرنے پر دال ہو۔ اور یہ جائز ہے۔ کہ آپ نے یہ درخواست صرف اس لئے کی ہو۔ کہ مجھ کو احیاء موتےٰ (مُردوں کا زندہ کرنا) کی تعلیم اس طرح پر دی جائے۔ جو شبہ سے دور ہو۔ اور اس میں کسی قسم کا شک و ریب عارض نہ ہو۔ گو اس سے پہلے ایسے طور پر آپ کو تعلیم دی گئی ہو۔ جس میں مجال شبہ و شک ہو۔

(بقیہ نوٹ) بنا بریں حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کو یہ شوق تھا۔ کہ میں بھی دیکھوں۔ کس طرح خدا زندہ کرتا ہے۔ اور اُس کی صورت کیا ہے۔ اور اسی تردد میں رہتے تھے۔ کہ کسی طرح میں بھی اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ اور خدا کی اس حیرت انگیز و تحیر خیز قدرت نمائی کے نظارے سے اپنی آنکھوں کو روشن کروں۔ اور اس علم حسی کے نور سے آئینۂ شفاف قلب کو دہ چند منور کروں۔ اور علم الیقین کو عین الیقین سے بدل دوں۔ کہ احیاء موتےٰ کی کیفیت میری آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ اور اس علم ضروری کی صورت واقعیہ لوح قلب پر منقش ہو جائے۔ غرض جب اس کیفیت کے نظارے کا شوق حد سے بڑھ گیا۔ تو ایک روز بارگاہ ایزدی میں درخواست کی۔ رب ارنی کیف تحیی الموتےٰ ۔ پروردگارا مجھ کو دکھا۔ کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ حضرت کے ایمان و ایقان کی تصدیق کرانے اور دوسروں پر اُس کا اثبات کرنے کی غرض سے بارگاہ الٰہی سے سوال ہوا۔ اولم تؤمن (اے ابراہیمؑ کیا تمکو اس پر ایمان و یقین نہیں) عرض کیا۔ بلےٰ ولکن لیطمئن قلبی۔ خداوندا کیوں نہیں میں اس کا یقین رکھتا ہوں۔ لیکن صرف اس لیے سوال کیا ہے۔ کہ میں اُس کیفیت کا نظارہ کر لوں۔ اور میرا یہ شوق پورا ہو کر دل کو

اور ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ اس وقت جو ابراہیمؑ نے مشاہدہ کیا۔ کہ پرندہ پہلے زندہ تھا پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ کر دیا۔ اور اس کے اجزاء کو الگ الگ کر کے جدا جدا پھینک دیا۔ پھر وہ زندہ ہو کر اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اس مشاہدے میں ایسی وضاحت اور قوت عملی اور انتفاء شبہ موجود ہے۔ جو کسی قسم کے استدلال میں نہیں ہوتی۔ اور پیغمبرؑ کے لئے لازم ہے۔ کہ اپنے پروردگار سے محنت کی تخفیف اور تکلیف کے آسان و سہل کرنے کی درخواست کرے۔ اور آیہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ہمارے اس قول کی صحت پر دال ہے ✤ پس ابراہیم علیہ السّلام نے بعینہٖ وہی جواب دیا جو ہمارے جواب کا ہم معنی ہے۔ کیونکہ آپ نے ظاہر کر دیا کہ میں نے یہ سوال اس لئے نہیں کیا۔ کہ مجھ کو اس باب میں کچھ شک ہے۔ یا معاذ اللہ میں اس بات پر ایمان نہیں رکھتا۔ بلکہ میری مراد اور دلی منشا محض طمانینت ہے یعنی نفس کا ساکن ہونا۔ اور شکوک اور وساوس کا منتفی ہونا۔ اور شبہات کے عوارض کا دور رہنا جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں ✤

(بقیہ نوٹ) تسکین ہو۔ اور عین الیقین کی لذت سے متلذذ ہوں۔ اور تیرے بندوں کو اچھی طرح سمجھا سکوں۔ انتہی۔ کیونکہ جب انسان ایک شے بچشم خود دیکھ لیتا ہے۔ تو وہ اوس کی نہایت اعلے درجہ پر تعریف کر سکتا ہے۔ بخلاف اُس صورت کے کہ اُس نے خود نہ دیکھی ہو۔ خواہ اُس کو کیسا ہی یقین اُس شے کے وجود پر حاصل ہو۔ مثلاً مجھ کو یقین کامل ہے۔ کہ ٹیلیگراف کے ذریعہ تھوڑی دیر میں ہزاروں میل سے خبر منگا لیتے ہیں۔ اور حال معلوم کر لیتے ہیں۔ اور اس بات کو ایسے شخص سے بیان کروں۔ جو اس سے بالکل بے خبر ہے۔ تو میں اس کو اس امر کا ایسا یقین نہیں دلا سکتا۔ جیسا کہ اُس صورت میں دلا سکتا ہوں جبکہ میں خود ٹیلیگراف کے اصول سے واقف ہوں۔ اور تار دیتے ہوئے دیکھا ہو۔ اور یہ بالکل ضروری و بدیہی ہے۔ لہذا حضرت ابراہیمؑ کا سوال صرف کیفیت احیاء موتے کے متعلق ہے۔ نہ کہ خدا کی قدرت سے اور نہ اس کو شک و تردد سے کچھ علاقہ۔ اسی واسطے حضرتؑ نے کیف تحی الموتے (تو کس طرح سے مُردوں کو زندہ کرتا ہے) فرمایا۔ اگر حضرتؑ کو شک و تردد ہوتا۔ تو یوں فرماتے کہ کیا تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ یا مُردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے۔ اور کیونکر اُس شخص کی نسبت شک و تردد کا گمان ہو سکتا ہے۔ جس کی نسبت خدا خود فرماتا ہے۔ لقد اصطفینہ

اور ایک صورت یہ ہوسکتی ہے۔ کہ مفسرین قائل ہیں۔ کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو خلعتِ خُلّت و اصطفا و اجتبا سے سرفراز فرمایا۔ اور اس بشارت سے آپ کو شاد کام کیا۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے خدا تعالےٰ سے سوال کیا۔ کہ مجھکو مُردوں کا زندہ کرنا دکھایا جائے۔ تاکہ میرے قلب کو خُلّت کا اطمینان ہو جائے۔ یعنی میرے دل کو تسلّی ہو جائے۔ کہ مجھے کو خدا نے اپنا خلیل بنا لیا ہے۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السّلام مضامینِ وحی کی صحت استدلال ہی سے معلوم کیا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اِحیاءِ موتےٰ کا سوال کیا تھا۔ نہ کہ شک کی وجہ سے ٭

اور ایک صورت یہ ہوسکتی ہے۔ کہ نمرود بن کنعان نے جب ابراہیمؑ سے کہا۔ تو کہتا ہے۔ کہ تیرا پروردگار مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور تجھ کو میری طرف بھیجا ہے۔ تاکہ تو مجھ کو اس کی عبادت کی طرف دعوت کرے۔ پس تو اس سے سوال کر۔ کہ وہ کسی مُردے کو زندہ کرے۔ اگر وہ اس بات پر قادر ہے ٭ اور اگر ایسا ظہور میں نہ آیا۔ تو میں ضرور تجھ کو قتل کر ڈالوں گا ٭ تب حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح دعا کی ہو۔ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰے ٭ اور اس صورت میں وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کے معنی یہ ہوں گے۔ تاکہ میں قتل سے محفوظ رہوں۔ اور خوف اور ڈر کے زائل ہونے سے میرا قلب مطمئن ہو جائے ٭

(بقیہ نوٹ) فی الدنیا وانہ فی الاٰخرۃ لمن الصالحین۔ اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین۔ ہم نے برگزیدہ کیا ہے ابراہیمؑ کو دنیا میں۔ اور وہ بیشک آخرت میں صالحین میں سے ہے۔ جب اُس کے پروردگار نے اُس سے کہا۔ اسلام لا۔ (مطیع و منقاد ہو جا) عرض کیا۔ میں پروردگارِ عالمین پر اسلام لایا۔ پس جس کو اسلام مطلق بلا واسطہ حاصل ہو۔ وہ کس طرح خدا کی قدرت میں شک کر سکتا ہے۔ اس جملے کی تفصیل یہ ہے کہ ہم لوگ جو ایمان لاتے ہیں۔ کسی پیغمبر رسول یا وصی رسول کے ہاتھ پر لاتے ہیں اور اسی واسطے اس کو اسلام بالواسطہ کہتے ہیں۔ اور اس صورت میں وہ اول ہمکو کلمہ تعلیم کرتا ہے۔ اور ہم اُس کا زبان سے اقرار کرتے ہیں ٭ بعد ازاں رفتہ رفتہ حسِ مشترک سے گذر کر قوۂ عاقلہ تک پہنچتا ہے۔ اور قوۂ عاقلہ ادراک کرتی ہے اور بذریعہ دلائل و براہین۔ آیات و علامات اُس کا اذعان و یقین کرتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اُس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اور انبیاء کا حال ہم سے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ اُن کو بذریعہ وحی و الہام ادراک قلبی ہوتا ہے۔

اور یہ وجہ جو ہم نے ذکر کی ہے۔ ہماری مجوزہ ہے۔ گو اس طرح مروی نہیں ہے۔ اگر یہ جائز ہے۔ تو آیت مذکورہ کی تاویل کی یہ ایک نئی صورت ہو سکتی ہے ❊

اور ایک صورت یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے صرف اپنی قوم کے لئے احیاء موتے کی درخواست کی ہو۔ تاکہ اس امر میں ان کا شک و شبہ بالکل زائل ہو جائے۔ جیسا کہ حضرت موسےٰؑ نے اپنی قوم کے لئے رویت کا سوال کیا تھا۔ تاکہ جناب احدیت سے ایسا جواب صادر ہو۔ جو ان کے شبہ کو جو رویت خداوندی کے جواز میں ان کو عارض ہو رہا ہے۔ زائل کر دے ❊

اور اس صورت میں لیطمئن قلبی کے معنی یہ ہونگے۔ کہ میرا دل ان لوگوں کے شک و شبہ کے دور ہونے سے مطمئن ہو جائیگا۔ یا یہ کہ میرا دل اس بات سے مطمئن ہو جائیگا۔ کہ تو نے میری اس درخواست کو قبول کر لیا ❊ اور یہ سب تاویلیں جائز ہیں۔ اور ظاہر میں کوئی بات ان تاویلات کی مانع نہیں ہے۔ اس لئے کہ قول حضرت ابراہیمؑ وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ظاہر آیت میں کسی ایسے امر سے متعلق نہیں ہے۔ کہ ظاہر سے تمسک کر کے اس سے عدول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور اُس امر کی بھی تصریح نہیں کی گئی۔ جس سے طمانینت متعلق ہے۔ پس ہم کو اختیار ہے۔ کہ جس امر سے اس کا متعلق ہونا جائز ہو۔ اس سے اس کو متعلق کر لیں ❊

اگر کوئی کہے۔ کہ پھر قولہ تعالیٰ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کے کیا معنی ہوئے۔ اور یہ لفظ استقبال ہے۔ اور تمہارے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا زمانہ ماضی میں مومن ہونا مانا جاتا ہے ❊

(بقیہ نوٹ) اور حقایق معارف اول اُن کے قلب پر منکشف ہوتے ہیں۔ لعد ازاں قلب سے بذریعہ قوئ حس مشترک تک آتا ہے۔ اور پھر زبان سے اُس کا بروز ہوتا ہے۔ اور چونکہ نبی کے اسلام لانے میں الہام خدا و رسول کے درمیان کوئی اور چیز واسطہ نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کو اسلام بلا واسطہ کہا جاتا ہے۔ اس اسلام میں شک و تردد کو راہ نہیں۔ یہ اسلام ایمان سے بالا ہے۔ شک و تردد کو ہمارے اسلام و ایمان سے تعلق ہوتا ہے۔ یعنی جبتک عقل بذریعہ دلائل و براہین و آثار و آیات اذعان حاصل نہیں کرتی اور حکم نہیں لگاتی۔ اُس وقت تک شک و تردد ممکن ہے۔ اور انبیاء اس سے بالکل بری ہیں۔ کیونکہ اُن کو اذعان قلبی پہلے ہی حاصل ہو جاتا ہے۔ یہیں سے

تو ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کے معنی اَوَلَمْ تَکُنْ قَدْ اٰمَنْتَ ہیں۔ اور عرب ایسے لفظ بولا کرتے ہیں گو بظاہر لفظ استقبال ہوتا ہے۔ مگر ماضی مراد لیتے ہیں۔ مثلاً ایک دوسرے سے کہتا ہے۔ اَوَلَمْ تُعَاھِدْنِیْ عَلٰی کَذَا وَ کَذَا وَتُعَاقِدْنِیْ عَلٰی اَنْ لَا تَفْعَلَ کَذَا وَ کَذَا۔ اور اس سے صرف زمانہ ماضی مراد لیتا ہے نہ کہ زمانہ مستقبل ❊

اور اگر کوئی یہ کہے۔ کہ قولہ تعالےٰ (فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ) کے کیا معنی ہیں۔ تو ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ اہل علم کا فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے۔ کہ صُرْھُنَّ کے معنی اَدْنِھِنَّ (نزدیک کر انکو) اور اَمِلْھُنَّ (جھکا ان کو) ہیں۔ چنانچہ شاعر ایک اونٹ کی تعریف میں کہتا ہے۔ شعر

تَظَلُّ مُعْقِلَاتُ النُّوْقِ خَیْصًا ۔۔۔ تَصُوْرُ اُنُوْفَھَا رِیْحُ الْجَنُوْبِ

ای ریح الجنوب تمیل انوفہا وتعطفہا۔ شاعر کی مراد یہ ہے۔ کہ باد جنوبی ان کی ناکوں کو پھیر دیتی ہے۔ اور موڑ دیتی ہے ❊ اور طرماح کہتا ہے۔ شعر

عَفَائِفُ اَذْیَالٍ اَوَانٍ یَصُوْرُھَا ۔۔۔ ھَوًی وَالْھَوٰی لِلْعَاشِقِیْنَ صَوُوْرٗ

اور ایک شخص دوسرے کو کہتا ہے۔ صُرْ وَجْھَکَ اِلَیَّ یعنی اپنا منہ میری طرف پھرا۔ اور جو شخص کہ آیہ مذکور کو اس معنی پر محمول کرتا ہے۔ اس کو ضروری ہے۔ کہ کلام میں کچھ محذوف مقدر کرے۔ کہ سیاق لفظ اس پر دلالت کرتا ہو۔ اور اس حالت میں تقدیر کلام یوں ہوگی۔ خُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَاَمِلْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ قَطِّعْھُنَّ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ

(بقیہ نوٹ) یہ ثابت ہوا ہے۔ کہ نبی کو نسیان ہرگز عارض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نسیان قوۃ حافظہ کے ذھول کا نام ہے۔ اور نبی کے اذعان میں چونکہ قوۃ حافظہ کو دخل نہیں۔ کیونکہ وہ اول ہی قلب (قوۃ عاقلہ) پر منکشف ہوتا ہے۔ اس واسطے وہاں نسیان و سہو کا بھی کوئی دخل نہیں۔ پس جب انبیاء کا اسلام بلا واسطہ ہوتا ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو یہ اسلام بلا واسطہ حاصل تھا جس کی خدا تصدیق فرماتا ہے۔ اور خبر دیتا ہے۔ اور یہ اسلام ہمارے درجہ ایمان سے کہیں افضل و اعلےٰ ہوتا ہے۔ تو کس طرح حضرت ابراہیمؑ کی نسبت شک و تردد کا گمان ہو سکتا ہے۔ الحاصل حضرت ابراہیمؑ کا سوال محض عین الیقین کے حاصل کرنے کی غرض سے تھا۔ نہ شک و تردد کی وجہ سے۔ فتدبر۔ واللہ اعلم بالصواب ❊

مِنْهُنَّ جُزْءً (چار پرندے لے۔ پھر ان کو اپنی طرف پھرا۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے کر۔ اور ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر ڈال دے)۔

اور ایک جماعت کا قول ہے۔ کہ صُرْهُنَّ کے معنی قَطِّعْهُنَّ اور فَرِّقْهُنَّ ہیں۔ اور توبہ بن حمیر شاعر کے قول کو شہادت میں پیش کرتے ہیں۔ شعر

فلمّا جذبتُ الحبلَ لُطّتْ نُسُوعُهُ ۔ باطرافِ عیدانٍ شدیدٍ اُسُورُها
فادنتْ لِیَ الاسبابُ حتّٰی بلغتُها ۔ بنھضِیْ وقد کادَ ارتقائی یَصُورُها

دوسرا شاعر کہتا ہے۔ شعر

یقولونَ اِنّ الشّامَ یَقتُلُ اَھلَہٗ ۔ فمَنْ لِیَ اِنْ لَمْ اٰتِہٖ بخُلُودِ
تَغَرَّبَ اٰبائی فھلّا صَرَاھُمْ ۔ مِنَ المَوتِ اِنْ لَمْ یَذْھَبُوا وجُدُودی

اس میں صَرَاھُم بمعنی قَطَعَھُمْ ہے۔ اور اس کی اصل صَرِیَ یَصْرِیْ صَرْیًا ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے۔ باتَ یَصْرِیْ فی حَوْضِہٖ اذا استسقٰی ثم قطع۔ اور اصل صَیَرَ ہے۔) پس لام کو مقدم کر دیا۔ اور عین کو موخر۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ اور **بصری** یہ کہتے ہیں کہ صار یصیر و یصور کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی قطع۔ اور مذکورہ بالا اشعار کو سند اً پیش کرتے ہیں۔ اور نیز خنساء کے اس قول کو بھی۔ شعر

فَظَلّتِ الشُّمُّ منھا وھی تنصارُ

اس صورت میں آیت مذکورہ میں تقدیم و تاخیر کی ضرورت ہو گی۔ اور تقدیر کلام یہ ہو گی۔ فخذ اربعۃً مِنَ الطّیر الیکَ فصُرْھُنَّ اے قَطِّعْھُنَّ۔ پس الیکَ خُذْ کا صلہ ہو گا۔ کیونکہ تقطیع کا تعدیہ اِلیٰ سے نہیں ہوتا۔

اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالیٰ ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا سے ظاہر ہے۔ کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو ان پرندوں کے بلانے کا حکم دیا ہے۔ اور وہ زندہ ہوں یا مُردہ۔ ہر حال میں ان کا بلانا قبیح ہے۔ اس لئے کہ بہائم کو جو عقل اور سمجھ نہیں رکھتے امر کرنا قبیح ہے۔ اسی طرح ان کو اس وقت میں امر کرنا جبکہ وہ اعضا نے متفرقہ تھے بہت ہی برا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے۔ یہاں حالت زندگی مراد رکھی ہے۔ نہ کہ حالت تفرق و تمزق اعضا۔ اور دعا سے پرندوں کی طرف اشارہ کرنا مراد ہے۔ کیونکہ انسان کبھی چوپاؤں کی طرف آنے اور جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ اور وہ اس اشارے کو سمجھ لیتے ہیں۔

اور اس اشارہ کو دعا سے نامزد کرنا حقیقتاً یا مجازاً جائز اور درست ہے ٭

اور ابو جعفر طبری کہتا ہے۔ کہ یہ نہ امر ہے۔ اور نہ دعا۔ بلکہ شئے کا ہونا اور اس کا موجود ہونا مراد ہے۔ چنانچہ خدا ممسوخین کے بارہ میں ارشاد فرماتا ہے۔ کُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ۔ یہاں صرف ان کے بندر بن جانے کی خبر دی ہے۔ اسی طرح یہ نہ دعا ہے نہ امر۔ پس اس تاویل کے موافق یہ معنی ہونگے۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا فَاِنَّ اللّٰهَ یُؤَلِّفُ تِلْكَ الْاَجْزَاءَ وَیُحْیِیْ الْحَیٰوةَ فِیْهَا فَیَاْتِیْنَكَ سَعْیًا (ان کے ایک ایک جزو کو ہر پہاڑ پر ڈال دے۔ پس اللہ تعالے ان اجزاء کو جوڑیگا۔ اور پھر جان ڈالدیگا۔ اور وہ دوڑتے ہوئے تیرے پاس آجائینگے)۔ اور یہ تاویل قریب قریب ہے ٭

پس اگر کوئی کہے۔ کہ پہلی تاویل کے موافق ان پرندوں کو حالت زندگی میں بلانا کیونکر درست ہوسکتا ہے۔ حالانکہ ظاہر آیت اس کے برخلاف شہادت دیتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالے نے پہلے فرمایا۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا۔ پھر بعدازاں بلا کسی قسم کے فاصلے کے فرمایا۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ ان کو اس حالت میں بلایا گیا ہے۔ جبکہ وہ اجزائے متفرقہ تھے ٭

ہم اس کا جواب یوں دینگے۔ کہ بات دراصل یوں نہیں ہے۔ جیسا کہ سوال میں ذکر کی گئی ہے۔ اس لئے کہ قولہ تعالے ثم اجعل علے کل جبل منهن جزءا کے بعد محذوف نکالنا ضروری ہے۔ اور وہ فَاِنَّ اللّٰهَ یُؤَلِّفُهُنَّ وَیُحْیِیْهِنَّ ہے۔ اس صورت میں تقدیر کلام یوں ہوئی۔ ثُمَّ اجعل علی کل جبل منهن جزءا فاِنَّ اللّٰهَ یُؤَلِّفُهُنَّ وَیُحْیِیْهِنَّ ثم ادعهن یاتینك سعیا ٭ اور جو شخص ان کے بلانے کو حالت تفرق اجزاء اور انتفاء حیات میں خیال کرتا ہے۔ اس کو کلام میں محذوف کا مقرر کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں۔ کہ یہ اجزاء اور اعضا بلانے کے بعد بلا فاصلہ نہ چلے آئینگے۔ لہذا ضروری ہے۔ کہ ثم ادعهن کے بعد فاِنَّ اللّٰهَ یُؤَلِّفُهُنَّ وَیُحْیِیْهِنَّ محذوف مانا جائے۔ اس کے بعد فیاتینك سَعْیًا کہنا بہت درست اور پُرمعنی ہے ٭

لیکن ابو مسلم اصفہانی نے اس سوال سے بچنے کے لئے اس کلام کو ایسی صورت پر محمول کیا ہے جس کا فساد ظاہر ہے۔ اس لئے کہ وہ کہتا ہے۔ کہ اللہ تعالے نے ابراہیمؑ کو حکم دیا۔ کہ چار پرندے لے۔ اور ہر پہاڑ پر ایک ایک پرندہ رکھ دے۔ اور بجز اسکے چار پرندوں

میں سے ایک پرندہ تعبیر کیا ہے۔ پھر حضرت کو حکم دیا ہے۔ کہ ان کو بلا۔ حالانکہ وہ بدستور زندہ تھے۔ نہ تو وہ اس سے پہلے مرے تھے۔ اور نہ ان کے اعضا جدا جدا ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالےٰ نے ان جانوروں کو ایسا فرمانبردار کر دیا تھا۔ کہ جب حضرت ابراہیمؑ ان کو بلائیں۔ تو وہ فوراً ان کی دعوت کو قبول کر لیں۔ اور جس وقت وہ جناب ان کو طلب کریں۔ اسی وقت ان کی طرف چلے آئیں۔ اور اس واقعہ سے حضرت ابراہیمؑ کو اس امر پر متنبہ کیا۔ کہ جب میں قیامت کے دن مُردوں کے زندہ کرنے اور ان کے محشور کرنیکا ارادہ کرونگا۔ تو ہر طرف سے بلا توقف میری دعوت کو قبول کر کے میری جناب میں آکر جمع ہو جائینگے۔ جس طرح سے یہ پرندے آج تمہاری طرف بے اختیار دوڑے آتے ہیں۔

یہ جواب بالکل بے سروپا اور سراسر فضول اور بے کار ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تو اللہ تعالےٰ سے یہی سوال کیا تھا۔ کہ مجھ کو یہ دکھا دے۔ کہ تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ اور زندہ پرندوں کا حسب عادت و معمول حضرت ابراہیمؑ کی طرف دوڑا آنا۔ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں کسی قسم کی حجت اور دلیل نہیں پائی جاتی۔ ہاں اس میں اس مسئلہ کا بیان ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس صورت پر ہو۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

اگر کوئی کہے۔ کہ جبکہ اللہ تعالےٰ نے اجزاء منفرقہ کے جوڑنے اور زندہ کرنے کے بعد حضرت کو ان کے بلانے کا حکم دیا تھا۔ تو اس بلانے میں کیا فائدہ تھا۔ حالانکہ جب حضرت نے ان کو دیکھا۔ کہ اب ان کے اجزائے بدنی آپس میں جڑتے اور ترکیب پاتے ہیں۔ تو سمجھ لیا تھا۔ کہ وہ حالت زندگی کی طرف عود کر رہے ہیں۔ تو بلانے میں سوا منفرقہ حالت کے سمیٹ لینے اور ایک جا کر لینے کے اور کیا مقصد اور مدعا تھا۔ اور یہ پہلے ہی عمل میں آگیا تھا۔

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ پرندوں کے بلانے میں نہایت روشن اور بیّن فائدہ ہے۔ اس لئے کہ جب حضرت نے ان کے اجسام کے اجزاء کو دوبارہ جڑتے ہوئے اور ملے ہوئے مشاہدہ کر لیا۔ تو ان کا از سر نو زندہ ہونا ان کو متحقق نہ ہوا تھا۔ یہاں جب وہ دوڑ کر حضرت کے پاس آگئے۔ تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ کہ وہ زندہ ہو گئے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قول تعالےٰ وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيمَ لِاَبِيهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِيَّاهُ (اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے استغفار کرنا صرف اس وعدے کی وجہ سے تھا جو اِن سے اس نے کیا تھا) کے کیا معنی ہیں۔ اور یہ کیونکر جائز ہے۔ کہ کافر کے لئے استغفار کی جائے۔ یا اس کو استغفار کا وعدہ دیا جائے۔

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ ان کے باپ[1] (مربی) نے حضرت ابراہیمؑ سے ایمان لانیکا وعدہ کیا تھا۔ اور نفاق کے طور پر ایمان کا اظہار کیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کو اس کی نسبت نیک گمان ہوگیا تھا۔ اس لئے آپ نے اس نیک ظن کے مطابق اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے مغفرت کی دعا کی تھی۔ مگر جب حضرت کو معلوم ہوا۔ کہ وہ اپنے کفر پر بدستور قایم ہے۔ تو طلب استغفار سے رجوع کی۔ اور اس سے تبرا اور بیزاری کا اظہار کیا۔ چنانچہ قرآن اس پر شاہد ہے۔ پس یہ کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔ کہ اس امر کو حضرت ابراہیمؑ کا گناہ قرار دیا جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود ان کی معذوری بیان فرماتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کا اس کے لئے استغفار کرنا محض وعدہ کی وجہ سے تھا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا۔ کہ وہ بدستور دشمن خدا ہے۔ تو حضرت نے اس سے تبرا اور بیزاری ظاہر کی۔

اگر کوئی کہے۔ کہ اگر یہ آیت حضرت ابراہیمؑ کو گناہ سے منسوب کرنے پر دلالت نہیں کرتی۔ تو آیۂ ذیل جو سورۂ ممتحنہ میں ہے۔ ضرور اس امر پر دال ہے۔ اس لئے کہ خدا فرماتا ہے۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِىٓ اِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ اِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرَاهِيمَ لِاَبِيهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ خدا نے سوائے اس امر کے کہ ابراہیم نے اپنے باپ (مربی) کے لئے استغفار کا وعدہ کیا تھا۔ اور سب امور میں ہم کو اس جناب کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرتؑ کا وہ فعل

---

[1] یہاں حضرت ابراہیمؑ کے چچا آزر مراد ہیں جس نے حضرت کو پالا تھا۔ کیونکہ حضرت کے والد ماجد تارخ تھے۔ جو ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ ۱۲۔ مترجم۔

بُرا تھا۔

ہم اس کے جواب میں کہینگے جو کچھ کہ سوال میں مذکور ہے۔ یہ ضروری اور واجب نہیں ہے۔ بلکہ ابراہیمؑ کے اپنے باپ کے لئے استغفار کرنے کو مستثنےٰ کرنے کی وجہ انہی امور میں داخل ہے۔ جن میں آپ کی پیروی کرنے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ کلام مطلق ہوتا۔ اور استثنا اس میں نہ ہوتا۔ تو بسبب نہ جاننے وجہ استغفار اور لاعلمی وعدہ سابقہ کے جو ان کے باپ نے ایمان لانے کی بابت ان سے کیا تھا۔ ظاہر استغفار میں آپ کی پیروی کرنے کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا۔ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کفار کے حق میں بالعموم استغفار کو اچھا سمجھا جاتا۔ اس لئے استغفار کو تمام کلام سے مستثنےٰ کر دیا۔ نیز اس کے مستثنےٰ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان کے باپ نے جو اظہارِ ایمان کیا تھا۔ اور ظاہر طور پر ایمان لانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ سب کو معلوم نہ تھا۔ الغرض اس بیان سے وہ اشکال رفع ہو جائیگا۔ جو اس باب میں پیدا ہوتا تھا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک ایسے کافر کے لئے استغفار کیا۔ جو اپنے کفر پر اصرار کرتا تھا۔ نیز یہ بھی ممکن ہے۔ کہ قولہ تعالےٰ اِلَّا قَوْلَ اِبْرَاهِیْمَ لِاَبِیْهِ کا استثنا تاسی (پیروی) سے نہ ہو۔ بلکہ جملہ ثانیہ سے جس کے بعد بلا فاصلہ یہ قول مذکور ہے۔ اس کا استثنا ہو۔ اور وہ جملہ اذ قالوا لقومهم انا برآؤ منکم الخ قولہ وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدًا حتےٰ تومنوا باللہ وحدہ ہے۔ چونکہ ابراہیمؑ کا اپنے باپ کیلئے استغفار کرنا اس جملہ کے مضمون کے مخالف تھا۔ اس لئے اس کا استثنا ضروری ہوا۔ ورنہ یہ شبہ پڑتا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے بھی ویسا ہی عداوت اور دشمنی کا سلوک کیا۔ جیسا کہ غیروں سے کیا۔

رہا قولہ تعالےٰ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِیَّاهُ۔ سو اس کی تفسیر میں بعض کا قول ہے۔ کہ باپ نے بیٹے سے وعدہ کیا تھا۔ جس کا ذکر پیشتر گزرا۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ یہ وعدہ بیٹے نے باپ سے کیا تھا۔ کہ میں ضرور تیرے لئے خدا سے استغفار کرونگا۔ اور بہتر یہی ہے۔ کہ وعدہ باپ کی طرف سے بیٹے پر ایمان لانے کا ہو۔ کیونکہ اگر ہم دوسرے معنی پر محمول کریں۔ تو مخالف کا اعتراض قائم رہتا ہے۔

اس مقام پر کوئی شخص کہہ سکتا ہے۔ کہ جب وہ کافر تھا۔ تو حضرت ابراہیمؑ نے

اس سے استغفار کے وعدہ دینے کا ارادہ کیوں کیا؟ تو اس اعتراض کے جواب میں لازم ہوگا۔ کہ ہم یہ کہیں۔ کہ اس نے حضرت سے ایمان کا اظہار کیا تھا جس سے آپ کو اس کے ایمان لانیکا ظن حاصل ہوگیا تھا۔ اور یہی جواب اول کا مطلب و مقصد ہے ✤

اگر کوئی کہے۔ کہ تم اس امر کا انکار کیوں کرتے ہو۔ شاید یہ وعدہ بیٹے ہی کی طرف سے باپ کے لئے استغفار کرنیکا ہو۔ اور بیٹے نے باپ سے یہ وعدہ اسی وجہ سے کیا ہو۔ کہ باپ نے بیٹے سے اپنے ایمان لے آنے کا اظہار کیا تھا ✤

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ ظاہرِ قرآن اس سے مانع ہے۔ اس لئے کہ خدا فرماتا ہے۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ۔ پس حُسنِ استغفار کو وعدہ پر معلل کیا ہے۔ اور وعدہ حُسنِ استغفار میں مؤثر نہیں ہوسکتا۔ مگر صرف اس صورت میں جب کہ باپ نے بیٹے سے ایمان لانے کا وعدہ کیا ہو۔ اس لئے کہ جب وعدہ بیٹے کی طرف سے ہو۔ تو اس کے لئے استغفار کرنا مستحسن نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ کہا جائے۔ کہ بیٹے نے باپ سے استغفار کرنے کا جو وعدہ کیا تھا۔ وہ صرف اس کے اظہار ایمان کی وجہ سے تھا۔ تو اس کے لئے حسن استغفار میں اس کا اظہار ایمان ہی مؤثر ہوگا نہ کہ وہ وعدہ ✤

اگر کوئی کہے۔ آیا عقاب کفر کا ساقط کرنا اور اس کے مرتکب (کافر) کی مغفرت کرنا عقل کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے؟ یعنی جائز ہے۔ اور صرف سمع اور اخبار ضرور اس کے مانع ہیں۔ پس ممکن ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے اس وجہ سے استغفار کی ہو۔ کہ عقاب کفار کا قطعی حکم اس وقت تک سمعی طور پر آپ تک نہ پہنچا ہو۔ اور صرف حکم عقلی پر ہی آپ نے عمل کیا ہو ✤ اور یہ دعوے کرنا ناممکن ہے۔ کہ ہماری شریعت میں جو عقاب کفار کا قطعی حکم ہے۔ یہی حکم ان کی شریعت میں بھی تھا۔ کیونکہ اس دعوے کی کوئی سبیل معلوم نہیں ہوتی ✤

ہم کہینگے۔ کہ یہ وجہ جائز ہوسکتی تھی۔ اگر قرآن سے اس کے خلاف ثابت نہ ہوتا۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالے فرماتا ہے۔ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (پیغمبر اور مومنین کے لئے مناسب نہیں ہے۔ کہ وہ مشرکوں کے لئے طلب آمرزش کریں

اگرچہ وہ ان کے قرابتی ہی کیوں نہ ہوں۔ جبکہ ان کو معلوم ہو جائے۔ کہ وہ اہل جہنم ہیں) پھر اس پر عطف ڈال کر فرماتا ہے۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ (اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کیلئے استغفار کرنا صرف اس وعدے کی وجہ سے تھا۔ جو ان سے اس نے کیا تھا۔ مگر جب ان کو اس کا دشمن خدا ہونا معلوم ہو گیا۔ تو اس سے بیزار ہو گئے۔) پس آپ کے حسن استغفار کی علت کی تصریح کر دی۔ اور وہ وعدہ ہے۔ اور اگر حسن استغفار کی وجہ وہ ہوتی۔ جو سوال میں ہے۔ تو یوں کہنا واجب تھا۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے مغفرت کا سوال کیا۔ اس لئے کہ ان کو معلوم نہ تھا۔ کہ وہ ضرور اہل نار سے ہے۔ اور ان کی شریعت میں عقاب کفار کا حکم قطعی طور پر نازل نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ اس آیت کا مقتضا اس کے برخلاف معلوم ہوتا ہے۔ اور اس سے لازم آتا ہے۔ کہ اس باب میں جو چیز ہمارے لئے جائز نہیں ہے۔ وہی حضرت ابراہیمؑ کے لئے بھی جائز نہ تھی۔ اور اس میں ان کا عذر سوائے اس وعدے کے اور کچھ نہیں ہے۔ جو حضرت سے ان کے باپ نے کیا تھا۔

اور ابو علی محمد بن عبد الوہاب جبائی نے اس آیت کی تاویل میں جو سورۂ توبہ میں ہے۔ ایسی خبر بیان کی ہے۔ کہ جو ہم ذکر کرتے ہیں۔ اور اس میں خرابی بیان کرتے ہیں۔ اس امر کے ذکر کرنے کے بعد کہ استغفار صرف اس وعدہ کے سبب سے تھا۔ جو باپ نے خدا پر ایمان لانے کا کیا تھا۔ کہتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے قصۂ ابراہیمؑ کو قولہ ما کان للنبی والذین اٰمنوا معہ ان یستغفروا للمشرکین کے بعد صرف اس لئے ذکر فرمایا ہے۔ کہ کوئی یہ وہم نہ کرے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ابراہیمؑ کے لئے اس میں وہ امر مقرر کیا تھا۔ جو آنحضرت صلعم کے لئے مقرر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ بات جو آنحضرتؐ کے لئے مقرر نہیں کی۔ اس کا کسی شخص کیلئے بھی مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ افعال و احکام الٰہی سے نارضامند ہونا ہے۔ اور اس کا یہ قول صریحاً غیر صحیح ہے۔ کیونکہ جائز ہے۔ کہ ہمارے نبی صلعم کے سوا اور پیغمبروں کے لئے جن کو قطعی طور پر یہ حکم نہیں دیا۔ کہ کفار لامحالہ عقاب میں مبتلا ہونگے۔ یہ مقرر کرے۔ کہ وہ کفار کے لئے استغفار کریں۔ اس لئے کہ عقل اس امر (استغفار کفار) سے مانع نہیں ہے۔ بلکہ صرف سمع (احکام سمعی یعنی شرعی) اس امر سے مانع ہے۔ جس کا ارتفاع (نفی) ہم نے

فرض کرلیا ہے۔ (اس سے معلوم ہوا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے کافر سمجھ کر اس کے لئے مغفرت کی دعا نہ کی تھی۔ بلکہ ان کو اس کے مومن ہونے کا گمان تھا۔ مترجم)*

اگر معترض یہ کہے۔ کہ میرا منشا تو اس کلام سے یہ ہے۔ کہ جب عقاب کفار کا قطعی حکم معلوم ہو جائے۔ تو کسی کو بھی ان کے لئے استغفار کرنا جائز نہیں ہے*

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ تمہارے ظاہر کلام سے یہ مفہوم نہیں ہوتا۔ اور اگر تمہارا یہی منشا تھا۔ تو تم پر لازم تھا۔ کہ صاف صاف بیان کرتے۔ اور ابہام کو رفع کر دیتے۔ اور بات صرف اتنی ہے۔ کہ جب عقاب کفار کا حتمی وعدہ خدا کی طرف سے نازل ہو چکے۔ تو ان کے لئے استغفار کرنا جائز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں کہ ایسا کرنا احکام الٰہی پر ناراضامند ہونا ہے۔ جیسا کہ ابو علی جبائی کے قول میں گزرا۔ کیونکہ ایسا کرنا خدا سے اصرار کے ساتھ یہ سوال کرنا ہے۔ کہ اس باری تعالےٰ سے اپنے اخبار میں کذب اور اپنے افعال میں قبیح صادر ہو۔ حالانکہ وہ خبر دے چکا ہے۔ کہ میں کافر کو نہ بخشونگا*

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ جب تمہارے مذہب کے موافق انبیاء کی دعائیں ہمیشہ قبول ہوتی ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے دعا کی۔ جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ (اے میرے خدا مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا)۔ مگر آپ کی یہ دعا قبول نہ ہوئی۔ اور آپ کی اولاد میں سے اکثروں نے بت پرستی کی۔ نیز یہی سوال قولہ تعالےٰ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي (اے میرے پروردگار مجھکو اور میری اولاد میں سے نماز کو قایم کرنے والے بنا) کے بارے میں بھی ہے*

جواب۔ اس سے کہا جائیگا۔ کہ مفسرین نے اس دعا کو خصوص پر محمول کیا ہے[1] یعنی وہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا میں آپ کی اولاد میں سے وہ لوگ شامل

---

[1] حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کو خصوص پر محمول کرنا جائز ہی نہیں۔ بلکہ واجب ہے۔ اور حقیقۃ الامر بھی یہی ہے۔ قرآن کی اور آیات بھی اس کی شاہد ہیں۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا مقصود یہ ہے۔ کہ اے خداوند جیسا تو نے مجھ کو برگزیدہ کیا ہے۔ اور خاص خلعت اسلام و ایمان سے مشرف فرمایا ہے۔ اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ میری ذریت اور اولاد میں یہ سلسلہ قائم رکھ۔ اور حضرتؑ نے یہ دعا اس وقت کی ہے۔ جب کہ آپ خانہ کعبہ بنا رہے تھے۔ جیسا کہ سورۂ بقر

ہیں جن کی بابت علم الٰہی میں گزر چکا تھا۔ کہ وہ ایمان لائینگے۔ اور بت پرستی نہ کرینگے۔ تاکہ حضرتؑ کی دعا مستجاب ہو۔ اور مفسرین نے بیان کیا ہے۔ کہ اس آیت کے ظاہری معنی سے جو عموم کے مقتضی ہیں۔ دلائل کے ذریعے خصوص کی طرف عدول کرنا واجب اور لازم ہے۔ اور یہی جواب صحیح ہے۔ اور ممکن ہے۔ کہ اس آیت میں اور وجہ بھی پیدا ہوسکے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ قول حضرت ابراہیمؑ واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام سے

(بقیہ نوٹ) رکوع ۱۵ میں ہے۔ واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک الی ان قال۔ ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایٰتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم۔ خلاصہ ترجمہ۔ جب ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے (بنا رہے تھے۔ یہ دعا کی) اے ہمارے پروردگار اس کو ہم سے قبول کر۔ تو ہر ایک بات کو سننے والا اور ہر ایک بات کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہم کو (ابراہیمؑ و اسمعیلؑ) اپنا خاص مسلمان بنا۔ اور ہماری ذریت میں سے ایک امت قرار دے۔ جو مثل ہمارے خاص تیری ہی مسلمان ہو۔ یہاں تک کہ عرض کیا۔ اے پروردگار اور ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کر۔ جو اُن پر تیری آیات کی تلاوت کرے۔ اور اُن کو کتاب و حکمت تعلیم کرے۔ اور اُن کا تزکیہ کرے۔ بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے۔ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا خاص ہے۔ اور اُن کی امت میں سے ایک خاص امت سے متعلق ہے۔ نہ کہ حضرت کی تمام اولاد مراد ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا مع اسمعیلؑ دعا کرنا اور ذریت کو دونوں کی طرف منسوب کرنا اور دعا مانگنا بتلا رہا ہے۔ کہ اولاد حضرت اسحاقؑ داخل نہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیم کی اُس ذریت میں سے جو نسل حضرت اسمعیلؑ سے ہو۔ ایک خاص امت مراد ہے۔ نیز آیت یہ بھی ثابت کرتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمعیلؑ نے جس اسلام کی اپنے واسطے خواہش کی ہے۔ اُسی اسلام سے متصف ایک خاص امت کی التجا کی ہے۔ کیونکہ واجعلنا مسلمین لک واجعل امۃ مسلمۃ لک نہیں فرمایا۔ اور جعل مکرر مذکور نہیں۔ بلکہ جعل واحد ہے۔ اور نیز لک کا لام اختصاص بھی دونو جگہ مساوی ہے۔ لہذا حضرتؑ نے اپنی ذریت میں سے ایک ایسی امت کی خواہش کی ہے۔ جو اُسی اسلام سے متصف ہو جس اسلام سے حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمعیلؑ متصف تھے۔

حضرت کی یہ مراد ہو۔ کہ مجھ پر اور میری اولاد پر ایسا اپنا لطف و کرم کر جو ہم کو بتوں کی پرستش سے دور رکھے۔ اور میری خواہشوں کو ان کی طرف سے پھیر دے۔ اور جو شخص کسی شے سے ڈرایا گیا ہو۔ اور اس کے ترک کرنے کی اس کو رغبت دلائی گئی ہو۔ اور اس کو اس فعل سے باز رکھنے والے اسباب قوی اور زور آور ہوں۔ اُس کی نسبت کہا جاتا ہے۔ انّہ قد جنّبہٗ (کہ اس نے اس شخص کو اس کام سے بچا لیا)۔ دیکھو باپ جب بیٹے کو کسی فعل سے

(بقیہ نوٹ) اور وہ اسلام اسلام مطلق و بلا واسطہ (یعنی انقیاد مطلق) ہے۔ جو انبیاء سے مخصوص ہے۔ قال عزمن قائلہ ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ ولقد اصطفینٰہ فی الدنیا وانہ فی الاخرۃ لمن الصالحین۔ اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین۔ ترجمہ۔ اور کون ملّت ابراہیمؑ سے اعراض کر سکتا ہے۔ سوائے اُس کے جو اپنے نفس کو سفیہ و بیوقوف بنائے۔ اور البتہ ہم نے اُس کو برگزیدہ کیا دنیا میں۔ اور بیشک وہ آخرت میں صالحین میں سے ہے۔ یہ ہے اسلام بلا واسطہ اور اسلام مطلق من جمیع الجہات (یعنی انقیاد و فرمانبرداری مطلق) بنابریں اس اسلام خالص سے متصف حضرت کی ذریت میں سے چند خاص النفوس ہونگے۔ نہ تمام ذریت۔ اور سورۂ ابراھیمؑ کی آیات بھی اسی پر دال ہیں۔ آیات اس طرح ہیں۔ واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد امنا واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام رب انھن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور رحیم۔ ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون۔ الی ان قال رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ ومن ذریتی ربنا وتقبل دعاء۔ الآیۃ۔ محصل ترجمہ۔ اور جب ابراہیمؑ نے کہا اے پروردگار اس شہر (مکّہ) کو جائے امن قرار دے۔ اور مجھ کو اور میرے صلبی بیٹوں کو بتوں کی عبادت سے محفوظ و دور رکھ۔ اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ پس جس نے میری پیروی کی۔ وہ مجھ سے ہے۔ اور جس نے میری نافرمانی کی۔ پس خداوندا تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی بعض ذریت (اسمٰعیلؑ) کو ناقابل زراعت جنگل میں بیت الحرام کے پاس ساکن کیا ہے۔ تاکہ اے پروردگار وہ بنیاد نماز کو قایم کریں۔ پس لوگوں میں سے

ڈراتا ہے۔ اور اس کی برائیاں اور اس کے نقصانات اس کو جتلاتا اور بتلاتا ہے۔ اور اس کے ترک کرنے کی خوبیاں اور اس حالت میں جو نفع متصور ہیں۔ اس پر منکشف کرتا ہے۔ تو اس سے کہا کرتا ہے۔ اِنّی قد جنّبتک کذا و کذا و منعتک منہ (میں نے تجھ کو فلاں فلاں کام سے باز رکھا۔ اور اس سے تجھ کو ہٹا دیا)۔ حالانکہ اس کا منشا اس کلام سے وہی ہوتا ہے۔ جو ہم نے اوپر بیان کیا ۔

(بقیہ نوٹ) کچھ دلوں کو اُن کی طرف مائل کر۔ کہ اُن کی پیروی کریں۔ اور اُن کو ثمرات عطا کر۔ کہ وہ تیری درگاہ میں شکر گذار ہوں۔ (پھر فرمایا ہے) اے پروردگار مجھ کو اور میری بعض ذریت کو اساس نماز کا قایم کرنے والا قرار دے۔ اور اے پروردگار میری دعا کو قبول فرما۔ الآیۃ ۔ یہ آیات بالصراحت دال ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا مکہ معظمہ میں کی ہے۔ اور خاص حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ایک خاص امت کے واسطے ہے۔ اور وہ امت وہ ہے جس کو حضرت نے اپنے بعد تا قیام قیامت اپنا قایم مقام بنانا چاہا ہے۔ وہ خاص چند نفوس ہیں۔ جو اسلام بلا واسطہ و اسلام نبوتی سے متصف ہیں۔ کہ ایک اُن میں سے پیغمبرؐ تھے۔ اور یہ دعا حضرت ابراہیمؑ کی قبول ہوئی۔ اور اولاد اسمٰعیلؑ میں ایک امت خاص ایسی ہوئی۔ اور اُن میں پیغمبر مبعوث ہوا۔ اور وہ امت اُسی طرح محفوظ و معصوم باقی ہے۔ اور قیامت تک باقی رہیگی جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی۔ اور دعا حضرت ابراہیمؑ کی ضرور مستجاب ہوئی۔ اور جن لوگوں کے واسطے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی۔ کہ وہ بت پرستی۔ کفر و شرک سے محفوظ و معصوم رہیں۔ وہ محفوظ و معصوم رہے ہے۔ اور اُن سے کبھی کفر و شرک وغیرہ صادر نہیں ہوا۔ اور جب کہ ومن ذریتی و من ذریتنا سے بالصراحت بعض ذریت مراد ہے۔ اور قرائن حالیہ و مقالیہ بالبداہت شاہد ہیں۔ تو واجنبنی و بنیّ کو بھی اُسی محمل پر محمول کرنا واجب و ضروری ہے۔ اگرچہ بظاہر لفظ من نہ ہو۔ جو تبعیض پر دال ہے۔ اور سوائے اس کے اس آیہ شریفہ کا کوئی محمل نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ رہا یہ امر کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا اُس وقت کی جب کہ خدا آپ کو نبی۔ رسول۔ خلیل کے لقب سے ملقب اور خلعت امامت سے ممتاز فرما چکا تھا۔ انّی جاعلک للنّاس اماماً۔ پھر اُن کی اس درخواست کا کیا مطلب کہ خدا ہم کو مسلمان بنا۔ حالانکہ خدا خود فرماتا ہے۔ ولقد اصطفینٰہ فی الدنیا و انّہ فی الاٰخرۃ لمن الصالحین۔ اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین۔

اور کسی شخص کو یہ کہنا سزاوار نہیں ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا کس لئے کی۔ حالانکہ آپ یہ جانتے تھے۔ کہ اللہ تعالےٰ ضرور ایسا لطف و کرم ہمارے حال پر فرمائیگا جو دواعی (بواعث و اسباب) ایمانی کو قوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سوال اوّل ہی سے دو انفذ کردہ بالاجوابوں پر وارد ہوتا ہے۔ کیونکہ لازم ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ ایسا لطف فرمائے جس سے ضرور بالضرور طاعت الٰہی وقوع میں آئے۔ جیسا کہ اس پر واجب ہے۔ کہ ایسے سامان عطا فرمائے۔ جو دواعی (اسباب) طاعات کو قوی کریں۔ اور اس شبہ کا جواب یہ ہے۔ کہ جس چیز کی نسبت پیغمبر کو معلوم ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ عنقریب ضرور بالضرور اس کو عطا فرمائیگا۔ اس کے لئے وہ بطور تذلل اور تعبد اور رجوعیت الی اللہ تعالےٰ کے خدا سے دعا کر سکتا ہے۔ اور قولہ رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ ومن ذرّیتی میں اس شبہ کی گنجایش بہت ہی کم ہے۔ اس لئے کہ ظاہر کلام آپ کی ذریت کثیرہ میں خاص کر نماز گزاروں کا مقتضی ہے۔ کیونکہ اس میں من ذرّیتی فرمایا ہے۔ اور من لبعضیہ ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ آیۂ ذیل کے کیا معنی ہیں۔ وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے ملائکہ کے لئے کھانا کیوں حاضر کیا۔ حالانکہ حضرت کو معلوم تھا۔ کہ وہ کھانا نہیں کھاتے۔ اور جب فرشتے کھانے سے باز رہے۔ تو حضرت ان سے خوف زدہ کیوں ہوگئے تھے۔ اور جس امر میں حکم الٰہی صادر ہو چکا ہو۔ اس میں اپنے پروردگار سے حضرت کا جھگڑنا کیا معنی؟

جواب۔ کھانا اس لئے پیش کیا گیا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت یہ معلوم نہ

(بقیہ نوٹ) جبکہ بتصدیق خداوند عالم حضرت اسلام مطلق رکھتے تھے۔ پس حضرت کے اسلام طلب کرنے اور اسی طرح اقامۃ الصلوٰۃ کی خواہش کرنیکا یہ مطلب ہے۔ کہ اے خداوند جو اسلام مطلق (انقیاد خالص) مجھکو عطا ہوا ہے۔ اس کے ادا کرنے اور اس کو فعلیت میں لانیکی توفیق عطا فرما۔ تاکہ ہم سے آثار اسلام ظاہر و صادر ہوں۔ سبحان اللہ یہ دعا حضرت کی قبول ہوئی۔ اور حضرت نے اسلام و نماز کو ایسا قایم کیا۔ جو قیامت تک قائم رہینگے۔ بہرحال حضرت ابراہیمؑ پر یہ اعتراض بالکل بے سروپا اور بعدم تدبر پر مبنی ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

تھا۔ کہ وہ فرشتے ہیں۔ کیونکہ آدمی کی صورت بن کر وہاں آئے تھے۔ اور آپ نے ان کو مہمان سمجھا تھا اور مہمانوں کی مہمانداری کرنا آپ کی عادت میں داخل تھا۔ اس لئے آپ نے ان سے کھانا کھانے کے لئے درخواست کی۔ تاکہ وہ آپ سے مانوس ہوں۔ اور ان کے دل بشاش اور خوش ہو جائیں۔ جب انہوں نے کھانا نہ کھایا۔ تو ان کی یہ حرکت حضرت کو مکروہ معلوم ہوئی۔ اور آپ نے گمان کیا۔ کہ کھانا نہ کھانا شاید اس وجہ سے ہے۔ کہ یہ مجھ سے کچھ بدی کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے کہا۔ کہ ہم خدا کے رسول ہیں۔ ہم کو اس نے قوم لوط کے ہلاک کرنے کے لئے بھیجا ہے + اور حنیذ کے معنی ہیں بھنا ہوا جو پتھروں پر بھونا گیا ہو۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ حنیذ وہ ہے جس کا پانی اور چربی ٹپکائی جائے۔ اور بھونا جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حنیذ صرف پکے ہوئے کو کہتے ہیں + اور ابو العباس شاعر کا شعر ہے۔ شعر

اذا ما اغتبطنا اللحم للطالب القرى + حنذنا ہ حتیٰ یمکن اللحم آکلہ

اب اگر کوئی کہے۔ کہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا۔ کہ ہم فرشتے ہیں۔ تو حضرت نے ان کے بیان کی تصدیق کیونکر کی۔ اور کس دلیل سے ان کو فرشتے سمجھ لیا +

ہم کہتے ہیں۔ کہ بیشک اس دعوے کے ساتھ ایک ایسی علامت کا ہونا ضروری ہے۔ جس سے ان کے دعوے کی تصدیق ہو جائے۔ سو منقول ہے۔ کہ انہوں نے اس بچھڑے کے لئے جس کو حضرت ابراہیمؑ نے ذبح کر کے ان کے لئے کباب کیا تھا۔ خدا سے دعا کی۔ کہ اس کو زندہ کر دے۔ اور وہ زندہ ہو کر چرنے چگنے لگا +

اور قول تعالےٰ یجادلنا کی تفسیر میں بعض مفسرین یہ کہتے ہیں۔ یجادل رسلنا (ہمارے رسولوں سے جھگڑتا ہے) اور مجادلہ کو اپنی ذات اقدس کی طرف اس لئے منسوب کیا۔ کہ وہ اس کے رسول اور ایلچی تھے۔ اور حضرتؑ نے ان سے یہ دریافت کرنے کے لئے مجادلہ کیا تھا۔ کہ قوم لوط پر جو عذاب نازل ہوگا۔ وہ عذاب استیصال ہے یا عذاب تخویف۔ وہ عذاب تمام قوم کے لئے عام ہے۔ یا خاص اشخاص کے لئے۔ اور لوطؑ اور اس کے مومنین اہل وعیال جو اس قوم میں ملے جلے رہتے ہیں۔ ان کی نجات کیونکر ہوگی۔ چونکہ ان امور کے دریافت کرنے میں مراجعۃ یعنی رد و بدل ہوئی۔

اور نبوت طلب کیا گیا ہے۔ اس لئے مجازاً اس کو مجادلہ کہا گیا ہے۔

اور بعض کا قول یہ ہے۔ کہ یجادلنا کے معنی یہ ہیں۔ کہ ابراہیمؑ ہم سے قوم لوطؑ کے بارے میں یہ درخواست کرتا تھا۔ کہ اے خدا ابھی ان سے عذاب کو ہٹا لے۔ شاید کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور نیکی کرنے لگیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس کو خبر دی۔ کہ اے ابراہیم صلاح اور بہتری ان کی ہلاکت ہی میں ہے۔ اور کلمہ عذاب ان کے لئے محقق ہو چکا ہے۔ اور اس آیت میں مسئلت یعنی درخواست کو مجازی طور پر مجادلہ کہا گیا ہے۔

پس اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالیٰ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ کے کیا معنی ہیں؟ اس آیت میں لما کے بعد فعل مستقبل لایا گیا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے۔ کہ لمّا کے بعد جو فعل آتا ہے۔ ماضی کے معنی دیا کرتا ہے۔

اس سوال کے دو جواب ہیں۔

جواب اوّل۔ اس آیت میں محذوف ہے۔ اور یجادلنا کے معنی اقبل یجادلنا اور جعل یجادلنا کے ہیں۔ اور اقبل یا جعل کو اس لئے حذف کیا گیا کہ کلام مذکور اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کا مقتضی ہے۔

جواب دوم۔ لفظ لمّا اپنے جواب میں ماضی کو چاہتا ہے۔ جیسے لفظ اِنْ اپنے جواب میں مستقبل کو۔ پس جب کہ اہل زبان نے پسند کیا۔ کہ اِنْ کے جواب میں ماضی لائیں۔ اور اس کے معنی مستقبل کے لیں۔ اس لئے کہ اِنْ اس پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے پسند کیا۔ کہ لمّا کے بعد فعل مستقبل کو لائیں۔ اس بھروسے پر کہ لفظ لمّا اس کے ماضی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً اِنْ زُرتَنی زُرتُكَ کے معنی اِنْ تزرنی ازرك ہیں۔ اور لمّا تزرنی ازرك کے معنی لمّا زرتنی زرتك کے لئے جاتے ہیں۔ اور اِنْ کے جواب میں ماضی کے آنے کے ثبوت میں یہ شعر پیش کیا جاتا ہے۔ شعر

اِنْ یسمعوا ریبۃً طاروا بہا فرحاً ✤ منّی وما سمعوا من صالح دفنوا

اور دوسرا شعر جس میں ماضی کے جواب میں مستقبل داخل ہوا ہے۔ یہ ہے۔ شعر

وَمیعاد قومٍ اِنْ ارادوا لقاءنا ✤ بجمع منّی ان کان للناس مجمعٌ

یَرَوا خارجیاً لم یرالناس مثلَہ ✤ تشیّبُ لھم عینُ البیرِ واصبعُ

اور اس کا ایک اور جواب یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ یجادلنا کو حال قرار دیں۔ نہ کہ لما کا جواب۔ اور اس وقت معنی یہ ہونگے۔ کہ اِنَّ الْبُشْریٰ جَآءَتْہُ فِی حَالِ الْجِدَالِ لِلرُّسُلِ یعنی حضرت کو بشارت اس وقت ہوئی جبکہ آپ فرشتوں سے جھگڑ رہے تھے۔

اب اگر کوئی کہے۔ کہ اس صورت میں لمّا کا جواب کہاں گیا۔ تو ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ وہ کسی ایک جگہ مقدر ہو۔ یا تو قولہ تعالے اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ میں۔ اور اس کی تقدیر یہ ہوگی۔ قلنا اِنَّ ابراھیم کذالک۔ اور دوسرا مقام یہ ہے۔ کہ اللہ تعالے کی مراد یہ ہو۔ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ نَادَیْنَاهُ یَا اِبْرٰهِیْمُ۔ پس لما کا جواب نادینا ہ ہے۔ اگرچہ محذوف ہے۔ اور لفظ ندا اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ ہر دو صورتیں جائز ہوسکتی ہیں۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اللہ تعالے حضرت ابراہیمؑ کی زبانی قرآن میں نقل فرماتا ہے۔ کہ حضرتؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ اس قول کے ظاہر معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالی اعمالِ بندگان کا خالق ہے۔ فرمائیے۔ اس میں کونسی صورت ہوسکتی ہے؟ اور حضرت ابراہیمؑ کا اس کلمہ کے اطلاق کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے؟

جواب۔ جو کوئی نہایت غور و تامل سے اس آیت میں فکر کریگا۔ اس کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ اس کے معنی اس معنی کے برخلاف ہیں۔ جو فرقہ مجبرہ نے لئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالے خبر دیتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو بتوں کی پرستش کرنے اور خدا کے سوا ان کو اپنے معبود قرار دینے پر اس طرح ملامت کی۔ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ۔ (کیا تم ان اشیا کی پوجا کرتے ہو۔ جن کو تم خود اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو۔) یہاں منحوت یعنی تراشی ہوئی چیز اور جس پر عمل نحت (تراشنا) ہوا ہے مراد ہے۔ نہ کہ نحت (تراشنا)۔ جو خود ان لوگوں کا فعل تھا۔ اس لئے کہ وہ قوم نحت کی جو اجسام میں خود ان لوگوں کا فعل تھا پرستش نہ کرتے تھے۔ بلکہ خود اجسام ہی کی پرستش کرتے تھے۔ پھر فرمایا۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (حالانکہ خدا نے تمکو اور تمہارے ان بتوں کو جن کو تم بناتے ہو۔ پیدا کیا ہے)۔ آپ کا یہ فرمانا ضرور بالضرور پہلے کلام سے متعلق اور بت پرستی کی ممانعت کا مقتضی ہے۔ اور یہ صفت اس میں جب ہی موجود ہوسکتی ہے۔

کہ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ سے اصنام (بُت) مراد لی جائے۔ جن کو وہ تراشتے تھے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ کیوں پوجتے ہو تم ایسی چیز کو جس کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ تم کو پیدا کیا۔ اور یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ کوئی یہ کہے۔ کہ کلام ثانی کلام اول سے متعلق تو ہے۔ مگر معنی تمہارے مراد کے برخلاف ہیں۔ اس لئے کہ جب یہ مراد لی جائے۔ کہ اللہ تعالٰے نے تمکو اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔ تو دوسرا کلام اول کے کلام سے متعلق ہوا۔ کیونکہ جس کو اللہ تعالٰے نے پیدا کیا ہے۔ اس کو جائز نہیں ہے۔ کہ وہ غیر خدا کی پرستش کرے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اگر ان کے ظن کے موافق مراد لی جائے۔ تو فقط وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ کہنا ہی کافی ہے۔ اور ما تعملون کی کچھ ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس کو اول کے کلام سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ اور وہ منع بُت پرستی میں ذرا موثر نہیں۔ الغرض صحیح یہ ہے۔ کہ ما تعلمون سے **معمول فیہ** مراد ہے۔ جس کو ہم نے اوپر بیان کیا۔ تاکہ آپ کا قول (وما تعملون) اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ کے مطابق ہو۔

اگر وہ کہیں۔ کہ قول وما تعملون میں معمول فیہ مراد لینا ظاہر معنی سے عدول کرنا ہے اس لئے کہ یہ لفظ حقیقۃً **عمل** میں مستعمل ہے۔ نہ کہ معمول فیہ میں۔ بنابریں اہل عرب بجائے اعجبنی عملك و فعلك کے اعجبنی ما تعمل و ما تفعل بولتے ہیں۔ **تو ہم** جواب دینگے۔ کہ تم نے جو دعوے کیا ہے۔ کہ یہ لفظ عمل میں ہی مستعمل ہے۔ یہ مسلم نہیں ہے۔ اس لئے یہ لفظ معمول فیہ اور عمل ہر دو میں یکساں مستعمل ہے۔ بلکہ معمول فیہ میں اس کا استعمال اکثر اور اظہر ہے۔ **دیکھو** اللہ تعالٰے عصائے موسٰےؑ کے باب میں فرماتا ہے۔ تلقف ما یافکون (وہ نگل جاتا تھا جو کچھ جادوگر جھوٹ موٹ بناتے تھے)۔ اور دوسری آیت میں ہے۔ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا (اے موسٰےؑ۔ جو کچھ تیرے داہنے ہاتھ میں ہے۔ اس کو ڈال دے۔ کہ وہ ان کی بنائی ہوئی چیزوں کو نگل جائے)۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہاں یہ مراد نہیں ہے۔ کہ وہ عصا ان کے اعمال کو (جو ان کے حرکات اور اعتمادات ہیں) نگل جاتی ہے۔ بلکہ یہ مراد ہے۔ کہ وہ ان رسیوں وغیرہ کو کھا جاتی ہے۔ جن میں ان کے **افک** و افترا کا عمل ہوا ہے۔ **نیز** خدا فرماتا ہے۔ یعملون لہ ما یشاء من محاریب و تماثیل و جفان کالجواب۔ پس معمول فیہ کو عمل سے موسوم کیا۔ اور اسی باب میں کہنے والا کہتا ہے۔ انہ عمل النجار۔ یہ چیز نجار کی بنائی ہوئی

ہے۔ اور ایسا ہی جُلاہے اور رنگریز کی مصنوعات میں بولا جاتا ہے ۔ اور یہاں بہت سے مقامات ایسے ہیں جن میں ما جب فعل کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو اس سے اجسام مراد لی جاتی ہے۔ نہ کہ اعراض جو کہ ہمارا فعل ہیں ۔ اس لئے کہ کہنے والا جب کہتا ہے اعجبنی ما تاکل و ماتشرب و ماتلبس۔ تو اس سے ماکول مشروب اور ملبوس (کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں) ہی مراد لینا جائز ہے۔ نہ کہ اکل۔ شرب اور لباس (کھانا۔ پینا اور پہننا)۔ پس ثابت ہوا کہ لفظ ما کا استعمال ہمارے مطلوبہ معنوں میں تو حقیقی معنوں سے زیادہ مشابہ ہے۔ اور معترض کے مطلوبہ معنوں میں مجاز ہے ۔

اگر بالفرض فقط یہی ثابت ہوتا کہ لفظ ما عمل اور معمول فیہ دونوں امروں میں مشترک اور حقیقی طور پر دونوں میں مستعمل ہے۔ تو بھی ظاہر کو ان کے ہاتھ سے نکال لینے اور ان کے دعوے کے باطل کرنے کو کافی تھا۔ اور معترض کو یہ کہنا مناسب نہیں کہ جس جگہ ما فعل کے ساتھ مستعمل ہو۔ اور مفعول فیہ اس سے مراد لی جائے۔ وہ صرف دلیل سے معلوم ہوا کرتا ہے۔ اور ظاہر آیت اس کے برخلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اس دعوے اور اس شخص کے دعوے میں کچھ فرق نہیں ہے۔ جو اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ لفظ ما جب فعل کے ساتھ استعمال کیا جائے اور مصدر اس سے مراد لی جائے۔ نہ کہ مفعول فیہ۔ تو یہ دلیل سے اور بطور مجاز کے اس معنی پر محمول ہوگا۔ حالانکہ ظاہر کلام اس کے برخلاف ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے بیان کے موافق کلام ثانی کا کلام اول سے متعلق ہونا اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ لہذا اس کی رعایت کرنا ضروری اور لازم ہے۔ نیز ہم نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب کلام کو معترض کی مراد پر محمول کیا جائے۔ تو کلام ثانی کلام اول سے متعلق نہ ہوگا۔ اور نہ اس میں کسی قسم کی تعلیل اور وجہ پائی جائیگی۔ حالانکہ ظاہر کلام اس بات کا مقتضی ہے۔ پس معترض کے دعوے کے مطابق اس آیت کے معنی میں ظاہر سے جس کو ہم نے بیان کیا ہے۔ عدول ہوا۔ اور اگر باوجود اس کے لفظ ما کے معنی میں ظاہر کا جو دعویٰ معترض نے کیا ہے۔ اس کو تسلیم کر لیا جائے۔ تو دونوں معارض ہو جائینگے۔ مگر جب کہ ہم نے اس کا غیر صحیح اور نادرست ہونا ظاہر کر دیا ہے۔ تو پھر اس کا یہ قول کیونکر درست ہو سکتا ہے ۔

اب ہم کہتے ہیں۔ کہ قولہ و ما تعملون بنفسہ کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اور یہاں ایک محذوف نکالنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو کہ ما کی طرف راجع ہو۔ جو الذی کے معنی ہیں ہے۔ اور یہ کسی طرح ہو نہیں سکتا۔ کہ وہ ھا کو مقدر کریں۔ تاکہ ان کا دعوے ہمارے مقابلہ میں تسلیم کیا جائے۔ جب کہ ہم لفظ فیہ کو مقدر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ دونو لفظ محذوف ہیں۔ اور ایک کا دوسرے سے افضل اور اولے ہونا دلیل پر موقوف ہے۔ حالانکہ ہم نے ظاہر کر دیا ہے۔ کہ تقدیر ھا کی صورت میں کلام میں وہی احتمال پایا جائیگا۔ جس کا معترض نے ذکر کیا ہے۔ اور ہماری تقدیر کی حالت میں جس کو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ کلام مختص اور غیر مشترک ہوگا۔ پس ہمارے مطلوبہ معنی ان کے معنوں سے ظاہر کلام کے زیادہ تر مناسب ہیں۔ اور ہمارے معنی کو ان کے معنوں پر ترجیح ہوئی۔ علاوہ ازیں آیت کے معنی اور اس کا مقصد ہمارے ہی بیان پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اگر ہم مخالف کی مظنونہ تقدیر کو مان بھی لیں۔ تو آیت کی غرض کو ناقص اور اس کے فائدہ کو باطل کرتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت یہ خبر دی ہے۔ کہ آپ نے اپنی قوم کو بت پرستی پر ملامت اور سرزنش کی۔ اور ان پر ایسی احتجاج کی۔ جو عبادت اصنام کے ترک کی مقتضی ہے۔ اور اگر آیت سے مخالف کے مظنونہ معنی مراد ہوتے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے اعمال کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ ہم جانتے ہی ہیں۔ کہ ان کا بت پرستی کرنا ان کے اعمال میں داخل ہے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے یہ کہا۔ اور اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور تمہاری بت پرستی کو پیدا کیا ہے۔ تو واجب ہوتا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ ان کو معذور رکھتے۔ اور ان کی ملامت اور سرزنش سے باز رہتے۔ کیونکہ انسان پر اس چیز کی بابت عتاب نہیں کیا جاتا ہے۔ جو خدا نے اس میں پیدا کی ہے۔ اور وہ اس کے بارے میں قابل زجر و توبیخ نہیں ہوتا +

اور اگر ہم آیت کو ان کے مزعومہ معنی پر محمول کریں۔ تو ایک اور وجہ سے بھی یہ کلام باہم متناقض ہو جائیگا۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وما تعملون کے کہنے سے عمل کو قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور حضرتؑ کا یہ قول اس (عمل) کو مخلوق الٰہی ہونے سے خارج کرتا ہے۔ کیونکہ عامل کسی شئے کا وہی شخص ہوا کرتا ہے۔ جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اور عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اور خلق سے اس صورت میں سوائے اس معنی کے

اور کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ پس خدا اس چیز کا خالق اور محدث کیونکر ہو سکتا ہے۔ جس کو کسی اور شخص نے بنایا ہو۔ اور عالم حدوث میں لایا ہو۔ ہاں اس وجہ سے کہ لغت میں خلق۔ تقدیر کے معنی میں ہے۔ خالق عالم اپنے غیر کے فعل کا خالق قرار پا سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کا مقدّر اور مدبّر ہے۔ اسی سبب سے اس شخص کو جس نے ادھوڑی کی تقدیر اور تدبیر کی ہو کہتے ہیں۔ خَلَقَ الْاَدِیْمَ (اس نے ادھوڑی کو خلق کیا ہے) اگرچہ نفس ادیم کو اس نے پیدا نہیں کیا۔ صرف اس کی درستی وغیرہ کی ہے۔ پس اگر ہم قولہ وما تعملون کو اجسام میں کام کرنے کے ماسوا ان کے اور افعال پر محمول کریں۔ تو یہ کلام اس صورت میں صحیح ہوگا۔ اور اس کے معنی یہ ہونگے۔ وَاللّٰہُ دَبَّرَکُمْ وَدَبَّرَ اَعْمَالَکُمْ۔ اور اللہ نے تم کو درست کیا ہے۔ اور تمہارے اعمال کو درست کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کا عالم حدوث میں لانیوالا اور فاعل نہیں ہے۔ اور یہ سب صورتیں واضح ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

دربیان تنزیہ حضرت یعقوبؑ بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا وجہ[1] ہے۔ کہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ کو اور بیٹوں پر ترجیح اور تفضیل دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ اس سے احسان و مروت کرتے۔ اور اس کو اپنے پاس رکھتے۔ اور محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بھائیوں نے

[1] جناب یعقوب علی نبینا وعلیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے اور بیٹوں پر کسی قسم کے حقوق میں ترجیح دینا قرآن سے ثابت نہیں۔ اور نہ احادیث صحیحہ ہی سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور نہ اُن کے بیٹوں ہی نے اُن کی لنسبت ایسا کہا ہے۔ انہوں نے بھی صرف زیادتی محبّت کا الزام اپنے نزدیک قائم کیا ہے۔ جیسا کہ اُن کے قول لیوسف واخوہ احب الیٰ ابینا منّا (یعنی یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں) سے ظاہر ہے۔ اور یہی امر قرآن سے بھی ثابت ہے۔ اور حضرت یعقوبؑ کا طرزِ عمل بھی بتلا رہا ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ اُنکو بہت ہی عزیز تھے۔ اور اُن کی جدائی اُن کو نہایت ہی شاق تھی۔ اب رہی زیادتی محبّت کی علت سو اس کی

اس پر حسد کیا۔ اور وہ بڑی نوبت پہنچی۔ جس کا ذکر قرآن میں ان کی زبانی یوں منقول ہے۔ کہ انہوں نے کہا۔ لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (بیشک یوسفؑ اور اس کا بھائی ہماری نسبت ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں۔ حالانکہ ہم ایک جماعت ہیں۔ بیشک ہمارا باپ کھلم کھلا محبت میں ڈوبا ہوا ہے)۔ اس کلام سے ظاہر ہے۔ کہ فرزندان یعقوبؑ نے حضرت یعقوبؑ کو ضلال اور خطا سے منسوب کیا۔ اور تم یہ کہہ ہی نہیں سکتے۔ کہ حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کے ان پر فضیلت دینے سے پہلے یہ حال معلوم نہ تھا۔ کہ اور بھائی حضرت یوسفؑ سے حسد کرینگے۔ اس لئے کہ بات بدیہی ہے۔ اور سب کو معلوم ہے۔ کہ تنافس اور تحاسد بنی آدم کا طبعی اور خلقی امر ہے۔

(بقیہ نوٹ) وجہ یہ ہے۔ کہ یہ قانون فطری ہے۔ کہ ہر ایک شے اپنی جنس و مثل کے ساتھ علاقہ باطنی رکھتی ہے۔ اور اُن دونوں میں ایک ایسی کشش ہوتی ہے۔ جو ایک کو دوسرے کی طرف خواہ مخواہ کھینچتی رہتی ہے۔ چنانچہ عالم علم کو دوست رکھتا ہے۔ اور عالم سے بالطبع مانوس ہوتا ہے۔ عابد عبادت کو پسند کرتا ہے۔ اور عابد ہی سے محبت رکھتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ اگر غور کروگے۔ تو تمام موجودات کو اسی قانون کے سلسلے میں مسلسل پاؤ گے۔ فان الجنس یمیل الی الجنس۔ پس یہی ہم جنسیت اور ہم مثلیت کا تعلق باطنی حضرت یعقوبؑ کو مجبور کرتا تھا۔ یوسفؑ کی محبت پر۔ کیونکہ حضرت یوسف علم و حلم، فضل و کمال، حکمت، سعادت، حسن خلق سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے علاوہ خلعت نبوت سے بھی سرفراز تھے۔ اور ان تمام امور میں اپنے دوسرے بھائیوں سے ممتاز تھے۔ اور خدا کے خاص برگزیدہ اور مخلص بندوں میں تھے۔ اور خدا کی خاص توجہ و عنایت اُن کے حال پر مبذول تھی۔ علاوہ اس کے حسن و جمال وہ پایا تھا۔ کہ انبیأ سابقین میں سے کسی کو عطا نہ ہوا تھا۔ جو خدا کی رحمت و نعمت عطیہ ہے اور آپ کے خاص برگزیدہ ہونے کی دلیل۔ اس لئے جناب یعقوبؑ جو پیغمبر خدا اور اُن کے برگزیدہ و نیکوکار بندے تھے۔ اور دل و جان سے نیک و نیکی کو دوست رکھتے تھے۔ جو انبیاء کی صفت ہے۔ اپنے نور نظر حضرت یوسفؑ کو جو ہمہ صفت موصوف تھے اور پیغمبر برگزیدہ خدا تھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور اُس برگزیدہ عالم کی محبت میں ایسے غرق تھے۔ کہ اپنی جان کی بھی پروا نہ تھی۔ اور خدا کے محبوب اور برگزیدہ بندے کو

جواب اس کا یہ ہے۔ کہ قرآن شریف سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو کسی ایسے امر میں دوسرے فرزندوں پر فضیلت دی ہو۔ جو ان کے اختیار اور قابو میں ہو۔ اور ان کی طرف سے وقوع میں آیا ہو۔ اس لئے کہ محبت جو کہ میلانِ طبعی کا نام ہے۔ وہ انسان کا اکتسابی اور اختیاری امر نہیں ہے۔ اور محض فعلِ الٰہی ہے۔ اسی سبب سے اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ ایک شخص کے بہت سی اولاد ہوتی ہے۔ مگر وہ ان میں سے ایک ہی سے محبت رکھتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ محبوب جمال اور کمال میں ان سب سے کمتر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے کلام مجید میں فرمایا ہے۔ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ (اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان مساوات اور عدل نہیں کر سکتے۔ خواہ تم کتنے ہی اس کے حریص اور خواہاں کیوں نہ ہو) یہاں میلانِ نفس اس آیت میں مراد ہے۔ خدا فرماتا ہے۔ کہ تم اس امر میں عورتوں کے درمیان عدالت کر ہی نہیں سکتے۔ اس

(بقیہ نوٹ) دوست رکھنا عبادت ہے۔ اور در اصل یہ محبت خدا کی محبت ہے۔ جو عین عبادت و اصل طاعت اور حقیقت ایمان ہے۔ چنانچہ جناب سرورِ کائنات حبیب خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ من احبّنی فقد احبّ اللّٰہ جس نے مجھ کو دوست رکھا اس نے خدا کو دوست رکھا۔ اس سے صاف ثابت ہے۔ کہ خدا کے محبوب کی دوستی و محبت در اصل خدا کی محبت ہے پس جناب یعقوبؑ کا خدا کے محبوب و برگزیدہ پیغمبر کو دوست رکھنا کیونکر قابل الزام ہو سکتا ہے۔ بہر حال جناب یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کو صرف اسی وجہ سے زیادہ دوست رکھتے تھے۔ کہ حضرت یوسفؑ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اور حسن سیرت اور حسن صورت دونوں سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ اور اُن کے دوسرے بھائی اُن کی طرح ان اوصاف سے متصف نہ تھے۔ اور نہ یہ ثابت ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ کے وہ بھائی جنہوں نے اُن کے ساتھ ایسا کیا سب پیغمبر تھے۔ اور کلام حمید مجید میں جو لفظ اسباط آیا ہے۔ اُس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ کہ حضرت یعقوبؑ کے سب بیٹے پیغمبر تھے۔ اگر لفظ بنین ہوتا۔ تب احتمال ہو سکتا تھا۔ اگرچہ بظاہر لفظ بنین سے بھی یہ ثابت کرنا مشکل ہے۔ کہ سب بیٹے نبی تھے۔ اب رہا یہ امر کہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے یوسفؑ کو زیادہ دوست رکھنے کی وجہ سے ضلالت سے کیوں منسوب کیا۔ پس اس کا جواب یہی ہے۔ کہ ضلال کے معنی صرف گمراہی نہیں ہیں۔

لئے کہ اس کے سوا ہر وا حسان۔ عطا و بخشش اور معاشرت و مصاحبت وغیرہ میں انسان عورتوں کے مابین عدالت اور مساوات کا قاعدہ جاری کر سکتا ہے۔ مگر میلان طبعی میں لاچار اور بے بس ہے۔ اور وہ اس کے اختیار سے باہر ہے +

اگر کوئی کہے۔ کہ گویا تم نے امر قبیح اور طلب فساد کو یعقوبؑ سے تو نفی کر دیا۔ اور دونو برائیوں کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ اس صورت میں اس مسئلے کا کیا جواب ہے؟

ہم کہینگے۔ کہ اس کے دو جواب ہیں۔ (اول) پہلا جواب یہ ہے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ علم الٰہی میں گزر چکا ہو۔ کہ عنقریب برادران یوسفؑ بہر حال آپس میں اس قسم کا حسد کرینگے۔ اور یہ امر قبیح ضرور ان سے سرزد ہو گا۔ گو یعقوبؑ یوسفؑ کو اور بیٹوں سے زیادہ دوست نہ بھی رکھیں۔ اور اس کو طلب فساد صرف اسی وقت کہ سکتے ہیں۔ کہ اس کے ہونے سے فساد کا ظہور ہو۔ اور اس کے معدوم ہونے سے فساد بھی معدوم ہے۔ اور ان کو مختار نہ بنایا گیا ہو +

(دوم) دوسرا جواب یہ ہے۔ کہ یہ زیادتی محبت برادران یوسفؑ کے لئے امتحان اور تکلیف شاق کا مقام تھا۔ اس لئے کہ اگر بصورت عدم زیادتی محبت برادران یوسفؑ اپنے بھائی سے حسد اور بغاوت نہ کرتے۔ اور اس پر مصر نہ ہوتے۔ تو وہ اس قدر ثواب کے مستحق نہ ہوتے۔ جس قدر کہ تفضیل اور تقدیم کی صورت میں حسد وغیرہ سے باز رہنے کے سبب وہ ثواب کے حقدار ہوتے۔ پس اللہ تعالےٰ نے چاہا۔ کہ وہ اس سخت اور مشکل صورت میں حسد وغیرہ سے باز رہیں + پس خدا کا ان کے باپ یعقوبؑ کی طبعیت کو محبت یوسفؑ کی طرف مائل کرنا طلب فساد نہ ہوا۔ اس لئے کہ اس سے اس تکلیف شاقہ کی صورت منتظم ہوتی ہے۔

(بقیہ نوٹ) چہ جائیکہ دین سے گمراہی مراد ہو۔ ضلال کے معنی عدول بھی ہیں۔ جیسا کہ سید علیہ الرحمہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ضلال کے معنی گم گردیدن و مغلوب شدن (گم ہو جانا۔ چھپ جانا اور مغلوب ہونا) ہیں۔ پس انا ابانا لفی ضلال مبین۔ (بے شک ہمارا باپ ضلال مبین میں ہے) کے یہ معنے ہوئے۔ کہ ہمارے باپ پر یوسفؑ کی محبت نے غلبہ کر لیا ہے۔ اور اوس کی محبت میں غرق ہو گیا ہے۔ ہر مقام پر لفظ ضلال یا ضلالت سے گمراہی مراد لینا خلاف و خلاف انصاف ہے۔ جبکہ لفظ مشترک ہے۔ اور بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جو اور وجوہات حضرتؑ کی زیادتی محبت کی ہو سکتی ہیں۔ اُن میں سے بعض کو سید علیہ الرحمہ نے ذکر فرما دیا ہے۔ طول کی ضرورت نہیں +

اور یہ بات بمنزلہ پیدائش ابلیس کے ہے۔ کہ خدا کو پہلے سے یہ علم تھا۔ کہ اس ملعون کی پیدائش کے سبب اتنے لوگ گمراہ ہونگے۔ اور اگر وہ اس کو پیدا نہ کرتا۔ تو وہ گمراہ نہ ہوتے۔ اور بمنزلہ زیادتی شہوت کے ہے۔ حالانکہ خدا کو یہ علم تھا۔ کہ اس کے سبب وہ شخص فعل قبیح کا مرتکب ہوگا۔ اور اگر وہ پیدا نہ کی جاتی۔ تو وہ قبائح کا مرتکب نہ ہوتا۔

اصل مسئلہ کا جواب (دوسری طرح پر) جائز ہے۔ کہ یعقوبؑ یوسف علیہ السلام پر سب بھائیوں سے زیادہ بخشش کرتے ہوں۔ اور سب سے زیادہ ان کو اپنے پاس رکھتے ہوں۔ اور تبرع و احسان سب سے زیادہ کرتے ہوں۔ اور آپ کا یہ طرز عمل قبیح نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ ممکن ہے۔ کہ یعقوب علیہ السلام کو اس بات کا علم نہ ہو۔ کہ اس محبت اور مہربانی کا یہ نتیجہ ہوگا۔ جو آخرالامر ظہور میں آیا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت یعقوبؑ نے جب برادران یوسفؑ کی خصلت اور ان کی راست روی اور ظاہری نیکی ملاحظہ فرمائی۔ تو ان کو ظن غالب ہوا ہو۔ کہ وہ یوسف علیہ السلام سے حسد نہ کرینگے۔ گو میں یوسفؑ کو ان پر فضیلت دوں۔ کیونکہ حسد اگرچہ انسانوں میں کثرت سے موجود ہوتا ہے۔ لیکن طبعی اور فطری نہیں ہوتا۔ کیونکہ اکثر لوگ اس سے بچتے اور پرہیز کرتے ہیں۔ اور ان کے احوال سے ایسے نشانات ظاہر ہوتے ہیں۔ کہ ان کی نسبت گمان غالب ہو جاتا ہے۔ کہ یہ اس مرض کے پھندے سے نجات پا چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ اور والد کا اپنے بعض بچوں کو نیکی اور احسان میں بعض بچوں پر ترجیح دینا **محاباۃ** نہیں کہلاتا۔ اس لئے کہ محاباۃ باب مفاعلہ ہے۔ اور ثلاثی مجرد حبا ہے۔ اور اس کے معنی ہیں۔ اِنْ تَحْبُهٗ حَبَوْتُ (اگر تو کسی پر بخشش کریگا۔ تو وہ تجھ پر کریگا)۔ اور یہ (محاباۃ) اس **تفضیل بالبر** کے معنی سے خارج ہے۔ جس سے ہمارا مذکورہ بالا بیان مقصود نہیں۔

اور برادران یوسف کا اپنے باپ کے حق میں یہ کہنا کہ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ہمارا باپ ظاہر گمراہی میں ہے۔ اس قول سے ان کی یہ مراد نہیں ہے۔ کہ وہ دین خدا میں گمراہ ہے۔ بلکہ ان کا مقصد فقط یہ ہے۔ کہ ہمارا باپ ہم بھائیوں پر عطا و بخشش کرنے میں مساوات کرنے سے نکل گئے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے سمجھا تھا۔ کہ مساوات بخشش ہمارے حق میں بہتر اور ہماری تدابیر امور میں الیق اور اولےٰ ہے۔ اور ضلال کے معنی عدول (پھر جانا) ہے۔ اور جو شخص کسی چیز سے عدول کر گیا۔ اور اس سے پھر گیا۔ وہ بے راہ

ہو گیا یعنی ضلال میں مبتلا ہو گیا۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے اس لفظ سے ضلال عن الدین یعنی دین سے گمراہ مراد لی ہو۔ اس لئے کہ اس صورت میں انہوں نے اپنے اعتقاد دلی کا اظہار کیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ انہوں نے صواب کو خطا مان لیا ہو +

اگر کوئی یہ کہے۔ کہ برادران یوسفؑ سے ایسی خطائے عظیم اور فعل قبیح کیونکر وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت پیغمبر تھے۔ اور اگر تم یہ کہو۔ کہ وہ اس وقت پیغمبر نہ تھے بلکہ بعد ازاں پیغمبر ہوئے۔ **تو ہم یہ کہینگے** کہ تم کو اس قول سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ تمہارا مذہب یہ ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے اور اس کے بعد کبھی قبائح کے مرتکب نہیں ہوتے +

ہم اس کا جواب یہ دینگے۔ کہ اس امر پر کوئی دلیل قایم نہیں ہوئی۔ کہ برادران یوسفؑ جنہوں نے یوسفؑ کے ساتھ ایسے ایسے سلوک کئے کسی وقت میں بھی پیغمبر تھے۔ جب کہ دلیل سے یہ ثابت نہیں ہے۔ تو ان بھائیوں سے ایسا فعل قبیح وقوع میں آنا جائز ہے۔ جو ہر مکلف سے وقوع میں آ سکتا ہے۔ جس کی عصمت پر کوئی دلیل قایم نہیں ہوئی + اور کوئی شخص یہ سوال نہیں کر سکتا۔ کہ تم ان کی نبوت کا کیونکر انکار کرتے ہو۔ حالانکہ ظاہر ہے۔ کہ اسباط بنی یعقوب انبیاء تھے۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ اسباط جو کہ پیغمبر تھے۔ وہ ان بھائیوں کے سوا جنہوں نے یوسفؑ کے ساتھ وہ سلوک کئے جن کا ذکر خدا نے قرآن میں کیا ہے۔ اور ہوں۔ اور ظاہر قرآن سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ کہ یوسفؑ کے تمام بھائیوں اور تمام اسباط یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ وہ کید و مکر کیا جس کا ذکر خدا نے قرآن میں کیا ہے + اور بعض یہ بھی کہتے ہیں[1] کہ یہ برادران یوسف اُس وقت تک بالغ نہ ہوئے تھے۔ اور تکلیف شرعی ان پر واجب نہ ہوئی تھی۔ اور بلوغ کے قریب بعض لڑکوں سے ایسے افعال سرزد ہو جایا کرتے ہیں۔ اور کچھ عقاب اور ملامت کے سزاوار ہو جاتے ہیں + اگر یہ قول صحیح ثابت ہو جائے۔

---

[1] یہ وجہ وجیہ نہیں۔ اور اگر ان کا پیغمبر ہونا ثابت ہو جائے۔ تو نابالغی کی حالت میں بھی ایسا فعل اُن سے سرزد ہونا جس سے کچھ عقاب و ملامت کے مستحق ہوں۔ ہرگز درست نہیں۔ اور انبیاءؑ کے ابتدائے عمر سے معصوم ہونے کے خلاف ہے۔ جو بدلائل عقلیہ و نقلیہ ثابت ہے۔ فالنبی نبی ولو کان صبیاً۔ فافہم +

تو ان کے آئندہ پیغمبر ماننے کی حالت میں بھی اعتراض ساقط ہو جائیگا۔

مسئلہ ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ جب یعقوبؑ کو یہ خوف تھا۔ کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں سے ضرر پہنچیگا۔ اور وہ فرماتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے وَاَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُوْنَ (اور میں ڈرتا ہوں۔ کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے۔ درآنحالیکہ تم غافل ہو) ۔ تو اس حالت میں یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے ساتھ کیوں بھیجا۔ اس صورت میں حضرت یعقوبؑ کا یہ فعل محض تغریر اور مخاطرہ (ہلاکت اور خطرہ میں ڈالنا) ہے۔

جواب ۔ اس سے کہا جائیگا۔ کہ ممکن ہے۔ کہ یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کی قسمیں کھانا اور عہد کرنا اور اپنے بھائی کی حفاظت اور رعایت میں جد وجہد کرنا دیکھا۔ تو آپ کو یوسفؑ کی سلامتی کا گمان ہو گیا ہو۔ اور نجات کی قوی امید ہو گئی ہو۔ اور نجات کی قوی امید ہو گئی ہو۔ گو اس سے پہلے ان کی طرف سے خائف تھے۔ اور نہ سلامت رہنے کا گمان غالب تھا۔ پس اس وقت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے ساتھ بھیجنا دل میں ٹھان لیا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ ان میں باہم وحشت اور عداوت پڑ جائے۔ اس لئے کہ اگر میں باوجود طلب کرنے اور اس کام میں حریص ہونے کے یوسفؑ کو انکے ہمراہ نہ بھیجونگا۔ تو وہ جانینگے۔ کہ وہ اس پہلی تہمت اور اس خوف کے سبب جو اس کو اور یوسفؑ کو ہماری طرف سے ہے۔ اس کو ہمارے ہمراہ نہیں بھیجتے۔ اور سلامتی اور نجات کا ظن اور بھی اس مدعا میں ساعی ہو گیا۔ اس لئے یوسفؑ کو ان کے ہمراہ بھیج دیا۔

مسئلہ ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ فرزندان یعقوبؑ نے جو اپنے باپ سے کہا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔ وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ کُنَّا صَادِقِیْنَ (اور تو ہمارا اعتبار نہیں کرتا۔ اگرچہ ہم سچے ہوں) اس کے کیا معنی ہیں؟ اور کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے باپ کی نسبت کہا۔ کہ وہ سچے شخص کی بات کو قبول نہیں کرتا۔ اور اس کو جھٹلاتا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے۔ کہ برادران یوسفؑ جانتے تھے۔ کہ ہمارا باپ ہم کو اپنا رشتہ سے حسد متہم کرتا ہے۔ اور ہمارے بھائی کے بارے میں ہماری طرف سے سخت خائف ہے۔ اس لئے کہ اکثر ان سے حسد اور منافست کے آثار ظاہر ہوچکے تھے۔ پس انکو یقین ہو گیا تھا۔ کہ ہم نے جو اس کو خبر دی ہے۔ کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ [illegible] ہمکو جھٹلائیگا۔ **الغرض** انہوں نے باپ سے کہا۔ کہ تو ہم کو اس خبر میں سچا نہیں

جانتا۔ اس لئے کہ تمہارے دل میں ہماری طرف سے پہلے ہی سے کھٹکا ہے۔ گو ہم بیچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں۔ اور مکّار اور پُرفن آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے جب وہ چاہتا ہے کہ سننے والا اس کی خبر کو سچ جان لے۔ اس لئے کہ قتل دنیا کی سخت ترین مصائب سے ہے پس قاتل کہا کرتا ہے۔ کہ مجھے معلوم ہے۔ کہ تو فلاں امر میں میری تصدیق نہ کریگا۔ اگرچہ میں سچا ہی ہوں۔ اور یہ بات نہایت روشن اور اظہر من الشمس ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا سبب ہے۔ کہ حضرت یعقوبؑ نے حزن وملال اور اپنی جان کی ہلاکت اور ترکِ صبر وسکون میں اس قدر زیادتی کی۔ کہ گریہ وبکا اور حزن واندوہ[1]

---

[1] رنج والم خوشی ومسرت انسان کے طبعی افعال ہیں جن سے کوئی انسان خالی نہیں جب قلب انسانی پر صدمہ پہنچتا ہے۔ تو اُس سے بخارات اُٹھتے ہیں۔ اور دماغ کی طرف چڑھتے ہیں۔ اور حرکت دل حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ فوری الم کے احساس سے سخت اختلاج قلب پیدا ہو کر انسان مرگ مفاجات کا شکار ہو جاتا ہے۔ حکیم مطلق کی حکمت کاملہ سے وہ بخارات دماغ سے اُتر کر آنکھوں کے راستے آنسو ہو کر نکلتے ہیں۔ اور ان کے خارج ہونے سے نفس کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور طبعیت ہلکی پڑ جاتی اور حرارت قلب کم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ حرارت اس طرح آنسوؤں کی راہ سے خارج نہ ہو۔ تو انسان کی جان کا خوف ہے۔ چنانچہ بعض وقت دیکھا گیا ہے۔ جو لوگ کسی بڑے حادثے کے وقوع پر بہت ضبط کرتے ہیں۔ اور بالکل نہیں روتے۔ وہ اُس صدمے سے تھوڑے ہی عرصے میں مر جاتے ہیں۔ بہرحال رونا ایک طبعی امر ہے۔ اور اس میں خدا کی بڑی حکمت ومصلحت ہے۔ اور یہ خلاف صبر نہیں ہے۔ اور نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔ کیونکہ خدا خلاف طبیعت وفطرت کوئی حکم نہیں دیتا۔ اگر یہ تکلیف دی جائے۔ تو بلاشک تکلیف مالایطاق ہو گی۔ ولم یکلف اللہ نفسًا الا وسعہا۔ اگر یہ تکلیف دی جائے کہ انسان مصیبت کے وقت میں گریہ وبکا نہ کرے۔ تو اُس کی مثال بعینہ ایسی ہے۔ کہ جس طرح انسان کو سننے کی قوت بالفطرۃ عطا کی ہے۔ اور اُس کو حکم دیا جائے۔ کہ دیکھو کوئی آواز نہ سننا۔ اور یہ بلاشبہ ظلم صریح اور قبیح ہے۔ اور حکیم عادل کی شان اس سے کہیں ارفع واعلےٰ ہے۔ الغرض مصیبت کے وقت رونا عقلاً وشرعًا کسی طرح بھی خلاف صبر نہیں۔ بلکہ بعض اوقات عبادت میں داخل ہے۔ اور خداوند کریم رونے والوں کی تعریف وتمجید فرماتا ہے۔ اور یہ خاص انبیاء کی صفات میں داخل ہے۔ اور مصیبت کے وقت نہ رونا اور مظلوم کے ظلم سے

کے سبب آپ کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ اور شان انبیاء یہ ہے کہ مصائب اور شدائد کو نہایت صبر و تحمل۔ دلاوری اور ہمت سے برداشت کریں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو ان کے مراتب اور مدارج کبھی بلند اور برتر نہ ہوتے ۔

(بقیہ نوٹ) متاثر نہ ہونا اور کسی مومن کے مرنے سے متالم نہ ہونا قساوت قلب کہلاتا ہے۔ جو نہایت مذموم ہے۔ اور انسانیت سے دو درجے نیچے جمادیت کا درجہ ہے۔ اذا تتلیٰ علیہم آیات الرحمٰن خروا سجداً و بکیا جب اُن پر آیات الٰہی تلاوت کی جاتی ہیں۔ تو روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ ان الذین اوتوا العلم من قبلہ اذا یتلیٰ علیہم یخرون للاذقان سجداً ویقولون سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا ویخرون للاذقان یبکون ویزیدہم خشوعاً اس سے صاف ظاہر ہے کہ رونا نہ خلاف تہذیب ہے اور نہ خلاف صبر۔ بلکہ عین عبادت اور اصل عبودیت ہے۔ اور انبیاء و اولیاء و اولوا العلم کی صفات خاصہ سے ہے۔ اور دیکھو سورۂ توبہ میں اصحاب رسولؐ کی حالت کو خدا یوں فرماتا ہے۔ ولا علی الذین اذا ما اتوک لتحملہم قلت لا اجد ما احملکم علیہ تولوا و اعینہم تفیض من الدمع حزناً الا یجدوا ما ینفقون۔ (خدا فرماتا ہے اے پیغمبر) اُن لوگوں پر کوئی حرج نہیں۔ جو تیرے پاس آئے۔ کہ تو ان کو جہاد میں ساتھ لے جائے۔ اور تُو نے کہا کہ میرے پاس زاد و راحلہ نہیں۔ تو وہ لوٹ گئے۔ اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس صدمے سے کہ اُن کے پاس راہ خدا میں خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ وہ اپنی غربت و افلاس پر روتے تھے۔ دیکھو اصحاب رسولؐ کا اپنی ناداری پر رونا کیسا ممدوح ہے۔ کہ خدا اُن کی ثنا کرتا ہے۔ ایضاً سورۂ مائدہ۔ و اذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینہم تفیض من الدمع۔ جب وہ سنتے ہیں اُس کو جو رسول کی طرف نازل کی گئی ہے (قرآن) تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ رونے کو کبھی خلاف عقل۔ خلاف تہذیب اور خلاف شرع نہیں کہہ سکتا۔ رونا عین عبادت ہے۔ اور بعض اوقات عین صبر۔

صبر اصلاً کف النفس عما لا ینبغی ہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کو ایسی چیز کے اظہار سے روکے اور باز رکھے۔ جو اُس کے مناسب نہیں ہے۔ نہ کہ افعال فطری و طبعی سے روکنا صبر کہلاتا ہے۔ اور اُس کی صورت یہ ہے۔ کہ جب انسان پر کوئی مصیبت نازل ہو۔ اور رنج و الم لاحق ہو۔ تو بندوں سے اُس کی شکایت نہ کرے۔ کہ دیکھو۔ خدا نے میرے ساتھ ایسا کیا۔ یا خدا ہی سے یوں کہے۔ کہ تُو نے کیوں مجھ پر یہ مصیبت نازل کی۔ کس واسطے نازل کی۔ تُو نے مجھ پر ظلم کیا۔ تُو نے مجھ پر غضب کیا۔ یعنی جزع و فزع کرے۔ اور قضائے الٰہی پر نارضامندی ظاہر کرے۔ یہ بے صبری ہے۔ اور یہ ممنوع ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹے یوسف کے باب میں ایسا سخت امتحان ہوا کہ آج تک کسی پیغمبر کو ایسی ابتلا اور امتحان کا سامنا نہ ہوا تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یوسفؑ سا فرزند عطا فرمایا۔ جو حسن و جمال اور کمال علمی اور فضل و ادب اور عفت میں سب

(بقیہ نوٹ) اور نہایت قبیح ہے۔ اور اگر انسان رو رو کر اپنے غم کو اپنے خدا ہی سے عرض کرے۔ اور کہے خداوندا تو مالک ہے۔ جو چاہے کر۔ جو کرتا ہے۔ بہتر کرتا ہے۔ ہم تیرے گنہگار بندے ہیں۔ تو ہی ہماری اس تکلیف کو رفع کر۔ تو یہ عین صبر ہے۔ اور اصل عبادت و عبودیت ہے۔ اور شان انبیا ہے۔ اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ چونکہ رونا خلاف صبر نہیں ہے۔ اس وجہ سے حضرت یعقوبؑ اپنے نورِ نظر کی جدائی میں روتے تھے۔ اور پھر اس کو صبر جمیل سے تعبیر فرماتے تھے۔ جیسا کہ خداوند عالم حکایتہً فرماتا ہے۔ قال بل سوّلت لکم انفسکم فصبر جمیل۔ ای فصبر جمیل اجمل بی یعنی جس وقت اُن کے بیٹوں نے آن کر خبر دی کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ پس صبر جمیل میرے واسطے بہتر و مناسب ہے۔ اور پھر جب حضرت کے بیٹے مصر سے واپس آئے ہیں۔ اور یوسفؑ کے بھائی کے وہاں رہ جانے کی خبر سنائی ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ قال بل سوّلت لکم انفسکم امراً فصبر جمیل عسی اللہ ان یاتینی بہم جمیعاً انہ ھو العلیم الحکیم۔ کہا تمہارے نفسوں نے یہ ایک بات بنائی ہوئی ہے۔ پس میرا صبر صبر جمیل ہے۔ پس میرا صبر صبر جمیل ہے۔ قریب ہے۔ کہ خدا ان دونوں کو میرے پاس لائے۔ اور بیشک وہ علیم و حکیم ہے۔ وتولّی عنہم وقال یا اسفیٰ علی یوسف وابیضّت عیناہ من الحزن فھو کظیم۔ آپ نے اُن سے پشت پھیر لی۔ اور فرمایا ہائے افسوس یوسفؑ پر۔ اور غم۔ سے آپکی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ اور آپ غمگین اور غصّے کو ضبط کرتے تھے۔ یعنی بے صبری ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ جب آپ کی یہ حالت ہو گئی۔ تو برادران یوسف نے حضرتؑ پر وہی اعتراض کیا۔ جو اس معترض نے کیا ہے۔ قالوا تاللہ تفتؤ تذکر یوسف حتّیٰ تکون حرضاً او تکون من الھالکین۔ اُنہوں نے کہا۔ خدا کی قسم تم یوسفؑ کو یاد کئے جاؤ گے۔ یہاں تک کہ تم سخت بیمار ہو جاؤ گے یا ہلاک ہو جاؤ گے۔ یعنی تم کیوں یوسفؑ کو اس قدر یاد کرتے ہو۔ اور اُس کے فراق میں روتے ہو کہ قریب مرگ ہو گئے ہو۔ قال انّما اشکوا بثّی وحزنی الی اللہ واعلم من اللہ ما لا تعلمون۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا فعل یعنی رونا و یوسف کو یاد کرنا مذموم و قبیح نہیں ہے۔ اور نہ خلاف صبر ہے) میں اپنی پریشانی و غم کو خدا سے بیان کرتا ہوں (اور وقت مصیبت خدا کو یاد کرنا اور اُس سے اپنی مصیبت کو ذکر کرنا

پر فوقیت رکھتے تھے۔ پھر اُن پر نہایت عجیب اور طرفہ تر مصیبت پڑی۔ کیونکہ وہ حضرت یعقوبؑ کے سامنے ایسے مرض میں مبتلا نہ ہوئے۔ جو باعثِ ہلاکت ہوتا۔ کہ اول اس کی بیمارداری کچھ تسلی دیتی۔ پھر موت اس کی طرف سے مایوس کر دیتی۔ بلکہ وہ تو ایسے گم ہو گئے۔ کہ نہ تو کچھ

(بقیہ نوٹ) خلاف صبر نہیں)۔ اور میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں۔ جو تم نہیں جانتے۔ میں پیغمبر خدا ہوں مجھ کو وہ علم الہامی من جانب اللہ حاصل ہے۔ جو تمکو نہیں۔ پس اگر میرا یہ رونا اور یوسفؑ کو اس طرح یاد کرنا مذموم و قبیح و خلاف صبر و خلاف شریعت ہوتا۔ تو میں ہرگز ایسا نہ کرتا۔ اس کو میں بہتر جانتا ہوں یا تم۔ لہذا تم مجھ کو اس باب میں ملامت نہ کرو۔ بہر حال حضرت یعقوبؑ نے برادران یوسفؑ کو اس اعتراض کا وہی جواب دیا۔ جو ہم نے عرض کیا۔ کہ رونا اور اپنی مصیبت کو اپنے مالک و خالق سے بیان کرنا خلاف صبر نہیں۔ بلکہ عین صبر ہے۔ اور خلاف صبر ایسی بات کہنا اور ایسے فعل کا مرتکب ہونا ہے۔ جس سے اُس کے فعل پر ناراضگی ظاہر ہو۔ اور اُس کے سخط و غضب کا باعث ۔

یہ امر تو بخوبی واضح ہو گیا۔ کہ رونا خلاف صبر نہیں۔ البتہ ایک امر باقی رہا۔ وہ یہ کہ مبکی علیہ کیا ہونا چاہئے۔ اور کس چیز پر رونا چاہئے۔ پس اس باب میں کلیہ قاعدہ تو یہی ہے۔ کہ جس انسان سے اُس کی مرغوب و مطلوب شئے فوت ہوتی ہے۔ تو اُس پر روتا ہے۔ یا شئے مطلوب و مرغوب کی طلب و اُس کی تاخیر حصول میں روتا ہے۔ اور مطلوب و محبوب ہر ایک کا جدا جدا ہوتا ہے۔ ایک عابد اپنی عبادت کو محبوب رکھتا ہے۔ اگر وہ فوت ہو جائے۔ یا کمی واقع ہو جائے۔ تو اُس پر گریہ و بکا کرتا ہے۔ جیسا کہ بعض خاصان خدا کے حالات سے معلوم ہوتا ہے۔ نیکوکار اپنی نیکی کو مرغوب رکھتا ہے۔ اور ہر وقت اُس کی تحصیل میں ساعی رہتا ہے۔ اور اگر وہ کسی وقت اُسکو بجا نہیں لا سکتا۔ تو اُس پر گریہ و زاری کرتا ہے۔ جیسا کہ اصحاب رسولؐ کا حال مذکورۃ الصدر میں گزرا۔ بعض اولیاء اللہ لقاء خداوند عالم کے اشتیاق میں ایسے روئے ہیں۔ کہ بصارت جاتی رہی۔ خاصان خدا ہمیشہ اپنی عبادت کی کمی اور اور اُس کے لائق شان معبود نہ ہونے کی وجہ سے رو یا کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو خوف خدا سے روتے ہیں۔ درحقیقت اپنی تقصیر و تفریط پر روتے ہیں۔ کہ ہم نے کچھ زادراہ اپنے سفر کے لئے طیار نہیں کیا۔ اور ہمارے اعمال آخرت میں ہمارے لئے وبال ہونگے۔ اور ہم اپنے پروردگار کے سامنے کس منہ سے جائینگے۔ اور احکم الحاکمین کو کیا جواب دینگے۔ اور کیونکر ہم اُس عذاب و عقاب کے متحمل ہونگے۔ جو ہمارے اعمال کی صورت حقیقیہ میں اُس کی طرف سے پہنچیگا۔ اور جس طرح ایک متدین۔ مثالہٗ۔

ہلاکت کا یقین ہوا۔ کہ مایوس ہو جاتے۔ اور نہ ان کی زندگی اور سلامتی کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ کہ پھر ملنے کی امید اور آرزو رکھتے۔ بلکہ حضرت یعقوبؑ عجب تردد و تفکر میں مبتلا تھے۔ کہ نہ مایوس ہو سکتے تھے۔ نہ امید و آرزو رکھنے کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ اور یہ مصیبت انسان کے لئے نہایت سخت اور اس کے دل کو نہایت جلانے والی ہے۔ اور کبھی انسان پر ایسا غم وارد ہوتا ہے۔ کہ اس کا رد کرنا اس کی طاقت سے باہر اور اس کا دفعیہ اس کی قوت سے خارج ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی شخص کو محض حزن و بکا سے منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ طمانچہ مارنے اور نوحہ کرنے اور ایسے الفاظ زبان پر لانے سے منع کیا گیا ہے۔ جو غضب باری تعالےٰ کا باعث ہوں +

(بقیہ نوٹ) عارف حصول معارف تحصیل عبادات۔ اور کسب اعمال باقیات الصالحات کو محبوب و مرغوب رکھتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ اُس شخص کو دوست رکھتا ہے۔ جو حصول معارف کا ذریعہ اور ایصال الی الحق کا وسیلہ اور عابد و معبود کے درمیان واسطہ ہو۔ اور دراصل اسی کی محبت و دوستی سب سے زیادہ مفید ہے۔ اور در حقیقت یہی مثمر حقیقی ہے۔ اور یہی وسیلہ نجات۔ اور اسی کی اقتداء دراصل نجات دلانے والی اور محبوبیت خداوند عالم کا موجب ہے۔ کما قال عز من قائلہ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ لہذا ایک عارف باللہ متدین و متاثر مومن کے واسطے ایسے شخص کی جدائی نہایت ہی شاق گذرتی ہے۔ اور کوئی صدمہ اس سے زیادہ مولم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایسے شخص کے اُٹھ جانے پر زمین و آسمان بھی روتے ہیں۔ اور عالم زندگی میں اُس سے جدا رہنا اور اُس کے دیدار سے مشرف نہ ہونا اور اُس کے فیض سے محروم رہنا سب سے زیادہ غم و ملال کا باعث ہوتا ہے +

بیٹے بھائی عزیزوں کی جدائی کا صدمہ ایک طبعی امر ہے۔ اولاد انسان کا ایک جزو ہوتی ہے۔ بلکہ انسان کا اعلےٰ جزو کا جزو۔ فلذۃ الکبد لخت جگر ہوتی ہے۔ اور جب اولاد صالح و نیک فرمانبردار ہو۔ اور حسن سیرت و حسن صورت سے بھی آراستہ ہو۔ اور جب بیٹا محبوب خدا اور برگزیدہ پیغمبر ہو۔ تو اُسکی جدائی کے رنج و الم کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ حضرت یعقوبؑ میں یہ ساری باتیں جمع ہیں لہذا ان کے رنج و الم کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے جس پر یہ مصیبت نازل ہو وہی جان سکتا ہے۔ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ جو امور کسی شے سے محبت کرنیکے باعث ہو سکتے ہیں۔ وہ بہ من حیث المجموع حضرت یوسفؑ میں جمع تھے۔ اور حضرت یعقوب علی نبینا و علیہ السلام کا اُنکی جدائی میں بے چین و بے قرار رہنا بالکل بجا و درست ہے۔ اور حضرتؑ ہرگز مستحق ملامت نہیں ہو سکتے +

Presented by Ziaraat.Com

اور منقول ہے۔ کہ ہمارے پیغمبر صلعم اپنے فرزند دلبند کی وفات پر روئے۔ اور فرمایا العین تدمعُ والقلبُ یخشعُ ولا نقولُ بما یسخط الرب (آنکھ روتی ہے۔ دل بیقرار ہوتا ہے۔ اور ہم وہ کلمہ نہیں کہتے ہیں۔ جو پروردگار کو غضب میں لائے)۔ حالانکہ وہ جناب ختمی مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام آداب اور فضائل میں سرخیل و پیشوائے انبیاءؑ تھے۔ اس پر بھی یعقوب علیہ السلام نے بہت ہی کم حزن و ملال کا اظہار کیا۔ اور جو غم و ہم اس جناب کے دل حزین و ملول میں پوشیدہ تھا۔ اور اس پر صبر و تحمل فرماتے تھے۔ اس کی مقدار اس رنج و غم سے بہت ہی زیادہ تھی۔ جس کو آپ نے ظاہر فرمایا۔

نیز یہ بھی معلوم رکھنا چاہئے۔ کہ مصائب میں صبر و تحمل کرنا اور غیظ اور حزن و ملال کا فرو کر لینا واجب اور لازم نہیں۔ بلکہ مستحب ہے۔ اور بعض مقامات پر انبیاء علیہم السلام مندوبات شاقہ (سخت تکالیف دینے سنتی امور) کے تارک ہو گئے۔ اگرچہ بہت کچھ ان پر عامل بھی ہوئے۔ مگر بعض موقع پر تکالیف شاقہ کے متحمل نہ ہو کر ترک کر بیٹھے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ یعقوب علیہ السلام کو اطمینان نہ ہوا۔ اور ان کے حزن و ملال میں کچھ تخفیف نہ ہوئی۔ حالانکہ ان کے بیٹے یوسف علیہ السلام کا خواب آپ کو متحقق ہو چکا تھا۔ اور یہ ثابت ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب ہمیشہ سچے ہی ہوتے ہیں۔

جواب۔ اس سے کہا جائیگا۔ کہ اس سوال کے **دو** جواب ہیں۔

اول یہ کہ یوسف[۱] علیہ السلام نے جب وہ خواب دیکھا۔ تو وہ نابالغ لڑکے تھے۔ اور ابھی نبی نہ ہوئے تھے۔ اور ان پر وحی نازل نہ ہوئی تھی۔ اس حالت میں اس خواب کی صداقت

---

[۱] ظواہر احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت اُس وقت بالغ نہ تھے۔ یعنی مثل ہمارے۔ لیکن یہ ثابت نہیں۔ کہ اُس وقت نبی بھی نہ تھے۔ اور جب تحقیق علماء محققین یہ ہے۔ کہ ہر ایک نبی ابتداہی سے نبی ہوتا ہے۔ تو پھر حضرت یوسفؑ کا اُس وقت نبی نہ ہونا کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر نبی کو ابتداہی سے نبی نہ مانا جائے۔ تو قبل نبوت تحقق عصمت بھی دشوار ہے۔ کیونکہ عند المحققین عصمت اثر روح قدس نبوی ہے۔ اور فی الحقیقت مستعصم وہی ہے۔ اور تحقیق یہ ہے۔ کہ اُس وقت مبعوث نہ ہوئے تھے۔ اور اظہار نبوت و تبلیغ پر مامور نہ تھے۔ نبی اپنی نبوت کو اُس وقت تک اظہار نہیں فرماتا جب تک اُس کا وقت نہ آجائے۔ اور مصلحت خدا پوری نہ ہو۔

اور صحت کی کوئی قطعی اور یقینی وجہ نہیں ہو سکتی ٭

دوم یہ ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ اس باب میں یہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ یعقوب علیہ السّلام کو یقین تھا۔ کہ یوسف علیہ السّلام زندہ ہیں۔ اور یہ بھی جانتے تھے۔ کہ آخر کار یوسف علیہ السّلام کا خواب سچ ہو کر رہیگا۔ مگر یہ بات ایسی نہیں ہے۔ جو ضرور ہی حضرت یعقوب علیہ السّلام کے حزن و ملال اور جزع و فزع کے عدم کا باعث ہوتی۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں۔ کہ بہت دیر تک جدائی کا ہونا

(بقیہ نوٹ) اور حکم اظہار نہ پہنچے۔ اسوقت تک وہ اپنے نفس پر نبی ہوتا ہے۔ دوسروں پر حجت نہیں۔ اور اظہار نبوت خدا کی مصلحت پر موقوف ہے۔ اسی بنا پر حضرت یوسف ؑ نے اظہار نبوت نہیں کیا۔ غلامی و قیدخانے کی تکالیف برداشت کی۔ اور یہ امر کسی طرح قبیح نہیں ہے۔ سید علیہ الرحمہ کا سوئے خطاب ایک مخالف مذہب کی طرف ہے۔ اور اصل غرض اُسکو سمجھانا و ساکت کرنا ہے۔ فتامل واللہ عالم بالصواب ٭

باقی رہا حضرت یعقوبؑ کو خواب حضرت یوسفؑ کا متحقق ہونا۔ آیات سے صاف ثابت ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ حضرت یوسفؑ کو منع کیا۔ یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ بیان کرنا۔ ورنہ وہ حسد کرینگے۔ اور تمہارے ساتھ کوئی مکر کرینگے۔ کیونکہ ایک خواب اس سے پہلے بھی حضرت یوسف ؑ نے دیکھا تھا (جیسا کہ تفاسیر میں مذکور ہے) اور اس خواب کو اپنے بھائیوں سے بھی بیان کر دیا تھا۔ جس کی تفسیر خود برادران یوسف ؑ نے یہ کی تھی۔ کہ یوسفؑ کا یہ خواب اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ وہ ایک روز تمام لوگوں کا پیشوا ہوگا۔ اور اُس کا درجہ بلند ہوگا۔ اور ہم سب اُس کے محکوم ہونگے۔ اسی بنا پر وہ حسد کرنے لگے تھے۔ لہذا حضرت یعقوبؑ نے یہ دوسرا خواب بیان کرنے سے یوسفؑ کو منع کیا تھا۔ اور فرمایا یابنیّ لا تقصص رؤیاک علی اخوتک فیکیدوا لک کیدا ان الشیطان للانسان عدو مبین۔ اگر آپ کو یوسفؑ کی خواب کا یقین نہ ہوتا۔ تو ایسا نہ فرماتے۔ اور پھر آپ نے فرمایا وکذالک یجتبیک ربک الخ۔ اور اسی طرح برگزیدہ کریگا تجھکو تیرا پروردگار الآیہ۔ یعنی جس طرح تجھ کو اب اُس نے خلعت نبوت سے سرفراز کیا ہے۔ جس پر یہ خواب دال ہے۔ اسی طرح خدا تجھکو برگزیدہ کریگا۔ اور تیرے مراتب بڑھائیگا۔ اور تجھ کو نبوت پر مبعوث کریگا۔ اور بادشاہ بنائیگا۔ فان الرؤیا الصادقۃ جزء من ستۃ واربعین اجزاء النبوۃ۔ وفی بعض الاحادیث الرؤیا الصادقۃ جزء من سبعین اجزاء النبوۃ۔ سچا خواب نبوت کے چھیالیس جزؤں میں سے ایک جز ہے۔ یا سچا خواب نبوت کے ستر جزؤں میں سے ایک جز ہے۔ بہر حال حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کے خواب کا ضرور علم تھا۔ اور اُس کی تعبیر سے واقف تھے۔ اور اسی وجہ سے بیان کرنے سے روکا تھا۔ لہذا

اور لگاتار آنکھوں سے نورِ نظر کا غائب رہنا حزن و ملال کا باعث ہے۔ حالانکہ قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ جدا ہو جانے والا زندہ موجود ہے۔ اور ممکن ہے۔ کہ آخر کار وہ پھر آملے۔ اور اکثر انبیاء علیہم السلام اور وہ مومنین مطہرین جو ان کے قائم مقام ہیں۔ اپنی اولاد اور احباب کی مفارقت میں مضطرب اور گریاں ہوئے ہیں۔ اور جزع فزع کی ہے۔ حالانکہ ان کو یقین اور اعتماد تھا۔ کہ آخرت میں ان سے ملاقات ہو جائیگی۔ اور جنت میں ساتھ مل کر رہنا ہوگا۔ اور اس کا سبب بھی وہی طول مفارقت ہے۔ جو ہم نے اوپر بیان کیا ۔

در بیان تنزیہ حضرت یوسف علیہ السلام

مسئلہ :۔ اگر کوئی کہے۔ کہ یوسف علیہ السلام نے غلامی کے زمانے میں کیوں صبر کیا۔ اور کس لئے غلام ہونے سے انکار نہ کر دیا۔ تاکہ بند غلامی سے آزاد ہو جاتے۔ اور نبیؑ کے لئے کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ وہ غلام بنائے جانے پر صبر کر سکے ۔

جواب :۔ اس سے کہا جائیگا۔ کہ یوسف علیہ السلام بنا بر اکثر اقوال کے اس وقت نبی نہ تھے۔ اور جب کہ آپ کو اپنے قتل کا خوف تھا۔ تو غلام بنانے پر صبر کرنا جائز ہوا۔ اور جو لوگ اس جواب کے قائل ہیں۔ وہ قول تعالٰے وَاَوْحَیْنَا اِلَیْہِ لَتُنَبِّئَنَّھُمْ بِاَمْرِھِمْ ھٰذَا وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (اور ہم نے اس کی طرف وحی بھیجی۔ کہ ہم ان کو ضرور ان کے اس کام کی خبر دینگے حالانکہ وہ آگاہ نہیں ہیں۔) کی یہ تاویل کرتے ہیں۔ کہ یہ وحی اُس وقت میں نہیں نازل ہوئی تھی۔ بلکہ آئندہ کسی اور وقت میں نازل ہوئی تھی۔ جس کی نسبت سب کا اجماع ہے۔ کہ اُس وقت آپ پیغمبر تھے ۔

اور ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالٰے نے آزمائے امتحان اور سخت کرنے تکالیف کے حضرت یوسف علیہ السلام کو امر فرمایا ہو۔ کہ اپنے معاملے کو پوشیدہ رکھے۔ اور مشقت غلامی پر صبر کرے۔ اور یہ حکم بغرض امتحان اور تشدید تکالیف کے ہو۔ جیسا کہ ان کے جد ابراہیمؑ اور اسحاقؑ[1] کا امتحان لیا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کو تو نمرود مردود کی تکالیف میں گرفتار کیا۔ اور اسحاقؑ علیہ السلام کو ذبح کی تکلیف دی گئی ۔

(بقیہ نوٹ) علمہ لما علمنا ولکنّ اکثر الناس لا یعلمون۔ اور آپ کے رونے اور بے چینی کی وجوہ ایسی ہی ہیں۔ جو سید علیہ الرحمہ نے اسی جواب میں بیان کی ہیں۔ اور وہ امور طبعی ہیں ۔

[1] تحقیق علماء یہ ہے۔ کہ ذبیح اسمٰعیلؑ ہے۔ نہ اسحاقؑ۔ فتدبر ۱۲۔

اور ایک صورت اس کے جواب کی یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ نے ان سے فرمایا ہو۔ کہ میں غلام نہیں ہوں۔ اور غلام بننے سے انکار کیا ہو۔ مگر یہ کہ انہوں نے حضرت کی بات نہ سُنی ہو۔ اور ان کے قول کی طرف توجہ نہ کی ہو۔ اگرچہ یہ قول کتب و روایات میں منقول نہیں ہے۔ مگر یہ کوئی ضرور نہیں۔ کہ جو کچھ زمانہ سابق میں ہو گذرا ہے۔ وہ ہم تک بھی پہنچے۔ بنا بریں ممکن ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے غلامی سے انکار کیا ہو۔

اور ایک جواب یہ ہے۔ کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے قتل ہو جانے سے خوف کیا۔ اور ڈر کے مارے اپنا نبی ہونا ظاہر نہ کیا۔ اور غلامی پر صبر کیا۔ مگر یہ جواب باطل ہے۔ اس لئے کہ پیغمبر کے لئے جائز نہیں ہے۔ کہ وہ اپنے مارے جانے کے خوف سے اپنے مبعوث برسالت ہونے کے مقصود کو پوشیدہ کرے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ادائے رسالت کے لئے بھیجا ہے۔ اور جب تک کہ میں ادائے رسالت سے فارغ نہ ہو جاؤں۔ اور میری دعوت لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ وہ قتل ہو جانے سے میرا حافظ اور نگہبان ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو غرض بعثت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور وہ ایک امر فضول اور لاحاصل ٹھہرتا ہے۔ تعالی اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اللہ تعالیٰ حضرت یوسفؑ کے ذکر میں فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

ف۱ حضرت یوسفؑ کا اُس وقت رسالت پر مبعوث ہونا ثابت نہیں۔ اور جب تک نبی مبعوث برسالت نہیں ہوتا۔ اور تبلیغ پر مامور نہیں کیا جاتا۔ اُس وقت تک راز نبوت کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور پوشیدہ رکھنا ہی واجب ہے۔

ف۲ عن الرضا علیہ السلام۔ قال لقد همت به ولولا ان رای برهان ربه لهم بها كما همت لكنه كان معصوما والمعصوم لا يهم بذنب ولا ياتيه ولقد حدثني قال همت بان تفعل وهم بان لا يفعل ترجمہ جناب امام رضاؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا۔ البتہ اُس نے (زوجہ عزیز مصر) اُس کا قصد کیا (یوسفؑ) اور اگر وہ اپنے رب کے برہان کو نہ دیکھتا۔ تو وہ بھی اُس کا ویسا ہی قصد کرتا۔ جیسا اُس نے کیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ معصوم تھا۔ اور معصوم نہ ارادہ گناہ کرتا ہے۔ اور نہ اُس کا مرتکب ہوتا

جواب - هَمّ کے معنی لغت میں بہت سے ہیں - اول عزم علی الفعل (کسی کام کا ارادہ کرنا) چنانچہ قرآن میں ہے - اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (جبکہ قوم نے ارادہ کیا - کہ اپنے ہاتھ تمہاری طرف پھیلائیں - پس خدا نے ان کے ہاتھ تمہاری طرف سے بند کر دئیے) + اور شاعر کا شعر ہے - شعر

هَمَمْتُ وَلَمْ اَفْعَلْ وَكِدْتُ وَلَيْتَنِيْ + تَرَكْتُ عَلٰى عُثْمَانَ تَبْكِيْ حَلَائِلُهُ

اور اسی طرح خنساء کا قول ہے - شعر

وَفَضْلُ مِرْدَاسٍ عَلَى النَّاسِ حِلْمُهُ + وَاِنَّ كُلَّ هَمٍّ هَمَّهُ فَهُوَ فَاعِلُهُ

اور حاتم طائی کا شعر ہے - شعر

وَلِلّٰهِ صُعْلُوْكٌ يُسَاوِرُ هَمَّهُ + وَيَمْضِيْ عَلَى الْاَيَّامِ وَالدَّهْرِ مُقْدِمًا

دوم - ایک شے کا دل میں گزر جانا - گو اس کے کرنے کا عزم نہ ہوا ہو - چنانچہ خدا فرماتا ہے - اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا (جب کہ تم میں سے دو گروہوں کے دل میں نامردی اور بزدلی کا خیال گزرا - اور اللہ ان دونوں کا ولی ہے) اس آیت کا منشا یہ ہے کہ فشل (بزدلی) ان کے دل میں گزری تھی - اور اگر یہاں هَمّ سے عزم مراد ہوتا - تو اللہ ان کا ولی نہ ہوتا - اس لئے کہ وہ فرماتا ہے - وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (یعنی جس نے بھاگنے کی نیت سے میدان جنگ سے پیٹھ پھیری - وہ غضب خدا میں گرفتار ہوا - اور جہنم میں داخل ہوگا) +

اور معصیت کا ارادہ - اور اس کا عزم کرنا معصیت ہے - اور بعض علماء اس سے بھی تجاوز کر گئے ہیں - اور کہتے ہیں - کہ کبیرہ کا عزم کرنا بھی کبیرہ ہے - اور صغیرہ کا عزم کرنا

(بقیہ نوٹ) ہے - اور میرے پدر عالی مقدار نے فرمایا ہے - اُس نے فعل کا قصد کیا - اور اُس نے (یوسفؑ نے) اُس فعل سے بچنے کا ارادہ کیا - انتہی - اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے - کہ برہان سے مراد برہان نبوت ہے - اور وہ روح قدس ہوتی ہے - اور وہی در اصل مسدد ہے اور معصوم کو معصوم بنانے والی ہے - اور اسی سے نبی نبی ہوتا ہے - اور وہی مورد فیضان الٰہی ہے - اگر وہ دلیل قطعی نبوت اُنکے پاس نہ ہوتی تو آپ بھی ویسا ہی قصد کر لیتے جیسا کہ زوجہ عزیز مصر نے کیا تھا - لیکن چونکہ آپ نبی تھے - اور برہان نبوت موجود تھا آپ نے ویسا قصد نہ کیا - بلکہ اُس سے بچنے اور اُس کے خلاف کا قصد کیا - و بہ نختم القسم فافہم +

صغیرہ۔ اور کفر کا عزم کرنا کفر ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ اللہ تعالےٰ اس شخص کا دوست ہو۔ جو اس کے نبی اور اسلام کی نصرت سے بھاگ کر بُرائی کی طرف جانیکا عزم کرے۔

اور کعب بن زہیر کا قول بھی اس امر کا شاہد ہے۔ کہ ہمّ اور عزم میں فرق ہے۔ اور اور ظاہری فرق اختلاف معنی پر دلالت کرتا ہے۔ شعر یہ ہے۔ شعر

فَكَمْ فِيهِمْ مِنْ سَيِّدٍ مُتَوَسِّعٍ ✦ وَمِنْ فَاعِلٍ لِلْخَيْرِ اِنْ هَمَّ اَوْ عَزَمَ

اور ھَمَّ مقاربت (قریب ہونا) کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ہَمَّ بِكَذَا فَكَذَا یعنی كَادَ يَفْعَلُهُ (قریب ہے کہ وہ اس کام کو کرے)۔ اور ذو الرمہ کا قول ہے۔ شعر

اَقُوْلُ لِمَسْعُوْدٍ بِجَرْعَاءِ مَالِكٍ ✦ وَقَدْ هَمَّ دَمْعِيْ اَنْ يَلِجَّ اَوَائِلُهُ

ظاہر ہے۔ کہ دمع کے لئے عزم جائز نہیں ہے۔ یہاں ھم کے معنی فقط کاد اور قرب (قریب ہوا) کے ہیں۔

اور ابو الاسود دئلی کہتا ہے۔ شعر

وَكُنْتُ مَتَى تَهْمُمْ يَمِيْنُكَ مَرَّةً ✦ لِتَفْعَلَ خَيْرًا تَقْتَفِيْهَا شِمَالُكَا

اسی بنا پر خدا فرماتا ہے۔ جِدَارًا يُرِيْدُ اَنْ يَنْقَضَّ یعنے يَكَادُ اَنْ يَنْقَضَّ (یعنی گرنے کے قریب تھی)۔

اور حارث کا قول ہے۔ شعر

يُرِيْدُ الرُّمْحُ صَدْرَ اَبِيْ بَرَاءٍ ✦ وَيَرْغَبُ عَنْ دِمَاءِ بَنِيْ عَقِيْلٍ

اور ایک معنی ھم کے شہوت اور میل طبع ہے۔ کیونکہ انسان جس چیز کی خواہش کیا کرتا ہے۔ اور اس کی طبعیت کا میلان اس کی طرف ہوتا ہے۔ تو اس چیز کی نسبت کہا کرتا ہے۔ لَيْسَ هٰذَا مِنْ هَمِّيْ وَهٰذَا اَهَمُّ الْاَشْيَاءِ اِلَيَّ (اس چیز کی مجھ کو خواہش نہیں ہے۔ اور اس کو میں سب چیزوں سے زیادہ چاہتا ہوں)۔ اور شہوت کی جگہ لفظ ہمت کے استعمال کا جائز ہونا لغت سے ظاہر ہے۔ اور حسن بصری سے اس آیت کی یہ تاویل منقول ہے۔ کہ وہ کہتا ہے۔ کہ ھم زلیخا تو اخبث الھم یعنی بدترین خواہش تھی۔ اور ھم یوسف یعنی خواہش یوسف وہ منجملہ خواہش انسان تھی۔ جو دل میں طبعاً پیدا کی گئی ہے۔ چونکہ لفظ ھم کے معنی لغت میں مختلف اور بہت وسیع ہیں۔ جیساکہ ہم نے ذکر کیا۔ اس لئے ہم یوسف علیہ السلام سے اس معنی کو دور کرتے

ہیں جو شان نبوت کے شایاں نہیں۔ اور وہ عزم قبیح ہے۔ اور باقی معنوں کو جائز رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سب اس مقام میں درست ہو سکتے ہیں +

اگر کوئی کہے - کہ آیا اس آیت میں ھمّ کو عزم اور ارادہ کے معنی میں لینا جائز ہے۔ اور پھر بھی کوئی ایسی درست صورت نکل سکتی ہے۔ جو شان یوسف ع کے شایاں ہو +

جواب - بے شک جب ہم اس آیت میں ھمّ کو عزم کے معنی میں لیں۔ تو جائز ہے۔ کہ ہم اس کو غیر قبیح سے متعلق کریں۔ اور یوں کہیں۔ کہ یوسف علیہ السلام نے اس عورت کے مارنے یا اپنے نفس سے اس کے دور کرنے کا ارادہ کیا + جیسے کوئی کہتا ہے۔ قَدْ كُنْتُ هَمَمْتُ بِفُلَانٍ اَيْ بِاَنْ اُوْقِعَ بِهٖ ضَرْبًا اَوْ مَكْرُوْهًا۔ (یعنی میں نے فلاں شخص کے مارنے یا کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا تھا) +

اگر کوئی کہے - کہ بنا بر اس تاویل کے قول تعالیٰ لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یعنی اگر اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ دیکھتا) سے کیا فائدہ ہے۔ اور زلیخا کو اپنے نفس سے دور کرنا عبادت اور طاعت خدا ہے۔ کہ برہان الٰہی اس سے مانع نہیں ہو سکتی +

جواب میں کہا جائیگا۔ کہ ممکن ہے۔ کہ جب یوسف ع نے زن عزیز کے ہٹانے اور اس کے مارنے کا ارادہ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی حضرت کو دکھائی ہو۔ جو اس امر پر دال ہو۔ کہ اے یوسف ع اگر تو اپنے ارادے پر اقدام کریگا (یعنی زلیخا کو مار پیٹ کریگا)۔ تو اس کے ورثاء تجھ کو مار ڈالینگے۔ یا یہ کہ وہ عورت دعوے کریگی۔ کہ یہ مجھ سے بدفعلی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور متہم کریگی۔ کہ اس نے مجھ کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اور جب میں نے فعل بد سے اس کو منع کیا۔ تو اس نے مجھ کو مارا + پس اللہ تعالیٰ نے خبر دیتا ہے۔ کہ میں نے سوء اور فحشاء کو (کہ وہ قتل اور مکروہ یا قبیح کا اس پر ظن کرنا یا قبیح کا اس کی نسبت اعتقاد کر لینا تھا) اپنی نشانی کے ذریعے یوسف ع سے دور کر دیا +

اگر کوئی کہے - کہ اس جواب کے موافق لازم آتا ہے۔ کہ لفظ لولا کا جواب ترتیب کلام میں لولا پر مقدم ہے۔ اور تقدیر کلام یوں ہوئی۔ لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَهَمَّ بِهَا اور یہ ظاہر ہے۔ کہ جواب لولا کی تقدیم قبیح ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ اس مقام پر لولا کا جواب مذکور ہی نہیں +

جواب - ہم کہتے ہیں۔ کہ جواب لولا کی تقدیم جائز اور مستعمل ہے۔ اور ہم عنقریب

جواب مختص کے ضمن میں اس کو بیان کرینگے۔ اگرچہ ہمکو اس بات کے ذکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ مارنے کا ارادہ اور عورت کا حضرتؑ سے فعل قبیح کی خواہش کرنا ضرور وقوع میں آئے۔ مگر وہ اس نشانی کے سبب حضرتؑ سے منصرف ہوگیا جس کو حضرتؑ نے دیکھا تھا۔ اور تقدیر او تلخیص کلام یوں ہوگی۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ وَهَمَّ بِهٖ فَهَمَّا لَوْلَا اَنْ رَّاٰی بُرْهَانَ رَبِّهٖ يَفْعَلَ ذٰلِكَ (اور زلیخا نے بیشک حضرت یوسفؑ سے فعل قبیح کا ارادہ کیا۔ اور حضرتؑ نے اس کو اپنے نفس سے ہٹانے کا ارادہ کیا (مار پیٹ کے ذریعے) اگر وہ اپنے پروردگار کی برہان کو نہ دیکھتے۔ تو ضرور وہ مار پیٹ عمل میں آجاتی) پس لولا کا جواب اس آیت میں محذوف ہے جیسا کہ جواب لولا آیۂ ذیل میں محذوف ہے۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ اور معنی اس آیت کے یہ ہیں۔ کہ لولا فضل اللہ علیکم لھلکتم (اگر فضل اور رحمت خدا تم پر نہ ہوتی۔ تو تم ہلاک ہو جاتے) اور ایسا ہی آیۂ ذیل میں جواب محذوف ہے۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَمْ تَتَنَافَسُوْا فِي الدُّنْيَا وَلَمْ تُزَاحِمُوْا عَلٰى حُطَامِهَا اور امرء القیس کا قول ہے۔ شعر

فَلَوْ اَنَّهَا نَفْسٌ تَمُوْتُ سَوِيَّةً + وَلٰكِنَّهَا نَفْسٌ تَسَاقَطُ اَنْفُسًا۔

شاعر کی مراد یہ ہے۔ فَلَوْ اَنَّهَا نَفْسٌ تَمُوْتُ سَوِيَّةً لَانْقَضَتْ وَفَنِيَتْ۔ پس جواب محذوف ہے۔ اس اعتماد پر کہ کلام خود اس کا مقتضی اور اس سے متعلق ہے + اور جو شخص کہ اس آیت کی تاویل اس طور پر کرے۔ جو شان نبیؑ کے شایاں نہیں ہے۔ اور عزم معصیت کو یوسفؑ کی طرف منسوب کرے۔ اس کے لئے بھی جواب محذوف ماننا ضروری ہوگا۔ اور اس کی تاویل کے موافق تقدیر کلام یہ ہوگی۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِالزِّنَا وَهَمَّ بِمِثْلِهٖ لَوْلَا اَنْ رَّاٰی بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَفَعَلَهٗ۔ (زن عزیز مصر نے زنا کا ارادہ کیا۔ اور یوسفؑ نے ویسا ہی عزم کیا۔ اگر حضرتؑ اپنے پروردگار کی نشانی نہ دیکھتے۔ تو ضرور زنا کے مرتکب ہو جاتے۔ معاذ اللہ من ذلک) +

سوال ۔ جب کہ تم نے آیت مذکورہ میں عزم اور ھمّ کو مارنے یا ہٹانے سے متعلق کیا۔ تو ظاہر آیت کے مخالف ہوا +

جواب ۔ در اصل بات یہ نہیں ہے جو کہ سائل کے گمان میں ہے۔ اس لئے کہ

هَمّ ظاہر آیت میں اس چیز سے متعلق ہے۔ جس سے عزم اور ارادہ کا متعلق ہونا درحاصل صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ حق تعالٰے فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا۔ پس ظاہر کلام میں ھَمّ ان دونوں (یوسف اور زنِ عزیز) کی ذات سے متعلق ہوا۔ اور ذوات موجودہ اور باقی کا ارادہ اور عزم کرنا صحیح اور درست نہیں ہے۔ پس لازم ہوا کہ کوئی ایسا امر محذوف ہو جس سے عزم کو متعلق کیا جائے۔ اور وہ امر ایسا ہو۔ جو انکی (یوسف اور زنِ عزیز) طرف رجوع کرتا ہو۔ اور وہ دونوں اس امر کے ساتھ مخصوص ہوں۔ اور ضرب اور دفع کا اُن دونوں کی طرف رجوع کرنا مثل رجوع کرنے ارتکاب بدکاری کے ہے۔ پس معلوم ہوا۔ کہ ظاہر کلام کا مقتضا ہمارے مذکورہ بالا بیان کے برخلاف نہیں ہے۔ دیکھو جب ایک شخص کہتا ہے۔ قد هممتُ بفلانٍ۔ تو ظاہر کلام کا مقتضا یہ ہے۔ کہ اس شخص کا عزم اور ھم ایسے امر سے متعلق ہے۔ جو فلاں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اس باب میں کوئی ایک فعل کسی دوسرے فعل سے اولٰے اور افضل نہیں ہے۔ پس جائز ہے۔ کہ اس کے قول سے یہ مراد لی جائے۔ کہ اس نے اس کے قتل کرنے یا عزت و تکریم کرنے یا ذلت اور اہانت (وغیرہ افعال) کرنے کا ارادہ کیا۔ بنابراں کے کہ اگر آیت کے ظاہر کا مقتضا ہمارے بیانِ مذکورہ بالا کے خلاف بھی ہوتا۔ اگرچہ ہم نے بیان کردیا ہے۔ کہ اصل معاملہ اس کے برخلاف ہے۔ تو جائز تھا۔ کہ ہم بباعث دلیل عقلی کے جو انبیاء علیہم السّلام کو قبائح سے پاک کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے عدول کریں۔ اور خلاف ظاہر پر اس کو محمول کریں ❖

سوال۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالٰے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا ایک ہی موقع اور ایک ہی محل پر نازل ہوا ہے۔ پھر کیا سبب ہے۔ کہ تم نے زنِ عزیز کے ھَمّ کو تو قبیح سے متعلق کیا۔ اور ھمّ یوسفؑ کو ضرب اور دفع سے متعلق کیا۔ جیسا کہ تم نے اوپر بیان کیا ہے ❖

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ ظاہر آیت سے تو کسی ایسے امر کا پتا نہیں لگتا۔ جس سے ان دونوں کے ھم اور عزم کا متعلق ہونا ظاہر ہو۔ بلکہ ہم نے تو صرف شہادت کتاب خدا و آثار نبویؐ سے اس بات کو ثابت کیا ہے۔ کہ زنِ عزیز نے جو حضرت یوسفؑ کی نسبت ارادہ کیا۔ وہ متعلق بہ قبیح تھا۔ اور وہ منجملہ ان اشخاص کے تھی۔ جن سے فعل قبیح کا صادر

ہونا جائز ہے۔ اور کوئی دلیل ایسی نہیں ہے۔ جو زن عزیز کی نسبت جواز فعل قبیح کے باب میں مطلمئن کرے۔ جیساکہ حضرت یوسفؑ کے باب میں اس امر سے اطمینان اور تسلی حاصل ہے ۔ اور کتاب خدا میں وہ مقام جو اس امر کا شاہد ہے۔ آیات ذیل ہیں ۔ (۱) وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۔ (۲) وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ ۔ (۳) اس میں خدا زن عزیز کی زبانی فرماتا ہے ۔ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ۔ (۴) قَالَتْ فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۔ (ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زن عزیز نے حضرت یوسفؑ سے فعل قبیح کا ارادہ کیا تھا۔ مترجم) ۔

اور حدیث میں باتفاق مفسرین قرآن اور باجماع ناقلین کتاب خدا وارد ہوا ہے۔ انها همت بالمعصية الفاحشة ۔ (کہ زن عزیز نے بدکاری اور معصیت جناب باری کا ارادہ کیا تھا)۔ اور ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام سے وہم نے اس سے پیشتر دلائل عقلی سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ فعل قبیح کا صادر ہونا اور اس کا عزم کرنا آپ سے جائز ہی نہیں۔ اس لئے کہ آپ پیغمبر تھے۔ اور اس بات کو ہم نے شروع کتاب میں بخوبی ثابت کر دیا ہے۔ اور قرآن کے بھی بہت سے مقامات اس امر پر شاہد ہیں۔ کہ حضرت یوسفؑ نے بدکاری کا ہم اور عزم نہیں کیا۔ (۱) آیہ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۔ (۲) آیۂ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ ۔ اگر یہی بات درست ہوتی۔ جیساکہ جاہل لوگ کہتے ہیں۔ کہ آپ نے زن عزیز کے اس مقام پر جلوس کیا۔ جہاں خائن اور غیر متدین لوگ بیٹھا کرتے ہیں۔ اور آخر کار ازار بند کھولا۔ اور خدا کی طرف سے اس فعل سے خوف دلایا گیا۔ تو یوسف علیہ السلام سے سوء اور فحشاء کیونکر منصرف ہوتے۔ جیساکہ خدا فرماتا ہے۔ اور آپ خائن بالغیب (پوشیدہ طور پر خیانت کرنے والے) کیونکر قرار پاتے۔ بلکہ اس صورت میں سوء اور فحشاء کے مرتکب بھی اور خائن بالغیب بھی ضرور ہی ٹھیرتے ۔ (۳) آیۂ قول ہے جس میں زن عزیز کی زبانی نقل فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ (۴) أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ۔ (۵) قول عزیز فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ۔ اس میں عزیز نے کید کو

حضرت یوسفؑ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ بلکہ اپنی زوجہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ (۶) وہ آیت جس میں عزیز کی زبانی نقل فرماتا ہے۔ جب کہ اس کو معلوم ہوا۔ اور تحقیق ہو گیا۔ کہ گناہ میری بیوی کا ہے۔ اور یوسفؑ اس معاملہ میں بالکل بری اور پاک ہیں۔ تو کہا۔ یُوسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِیْنَ ٭ مذہب فاسد عامہ کے موافق تو دونو خطاکار اور گنہگار ہیں۔ اس لئے واجب تھا۔ کہ حضرت یوسفؑ بھی استغفار کرتے۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ صرف زن عزیز ہی کو استغفار کیلئے خاص کیا گیا۔ اور حضرت یوسفؑ کا ذکر تک بھی نہ کیا ٭ (۷) وہ آیت جس میں خدا تعالےٰ حضرت یوسفؑ کی زبانی حکایت فرماتا ہے۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ٭ آپ کی دعا کا قبول ہونا بتا رہا ہے۔ کہ آپ ہر بدی سے بری ہیں۔ اور یہ جتلا رہا ہے۔ کہ اگر بقول عامہ حضرت ان افعال مذکورہ بالا کے مرتکب ہوتے۔ تو آپ ان عورتوں کی طرف مائل ہو جاتے۔ اور ان کا کید و مکر اس بزرگوار پیغمبر کی طرف سے منصرف نہ ہوتا ٭ (۸) آیۂ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ٭ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زنان مصر نے حضرت یوسفؑ کی نسبت سوء (بدی) سے بری ہونے کی شہادت دی۔ اور سوء کا عزم کرنا بھی بہت بڑی برائی ہے۔ اگر آپ نے معاذ اللہ بقول عامہ بدی کا عزم کیا ہوتا۔ تو ایسی شہادت وہ عورتیں نہ دیتیں ٭ (۹) وہ آیت جس میں اللہ تعالےٰ بادشاہ کی زبانی حکایت فرماتا ہے۔ اِئْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ○ (اس کو (یوسفؑ کو) میرے پاس لاؤ۔ اس کو میں اپنے لئے چھٹروا تا ہوں۔ پس جب حضرتؑ نے بادشاہ سے گفتگو کی تو اس نے کہا۔ کہ تو آج کے دن ہمارے نزدیک صاحب مرتبہ اور امین ہے) اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے الفاظ شخص کی نسبت نہیں کہے جاتے جو ان افعال کا مرتکب ہو چکا ہو جن کے ارتکاب کا اہل خلاف ذکر کرتے ہیں ٭

سوال۔ اگر کوئی کہے کہ اگر حضرت یوسفؑ جمیع الزامات سے پاک تھے۔ تو یوں کیوں فرمایا۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ٭

جواب۔ ہم کہینگے کہ اس قول سے حضرت یوسفؑ کی مراد صرف طلب اور ارادہ اور میل ہے۔ اور معصیت کا عزم اس سے مراد نہیں ہے۔ غرض وہ جناب اپنے نفس کو امالہ سے

بری نہیں کہتے جن سے طبائع بشری خالی نہیں ہوتیں ۔

ماسوا اس کے اور جواب بھی ہے جس کو ابو علی جبائی نے معتبر سمجھا اور اختیار کیا ہے۔ اگرچہ اہل تاویل کی ایک جماعت نے بھی اس جواب کی طرف سبقت کی ہے۔ اور اس کو بیان کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ کلام مَا اُبرئُ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء۔ حضرت یوسفؑ کا کلام نہیں۔ بلکہ زن عزیز کا کلام ہے۔ اور اس تاویل کی صحت پر یہ دلیل پیش کی ہے۔ کہ اس میں ذرا شک نہیں۔ یہ کلام زن عزیز کے کلام سے ملحق اور متعلق ہے۔ دیکھو۔ خدا فرماتا ہے۔ قالت امرأۃ العزیز الآن حصحص الحق انا راودتہ عن نفسہ وانہ لمن الصادقین ذلک لیعلم انی لم اخنہ بالغیب وان اللہ لا یھدی کید الخائنین وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء۔ پس کلام ما ابرئ ... الخ زن عزیز کے کلام سے ملحق ہے۔ اور اس تاویل کے موافق تبریٔ اس خیانت سے ہوگا۔ جو ذلک لیعلم انی لم اخنہ بالغیب میں ہے۔ اور زن عزیز کا کلام ہے نہ کہ یوسف علیہ السّلام کا۔ اور زن عزیز کے قول اِنّی لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ میں مَکْنِی عَنْہُ یوسف علیہ السّلام ہیں۔ یعنی ضمیر ہا یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے۔ نہ کہ اس کے شوہر یعنی عزیز مصر کی طرف۔ کیونکہ اس نے اپنے شوہر کی تو ضرور خیانت بالغیب کی۔ بلکہ یہاں اس کی مراد یہ ہے۔ کہ میں نے یوسف علیہ السّلام کی خیانت نہیں کی حالانکہ وہ قید خانے میں غائب ہیں ۔ اور یہ جواب ظاہر کلام سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ کیونکہ اس تاویل کی حالت میں اس کلام کے سیاق اور نظم میں کچھ فرق نہیں آتا ۔

سوال۔ اگر کوئی کہے۔ کہ جب کہ حضرت یوسفؑ ان لوگوں کے نزدیک معصیت سے بری اور خیانت سے منزہ تھے۔ تو ان کے قید میں بھیجنے سے کیا مقصود تھا ۔

جواب۔ کہتے ہیں۔ کہ حضرت یوسفؑ کے قید کرنے کا سبب یہ تھا۔ کہ زن عزیز کی حرکت بیجا اور فعل ناشائستہ پر پردہ پڑ جائے۔ اور لوگوں پر اس کا راز پوشیدہ ہو جائے۔ تاکہ اس کا کام ہر شخص پر منکشف نہ ہو۔ اور وہ فضیحت اور رسوائی سے محفوظ رہے۔ چنانچہ آیۂ ذیل ہمارے اس بیان کی شاہد ہے۔ ثُمَّ بَدَا لَھُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّہٗ حَتّٰی حِیْنٍ (پھر نشانیاں دیکھنے کے بعد ان کی صلاح ہوئی۔ کہ حضرت یوسفؑ کو ایک عرصے تک قید میں رکھا جائے) ۔

جواب دیگر۔ اگر ھمّ کے معنی اس آیت میں عزم کے لئے جائیں۔ تو ایک اور جواب یہ ہوسکتا ہے۔ کہ آیت کو تقدیم اور تاخیر پر محمول کیا جائے۔ اور اس کی تلخیص یوں ہے۔ ولقد ھمّت بہ ولولا ان رای برھان ربہ لھمّ بھا (اور بتحقیق زلیخا نے حضرت یوسفؑ سے بدکاری کا ارادہ کیا۔ اور اگر وہ جناب نشانی پروردگار عالم کو نہ دیکھتے۔ تو وہ بھی ویسا ہی ارادہ کرتے) اور یہ بمنزلہ اس قول کے ہے کہ کہتے ہیں۔ قد کنت ہلکت لولا انی تدارکتک وقتلت لولا انی قد خلصتک۔ اور معنی اس کے یہ ہیں۔ لولا تدارکی لھلکت ولولا تخلیصی لقتلت (اگر میں تیری خبر نہ لیتا۔ تو تو ہلاک ہو جاتا۔ اگر میں تجھ کو نہ چھڑاتا۔ تو تو قتل ہو جاتا) اگرچہ نہ ہلاک وقوع میں آیا۔ اور نہ قتل ٭

اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

فلا یدعنی قومی صریحاً لحرۃ ۔۔۔ لئن کنت مقتولاً ویسلم عامر

دوسرا شاعر کہتا ہے۔ شعر

فلا یدعنی قومی لیوم کریھۃ ۔۔۔ لئن لم اعجل طعنۃ او اعجل

ان دونوں شعروں میں جواب لئن مقدم ہے۔ اور بعض لوگ جواب لولا کی تقدیم لولا پر جائز نہیں جانتے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ اگر جائز ہو۔ تو یہ کہنا بھی جائز ہوگا۔ قام زید لولا عمرو۔ قصدتک لولا بکر۔ حالانکہ ہم اس سے پہلے ایسی امثلہ اور شواہد ذکر کر چکے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جواب لولا کی تقدیم لولا پر جائز ہے۔ اور یوں بھی استعمال میں آتا ہے۔ قد کنت قمت لولا کذا وکذا۔ وقد کنت قصدتک لولا ان صدنی فلان۔ اگرچہ قیام اور قصد وقوع میں نہیں آیا ہو۔ اور یہی مثالیں آیت بالا کے مشابہ ہیں۔ نہ کہ وہ مثالیں جو معترض نے بیان کی ہیں ٭

اب دیکھنا چاہئے کہ اس آیت میں شرط ہے۔ اور وہ قول الٰہی لولا ان رای برھان ربہ ہے۔ پس یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ کہ جو امر شرط کی حالت میں ہو اس کو مطلق ہونے پر محمول کیا جائے۔ اور یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کہ جواب لولا کو محذوف فرض کریں۔ اس لئے کہ اس کے جواب کو موجود ماننا اولیٰ اور افضل ہے۔ اور جواب لولا کی تقدیم اس کو بالکل کلام میں سے حذف کرنے کی نسبت بعید تر نہیں ہے۔ اور جب کہ معترضین کے نزدیک حذف جائز ہوا۔ تاکہ تقدیم جواب لازم نہ آئے۔ تو ان کے مخالفین کے نزدیک بھی

تقدیم جواب جائز ہوگی۔ تاکہ حذف جواب لازم نہ آئے +

سوال۔ اگر کوئی کہے۔ کہ وہ برہان (نشانی) کونسی تھی۔ جس کو دیکھ کر یوسف علیہ السلام معصیت سے باز رہے۔ اور کیا یہ صحیح ہے۔ جو مروی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے یوسفؑ کو اُن کے باپ یعقوبؑ کی شکل دکھائی تھی۔ کہ وہ اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ رہے تھے۔ اور ارتکاب معصیت پر اُن کو عذاب خدا سے ڈرا رہے تھے۔ یا بروایت دیگر منقول ہے۔ کہ فرشتوں نے اس وقت یوسف علیہ السلام کو زجر و نہی کی +

جواب۔ ہم کہینگے کہ جو برہان حضرت یوسفؑ نے دیکھی۔ یہ نہ تھی۔ جو عامہ نے نقل کی ہے۔ جس کو دیکھ کر حضرت یوسفؑ خوف کے مارے معصیت خدا سے باز رہے۔ کیونکہ یہ بات الجاء میں داخل ہے۔ اور تکلیف کی منافی اور محنت کی مخالف ہے۔ اور اگر امر واقعی یوں ہی ہو۔ جیسا کہ عامہ گمان کرتے ہیں۔ تو یوسف علیہ السلام اس معصیت سے منزہ اور بری رہنے کی صورت میں جس کی طرف زن عزیز نے ان کو دعوت کی تھی۔ نہ تو کسی قسم کی مدح کے مستحق ہیں۔ نہ ثواب کے۔ اور ایسا کہنا اس جنابؑ کی شان میں نہایت ہی قبیح اور زبون ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ معصیت سے باز رہنے پر انکی مدح و ثنا کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ○ +

وہ برہان جو یوسف علیہ السلام نے دیکھی محتمل ہے۔ کہ وہ لطف الٰہی تھا۔ جس کو پروردگار عالم نے اس وقت یا اس سے پہلے حضرت یوسفؑ کے شامل حال فرمایا تھا۔ جس کے سبب حضرتؑ نے معاصی سے بچنے اور ان سے باز رہنے کو پسند کیا۔ اور اسی کا ہونا اُن کے معصوم ہونے کا مقتضی ہے۔ کیونکہ عصمت ہی وہ لطف پروردگار ہے۔ جس کی موجودگی میں یوسف علیہ السلام نے فعل قبیح سے بچنا اور اس کو عمل میں لانے سے باز رہنا اختیار کیا۔ اور جائز ہے۔ کہ یہاں رویت (دیکھنا) علم کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ ادراک کے معنی میں بھی آسکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں صورتیں (علم اور ادراک) اس قول میں محتمل ہیں +

اور بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ برہان اس مقام میں دلالت الٰہی ہے۔ کہ خداوند متعال نے حضرت یوسفؑ کو اس امر پر دلالت کی۔ کہ یہ فعل حرام ہے۔ اور اس کا فاعل عذاب و عقاب

آخرت کا سزاوار ہوگا۔ کیونکہ یہ دلالت بھی اس فعل سے باز رکھنے والی اور اس فعل سے باز رہنے کے دواعی کو قوت دینے والی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے ✤

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ یہ کیونکر جائز ہے۔ کہ یوسف علیہ السّلام نے کہا جس کی نقل قرآن میں خدا فرماتا ہے۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ ✤ حالانکہ ہم جانتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کا اس جناب کو قید کرنا معصیت تھا۔ جیسا کہ ان کا حضرتؑ کو بدکاری کی دعوت کرنا معصیت تھا۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ معصیت کی محبت بھی تمہارے نزدیک معصیت میں داخل ہے ✤

جواب۔ اس آیت کی تاویل دو طرح سے ہو سکتی ہے:۔

تاویل اوّل یہ کہ آپ کے قول **احبّ الیّ** سے مراد ہے اَخَفُّ عَلَیَّ وَ اَسْہَلُ (مجھ پر یہ کام سہل اور آسان ہے) اور اس سے مراد وہ محبت نہیں ہے۔ جو ارادہ علی الحقیقۃ ہے۔ اور اس کی مثال بعینہ ایسی ہے۔ جیسے کسی شخص کو دو سخت کاموں میں سے جن کا کرنا اس کے نزدیک مکروہ اور نہایت شاق اور گراں ہے۔ ایک کام کے پسند کرنے کا اختیار دیا جائے۔ اور وہ جواب میں کہے۔ کہ ذا احبّ الیّ (فلاں کام میرے نزدیک آسان اور سہل ہے) اور اس سے مراد وہی سہولت اور خفت ہے۔ جس کا ہم نے ذکر کیا ہے ✤

تاویل دوم یہ کہ حضرت یوسفؑ کی مراد اَحَبُّ اِلَیَّ سے یہ ہو۔ کہ میرا اپنے نفس کو قید پر تسکین دینا اور صبر دلانا میرے نزدیک معصیت میں پڑنے سے افضل اور محبوب تر ہے ✤

اگر کوئی کہے۔ کہ یہ تاویل ظاہر آیت کے مخالف ہے۔ کیونکہ وہ مطلق اور بلا قید ہے۔ اور تم اس میں ضمیر محذوف نکالتے ہو ✤

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ اس تاویل کا ظاہر معنی کے مخالف ہونا ضروری اور لازم ہے۔ اس لئے کہ جائز نہیں ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ کی مراد اس مقام میں نفس سجن ہو۔ کیونکہ سجن (قید خانہ) ایک مکان مخصوص ہوتا ہے۔ سو وہ کیونکر حضرت یوسفؑ کی مراد ہو سکتا ہے۔ ہاں جب کہ سَجْن بفتح سین پڑھا جائے۔ تو ظاہر کلام ہمارے قول مذکورہ بالا کے مخالف ہوگا۔ گو قرأت (بفتح سین) میں بھی ہمارے مذکورہ بالا معنی کا احتمال پایا جاتا ہے۔ گویا آپ کی مراد یہ ہے۔ اِنَّ سَجْنِیْ نَفْسِیْ عَنِ الْمَعْصِیَۃِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ مُوَاقَعَتِہَا۔ کہ میرا اپنے نفس کو معصیت

سے قید رکھنا یعنی باز رکھنا میرے نزدیک معصیت میں پڑنے سے زیادہ تر محبوب ہے ۔ اس صورت میں سجن کے معنی حضرت یوسفؑ کی طرف راجع ہونگے ۔ نہ کہ ان (اہل مصر) کے افعال کی طرف ۔ اور جب امر واقعی ہمارے مذکورہ قول کے موافق ہوگا ۔ تو مخالف نے جو کلام مذکور کی اس طرح تقدیر کی ہے ۔ کہ انّ کونی فی السجن وجلوسی فیہ احبّ الیّ ۔ وہ اس تقدیر سے جس کو ہم نے اوپر ذکر کی ہے ۔ اولیٰ اور انسب نہیں ہے ۔ اس لئے کہ یہ دونو امر سجن کی طرف عائد ہوتے ہیں ۔ اور اس سے متعلق ہیں ۔

اگر کوئی کہے ۔ کہ حضرت یوسفؑ یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں ۔ السجن احبّ الیّ مما یدعوننی الیہ یعنی قید خانہ میرے نزدیک اس چیز سے زیادہ تر محبوب ہے ۔ جس کی طرف وہ مجھ کو دعوت کرتے ہیں ۔ حالانکہ وہ جناب کسی حالت میں بھی اس چیز کو محبوب نہیں رکھتے ہیں ۔ جس کی طرف وہ لوگ ان کو دعوت کرتے ہیں ۔ اور لفظ احبّ کی شان یہ ہے ۔ کہ وہ مشترک المعنی چیزوں میں مستعمل ہوتا ہے ۔

ہم جواب میں کہینگے ۔ کہ یہ لفظ (احب) کبھی ایسے مقام میں بھی مستعمل ہوتا ہے ۔ جہاں کسی قسم کا اشتراک نہیں ہوتا ۔ دیکھو جب کسی شخص کو ایسے دو کاموں میں اختیار دیا جائے کہ ایک کو ناپسند کرتا ہے ۔ اور ایک کو پسند ۔ تو اس کو جائز ہے ۔ کہ وہ یہ کہے ۔ (ھٰذا احبّ الیّ من ھٰذا) یہ کام مجھ کو اس کام سے زیادہ تر محبوب اور مرغوب ہے ۔ اگرچہ ھٰذا احبّ الیّ من ھٰذا بلا اختیار دینے کے ابتداءً کہنا جبکہ وہ دونو امر مشترک فی المحبۃ نہ ہوں ۔ خوب نہیں ہے ۔ اور یہ صرف ایک صورت میں تو جائز ہے ۔ اور دوسری صورت میں ناجائز ۔ کیونکہ دراصل دو چیزوں میں جس شخص کو اختیار دیا جاتا ہے ۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے ۔ جبکہ وہ دونو چیزیں اس کی مراد اور مقصود ہوں ۔ یا ان دونو کا اس کے لئے مراد اور مقصود ہونا صحیح ہو ۔ پس تخییر کا موضوع اسی امر کا مقتضی ہے ۔ گو تخییر اس امر میں بھی حاصل ہو جائے ۔ جو اس کے اصل وضع کے مخالف ہو ۔ اور جبکہ ایسی دو چیزوں میں کہ جن میں سے وہ شخص کسی ایک کو پسند نہیں کرتا ۔ ھٰذا احبّ الیّ اختیار کیا جاتا ہے ۔ اس وقت میں وہ اس چیز کا جواب دیتا ہے ۔ جو تخییر کا اصل موضوع ہے ۔ اور اسی مطلب کے قریب وہ آیت ہے ۔ کہ خدا فرماتا ہے ۔ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ (اے محمدؐ ان کفار سے کہدے ۔ کہ یہ بہتر ہے یا جنت خلد) ۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں ۔ کہ عقاب آخرت میں کسی

قسم کی خوبی نہیں ہے۔ مگر یہ قول خداوندی اس سبب سے حسن اور پسندیدہ ہے۔ کہ کفار کے طاعات پر معاصی کو ترجیح دیتے اور اختیار کرتے پر توبیخ اور سرزنش کرنے کے مقام میں وارد ہوا ہے۔ اور کفار نے معاصی کو اس لئے طاعات پر اختیار کیا تھا۔ کہ وہ اعتقاد رکھتے تھے۔ کہ کسب معاصی میں سراسر خیر اور نفع ہے۔ بنا بریں پروردگار عالم نے کفار سے فرمایا۔ اَذٰلِکَ خَیْرٌ عَلٰی مَا ظَنَنْتُمْ وَ اعْتَقَدْتُمُوْہُ اَمْ کَذَا وَ کَذَا۔ آیا یہ بہتر ہے موافق تمہارے ظن اور اعتقاد کے یا ایسا اور ایسا۔

اور ایک جماعت مفسرین کا در بارہ آیہ اَذٰلِکَ خَیْرٌ یہ قول ہے۔ کہ یہ قول اس سبب سے پسندیدہ اور مستحسن ہے۔ کہ دونو حالتیں مرتبے اور منزلت میں باہم مشترک ہیں۔ گو خیر اور نفع میں مشترک نہیں۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا۔ اور ایسے ہی معنی قولہ تعالے رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ میں حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ دونو امر یعنی معصیت کرنا اور سجن میں داخل ہونا اس باب میں مشترک ہیں۔ کہ ان میں سے ہر ایک کا ایک داعی اور اس کا ایک باعث ہے۔ اگرچہ حصول محبت میں دونو مشترک نہیں ہیں۔ پس دواعی محبت میں ان دونو کے اشتراک کو نفس محبت میں ان کا مشترک ہونا قرار دیا گیا۔ اور لفظ (احب) کو اس بنا پر استعمال کیا۔

اور اگر کوئی کہے۔ کہ یوسف علیہ السلام نے یہ کیونکر فرمایا۔ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ (اور اگر تو اے خدا مجھ سے ان (عورتوں) کے کید و مکر کو دور نہ کریگا۔ تو میں ان کی طرف راغب ہو جاؤنگا۔ اور جاہل بن جاؤنگا)۔ حالانکہ تمہارا قول یہ ہے۔ کہ یوسف علیہ السلام کے فعل قبیح سے باز رہنے میں اس جناب سے کید زنان دور کرنا شرط نہیں ہے۔ بلکہ آپ سے فعل قبیح کا صادر ہونا ممتنع اور محال ہے۔ گو کید و مکر زنان وقوع پذیر ہی کیوں نہ ہو۔

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ حضرت یوسف کی مراد اس قول سے یہ ہے۔ کہ اے خدا تو مجھ کو فاحشہ (بدفعلی) سے دور رہنے کی طرف دعوت کرتا ہے۔ اگر تو اس باب میں اپنا لطف و کرم میرے شامل حال نہ کریگا۔ اور اس کے ترک کرنے پر مجھ کو ثابت قدم نہ رکھیگا۔ تو میں اس کی طرف مائل ہو جاؤنگا۔ اور یہ سب کی طرف سے ہٹ کر اللہ تعالے کی طرف رجوع کرنا اور اپنے کاروبار کو محض اس کے سپرد کرنا ہے۔ اور اگر اللہ کی مدد نہ ہوتی۔

اور اس کا لطف و کرم آپ کے شامل حال نہ ہوتا۔ تو آپ کیدِ زناں سے نجات نہ پاتے۔ اور کلام اگرچہ بظاہر نفس کید سے متعلق ہے۔ اور آپ نے یہ فرمایا ہے۔ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَھُنَّ (اور اگر تو مجھ سے عورتوں کے کید و مکر کو دور نہ کریگا)۔ مگر مراد آپ کی اس سے یہ ہے۔ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ ضَرَرَ کَیْدِھِنَّ (کہ اگر تو مجھ سے ان کے کید و مکر کے ضرر کو دور نہ کریگا)۔ اس لئے کہ ان عورتوں نے کید کو حصول معصیت میں اپنا مددگار بنایا تھا۔ پس جب کہ آپ معصیت سے محفوظ رہے۔ اور اس سے باز رہنے میں لطف الٰہی ان کے شامل حال ہوا۔ تو کید زناں آپ سے دور رہا۔ اس لئے کہ اس (کید) کا ضرر وقوع میں نہیں آیا۔ اور اور اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اور اسی سبب سے جو شخص کسی غرض کے لئے کچھ کلام کرے۔ اور اس سے وہ غرض حاصل نہ ہو۔ اس کے باب میں کہا جاتا ہے۔ مَا قُلْتَ شَیْئًا تو نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور اس شخص کے لئے جس کا فعل موثر نہ ہو سکتے ہیں۔ مَا فَعَلْتَ شَیْئًا تو نے کچھ بھی نہ کیا۔ اور یہ بات بحمد اللہ تعالےٰ نہایت ظاہر اور روشن ہے۔

مسئلہ - اگر کوئی کہے کہ یہ کیونکر جائز ہے۔ کہ یوسف علیہ السلام حالانکہ آپ نبی مرسل ہیں۔ اپنے آپ کو قید خانے سے باہر نکالنے میں خدا کے سوا اور شخص پر اعتماد کریں۔ اور اس باب میں اس کے سوا اور کو اپنا وکیل قرار دیں۔ چنانچہ ان کا قول قرآن میں خدا نقل فرماتا ہے۔ (قَالَ لِلَّذِیْ کَانَ مَعَہٗ اُذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ) کہ یوسف علیہ السلام نے اس شخص سے جو آپ کے ساتھ قید تھا۔ فرمایا۔ میرا ذکر اپنے آقا (بادشاہ مصر) سے کرنا۔ یہاں تک کہ روایت میں آیا ہے۔ اِنَّ طُوْلَ حَبْسِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِنَّمَا کَانَ لِاَنَّہٗ عَوَّلَ عَلٰی غَیْرِ اللّٰہِ کہ یوسف علیہ السلام دیر تک قید خانے میں اس وجہ سے رہے۔ کہ آپ نے خدا کے سوا اور شخص پر بھروسہ کیا تھا۔

جواب - ہم کہینگے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قید خانے میں بھیجنا جبکہ امر قبیح اور فعل ناپسندیدہ تھا۔ اس لئے لازم تھا۔ کہ آپ اس کے دور کرنے میں ہر ایک سبب اور ذریعہ سے متوسل ہوں۔ اور جو چیز ان کے گمان میں اس قید سے چھڑانے والی ہو۔ اس پر ہاتھ ماریں۔ اور اس میں بہت سے اسباب اور ذرایع جمع ہوں۔ پس اس صورت میں ناجائز نہیں ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام رہائی زنداں کے باب میں خدا سے دعا کرنے اور اس کی طرف راغب ہونے کے باوجود ایسے شخص سے جس کی نسبت یہ گمان

ہو۔کہ وہ میرے قول کو پہنچا دیگا۔کہدیں۔کہ میرا ذکر اپنے مالک سے کرنا۔اور میری رہائی کی نسبت اس کو تنبیہ کرنا۔پس آپ کا فرمانا امر قبیح میں داخل نہیں ہے۔بلکہ امر قبیح صرف یہ ہے۔کہ آپ توکل کو چھوڑ دیتے۔اور فقط غیر خدا کی مدد پر انحصار کر لیتے۔ اور اگر آپ نے توکل اور حزم و ہشیاری دونو کو یکجا جمع کیا۔تو یہ عقل اور دین دونو کے نزدیک بہتر اور صواب ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔کہ اللہ تعالےٰ نے آپ پر اس امر کی وحی بھیجی ہو۔اور حکم دیا ہو۔کہ اس شخص سے وہ بات کہیں۔جو آیت میں مذکور ہے۔

مسئلہ۔اگر کوئی کہے۔کیا سبب ہے۔کہ پہلے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے بھائیوں سے طلب کیا۔پھر اس کو اپنے باپ کے پاس جانے سے روک لیا۔حالانکہ آپ کو معلوم تھا۔کہ حضرت یعقوبؑ کو اس کے نہ جانے سے حزن و ملال لاحق ہوگا۔اور یہ اس کے اور اس کے باپ کے لئے باعث ضرر ہے۔

جواب۔ہم کہینگے۔کہ اس کی وجہ ظاہر ہے۔اس لئے کہ حضرت یوسفؑ نے یہ جو کچھ کیا۔وحی خداوند عالم سے کیا۔اور یہ خدا کی طرف سے اس کے بندہ برگزیدہ یعقوب علیہ السلام کا امتحان اور ان کے صبر کی آزمائش تھی۔اور اس کے ذریعے ان کو ثواب عظیم کا مستحق کرنا مقصود اور مطلوب تھا۔اور اس کی نظیر وہ امتحان تھا۔جو خدا کی طرف سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا لیا گیا۔کہ اتنی مدت دراز تک یوسف علیہ السلام کی خبر تک ان سے بند کر دی گئی۔یہاں تک کہ اس غم میں روتے روتے ان کی بینائی زائل ہوگئی۔ اور یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے یہ کہا تھا۔کہ میرے بھائی کو باپ سے علیحدہ کرنے میں دروغ گوئی اور مکر و فریب سے کام نہ لیں۔بلکہ ایسی محبت اور نرمی سے درخواست کرنا کہ وہ اس کو تمہارے ساتھ اس طرف روانہ کر دیں۔

اب اگر کوئی کہے۔کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ لانے کی درخواست کی۔تو کیا اس وقت انہوں نے حضرت یوسفؑ سے یہ نہ کہا تھا۔سَنُرَاوِدُ عَنہُ اَبَاہُ (ہم اس کی بابت اپنے باپ سے درخواست کرینگے) اور مراودۃ لغت میں خدع و مکر کو کہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے۔کہ مراودۃ سے مراد وہ نہیں ہے۔جو تم نے سمجھا ہے۔بلکہ مراودۃ تلطف بتسبب اور احتیال کو کہتے ہیں۔اور یہ صدق اور کذب دونو طرح سے ہو سکتی ہے۔

اور حضرت یوسفؑ نے باحسن وجوہ اس کے عمل میں لانے کو فرمایا تھا۔ اگر انہوں نے حضرتؑ کے حکم کی مخالفت کی۔ تو اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی قابل ملامت ہوسکتے ہیں۔ نہ کہ خود حضرتؑ ✤

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ کے کیا معنی ہیں۔ حالانکہ اس سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو معرض تہمت میں ڈالا۔ پھر حضرتؑ کی طرف سے ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا۔ کہ وہ (برادران یوسف) چور ہیں۔ حالانکہ در اصل انہوں نے چوری نہ کی تھی ✤

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ سقایۃ (پیالہ) کو اپنے بھائی کے اسباب میں رکھنے سے صرف یہ غرض تھی۔ کہ اس وجہ سے ان کے چھوٹے بھائی ان کے پاس رک جائینگے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ حکم خدا سے ایسا کیا گیا ہو ✤ اور مروی ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اس کا حال پہلے ہی جتلا دیا تھا۔ تاکہ ان کے پاس رہنے کا ایک ذریعہ ہاتھ آجائے۔ پس اس روایت کی بنا پر وہ خدشہ بھی رفع ہوگیا۔ جو کہا جاتا ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کے اسباب میں پیالہ رکھ کر اس کو غم اور خوف وخطر میں مبتلا کیا ✤ اور پیالے کا ان کے اسباب میں ہونا ان کو چوری سے متہم نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اسباب میں اس کی موجودگی کے چوری کے سوا اور بہت سے سبب ہوسکتے ہیں۔ اس لئے بلا دلیل کے اس کو چوری کی طرف لے جانا ضروری اور لازم نہیں ہے۔ اور علاوہ اس کے جس نے اس کو بلا طریق ملامت چوری کی طرف پھیرا ہے۔ یہ اس کی کوتاہ نظری اور جرأت ہے۔ اور ظاہر میں بھی پیالے کا اسباب میں موجود ہونا چوری کا مقتضی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اشتراک اس میں قائم ہے۔ اور حضرتؑ کا یہ فعل تمام وجوہ محتملہ سے یکساں قریب ہے۔ یعنی سب صورتیں ممکن ہوسکتی ہیں ✤ رہا منادی کا بہ ندا کرنا کہ یہ لوگ چور ہیں۔ سو یہ ندا حضرت یوسفؑ کے حکم سے نہیں دی گئی۔ اور کیونکر وہ جناب جھوٹا حکم دے سکتے تھے۔ حالانکہ بات یہ ہے۔ کہ جب ملازمان یوسفؑ سے پیالہ گم ہوگیا۔ تو ان میں سے ایک نے آواز دی۔ اور ان کے دل میں یہ خیال گزرا۔ کہ انہی لوگوں نے پیالہ چرایا ہے ✤ اور بعض یوں بھی کہتے ہیں۔ کہ قول انهم سارقون سے مراد یہ ہے۔ کہ انہوں نے اپنے باپ سے یوسفؑ کو چرالیا۔ اور اس کو یہ خیال دلایا۔ کہ ہم یوسفؑ کی حفاظت کرینگے۔ اور اس کو ضایع کردیا ✤ اس بنا پر منادی بالکل

راست گو اور حق پر ہے *

اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ یہ ندا یوسفؑ کے حکم ہی سے دی گئی ہو۔ مگر اتنا ضرور ہے۔ کہ ظاہر قصہ اور اجزائے کلام کے اتصال سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ اس مقام پر چوری سے مراد پیالے کی چوری ہے۔ جس کا ذکر پہلے گزرا۔ اور ملازموں کو بھی اس شے کے گم ہونے کا حال معلوم ہو گیا تھا *

بعض یوں کہتے ہیں۔ کہ یہ کلام اگرچہ ظاہر میں خبر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن در اصل معنی استفہام میں ہے۔ گویا منادی نے یہ ندا دی۔ ءانکم لسارقون۔ الف استفہام یہاں سے ساقط ہو گیا۔ اور اس کی نظیریں قصہ حضرت ابراہیمؑ میں پیشتر مذکور ہوئیں * مگر یہ صورت کسی قدر ضعیف ہے۔ کیونکہ الف استفہام جس مقام سے ساقط ہوتا ہے۔ وہاں اس کے ساقط ہونے کی دلیل اس کلام میں ضرور موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ شعر

کذبتک عینک ام رأیت بواسط * غلس الظلام من الرباب خیالا

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کیا سبب ہے۔ کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ کو اپنے حال کی خبر نہ دی۔ تاکہ ان کے دل کو اطمینان ہو جاتا۔ اور ان کا غم و ہم زائل ہو جاتا۔ حالانکہ آپ کو معلوم تھا۔ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام میری جدائی کے سبب نہایت رنج اور قلق میں گرفتار اور مبتلا ہیں *

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ اس کا جواب دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ (۱) ممکن تھا کہ حضرت یوسفؑ اپنے حال سے اپنے والد ماجد کو مطلع کر دیتے۔ اور آپ اس بات پر قادر بھی تھے۔ مگر اللہ تعالے نے آپ پر وحی بھیجی۔ کہ اپنے باپ کو اپنے حال کی اطلاع مت دو۔ تاکہ ان کا رنج و محن زیادہ ہو۔ اور تا اس کے سبب وہ منازل رفیعہ اور درجات عالیہ پر فائز ہوں۔ (۲) اور یہ

ہو کو بظاہر کوئی لفظ کلام میں ایسا نہیں۔ جو حذف استفہام پر دال ہو۔ لیکن حال ضرور شاہد ہے۔ کیونکہ چوری کا موقع اور ایک شے کا گم ہونا خود استفہام و استخبار کو چاہتا ہے۔ اور ایسے وقت میں ہر ایک اس شخص سے دریافت کیا کرتے ہیں جس کی طرف گمان ہو۔ اور حرف استفہام ایسے موقع پر حذف کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے قول ھذا ربی کو امام علیہ السلام نے استفہام پر محمول کیا ہے۔ حالانکہ قرینہ مقالیہ وہاں بھی حذف استفہام پر موجود نہیں۔ لہذا اس مقام پر اگرچہ قرائن مقالیہ استفہام پر شاہد نہیں۔ لیکن قرائن حالیہ ضرور دال ہیں۔ پس اگر اس کو استفہام پر محمول کیا جائے تو بعید نہیں۔ بلکہ اس

بھی ممکن ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ کو یہ قدرت حاصل ہی نہ ہوئی تھی۔ کہ آپ اپنے پدر عالی مقدار کو اپنے حال سے خبردار کرتے۔ اس لئے آپ اس میں قاصر ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالٰے وَرَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا کے کیا معنی ہیں۔ اور یوسف علیہ السّلام کیونکر اس بات پر رضامند ہوئے۔ کہ ان کے بھائی انکو سجدہ کریں۔ حالانکہ سجدہ کرنا اللہ تعالٰی کے سوا اور کسی کیلئے سزاوار اور زیبا نہیں ہے۔

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ اس کا جواب کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔

جواب اول۔ یہ کہ اللہ تعالٰی کی مراد خَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا سے یہ نہ ہو۔ کہ انہوں نے حضرت یوسفؑ کو سجدہ کیا۔ بلکہ انہوں نے خدا کو سجدہ کیا۔ اس بات کے شکریے میں کہ اس نے ہم کو یوسفؑ سے ملایا۔ اور یہ قول بعینہ ایسا ہے۔ جیسے کوئی کہے۔ اِنَّمَا صَلَّیۡتُ لِوُصُوۡلِیۡ اِلٰی اَهۡلِیۡ وَصُمۡتُ لِشِفَائِیۡ مِنۡ مَرَضِیۡ (میں نے اپنے اہل وعیال سے ملنے کے سبب نماز پڑھی۔ اور میں نے اپنی بیماری سے تندرست ہونے کے سبب روزہ رکھا)۔ **اب اگر کوئی** کہے۔ کہ قولہ تعالٰے یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا۔ اس تاویل کو فاسد کرتا ہے۔ **تو ہم اس کا جواب** یہ دینگے۔ کہ یہ تاویل مانع نہیں ہے۔ کہ یہ حالت سجود فی المعنی نہ فی الظاہر رویائے سابقہ کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ جب یوسف علیہ السّلام نے ستاروں اور چاند اور سورج کو خواب میں دیکھا۔ کہ مجھ کو سجدہ کرتے ہیں۔ تو اس کی تعبیر یہ تھی۔ کہ وہ منازل رفیعہ اور درجات عالیہ پر فائز ہونگے۔ اور اپنی آرزوؤں اور امیدوں میں کامیابی حاصل کرینگے۔ پس جب حضرت یوسفؑ اپنے والدین سے ملاقی ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے فرزند ارجمند کو درجہ عالی پر سرفراز دیکھا۔ اور حضرت یوسفؑ جو مدت سے اس بات کے متمنی اور آرزومند تھے۔ کہ خدا پھر ہماری متفرق جماعت اور پراگندہ طاقت کو ایک جا جمع کرے۔ ان کی تمنا خدا نے پوری کی۔ اس وقت انہوں نے سمجھا۔ کہ یہ سب کچھ میرے اس خواب کی تصدیق ہے۔ جو پیشتر میں نے دیکھا تھا۔ تب حضرتؑ نے فرمایا۔ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ (یعنی یہ میرے اس خواب کی تاویل ہے۔ جو میں نے پہلے دیکھا تھا) پس جو شخص اس بات کا قائل ہے۔ کہ برادران یوسفؑ نے درحقیقت یوسفؑ کو سجدہ کیا۔ اس کے لئے ضرور ہے۔ کہ وہ اس واقعہ کو معناً اس خواب گزشتہ کا مطابق

(بقیہ نوٹ) موقع پر دو وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

قرار دے۔ نہ کہ ظاہری طور پر۔ اسلئے کہ حضرت یوسفؑ نے خواب میں یہ نہ دیکھا تھا۔ کہ اس کے بھائیوں اور والدین نے اس کو سجدہ کیا۔ اور نہ بیداری میں یہ دیکھا۔ کہ ستارے اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ پس یہ صحیح ہوا۔ کہ یہ واقعہ معنی میں اس خواب کے مطابق ہے۔ نہ کہ صورت میں +

جواب دوم۔ یہ کہ سجدہ اللہ تعالےٰ کے لئے تھا۔ نہ کہ یوسف علیہ السلام کے واسطے۔ صرف یہ بات تھی۔ کہ وہ سجدہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منہ کر کے کیا گیا تھا جیسا کہ بول چال میں ہے۔ صلّےٰ فلانٌ الی القبلۃ و للقبلۃ (فلاں نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔ اس فقرے میں لام اور الےٰ دونو **طرف** کے معنی دیتے ہیں) اور یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کو معظّم و مکرّم ہونے سے خارج نہیں کرتی۔ دیکھو۔ قبلہ سب کے نزدیک معظم اور مکرم ہے۔ گو اس کی طرف منہ کر کے خدا کو سجدہ کیا جاتا ہے +

جواب سوم۔ یہ کہ محض سجدہ عبادت میں داخل نہیں۔ جب تک کہ اس کے ساتھ وہ افعال شامل نہ کئے جائیں۔ کہ جو عبادت ہیں۔ پس ممکن ہے۔ کہ برادران یوسف علیہ السلام نے بطور تحیت اور تعظیم و تکریم کے حضرت یوسفؑ کو سجدہ کیا ہو۔ اور یہ ناپسندیدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ بطور عبادت کے جو خداوند قدیم و متعال کے لئے مخصوص ہے۔ وقوع میں نہیں آیا +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کے کیا معنی ہیں۔ جس کو خدا قرآن میں حکایۃً ذکر فرماتا ہے۔ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ (بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے مابین دشمنی ڈلوادی)۔ اس آیت کا منشا یہ ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے (معاذ اللہ) شیطان کی اطاعت کی۔ اور اس کے کہد خفیہ نے اس جناب میں اثر کیا +

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ سائل نے جو نزغ شیطان کی اضافت حضرت یوسفؑ کی طرف کی ہے۔ وہ آیت بالا سے مفہوم نہیں ہوتی۔ بلکہ نزغ اور قبیح برادران یوسفؑ کی طرف سے حضرت یوسفؑ کے ساتھ وقوع میں آئی۔ نہ کہ حضرتؑ کی طرف سے بھائیوں کے ساتھ ایسا سلوک ہوا۔ اور یہ قول بعینہ ایسا ہے۔ جیسا کہ کوئی کہے۔ جری بینی و بین فلانٍ شرٌ (مجھ میں اور فلاں شخص میں بدسلوکی ہوئی)۔ اگرچہ بدی ایک طرف سے ہو۔ اور دونو اس میں شریک نہ ہوں +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اس قول یوسفؑ کے کیا معنی ہیں۔ جو آپ نے عزیز مصر سے فرمایا۔ اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (مجھ کو زمین کے خزانوں پہ مقرر کر دے اس لئے کہ میں محافظ اور خبردار ہوں)۔ اور یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ حضرتؑ نے ظالم سے ولایت طلب کی ✦

جواب۔ ہم جواب میں کہتے ہیں۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خزائن زمین پہ متمکن ہونے کی درخواست صرف اس وجہ سے کی تھی۔ تاکہ عدل و انصاف سے ان میں حکم جاری کریں۔ اور ان خزائن کو حق داروں کو پہنچائیں۔ اور یہ بات آپ کو بلا ولایت کے بھی حاصل تھی۔ اور ولایت کی درخواست صرف اس لئے کی تھی۔ تاکہ آپ کو اس حق پہ تمکن اور مقدرت حاصل ہو۔ جس کا کرنا ان پر لازم تھا۔ اور جس شخص کو اقامت حق اور امر بالمعروف کی مقدرت حاصل نہ تھی۔ وہ آپ کا ذریعہ اور وسیلہ حاصل کرے۔ اور آپ کے فعل سے متوصل ہو جائے۔ پس اس امر میں حضرت یوسف علیہ السلام پر کسی قسم کی ملامت اور جرح لازم نہیں آتا ✦

تنزیہ ایوب علیہ السلام کا بیان

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ تم ان امراض اور محن کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ جو پیغمبر خدا حضرت ایوب علیہ السلام کو لاحق ہوئے۔ آیا قرآن سے یہ ثابت نہیں ہے۔ کہ یہ امراض و محن اس گناہ کا عوض تھے۔ جو ان کے قول اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطَانُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (مجھ کو شیطان نے سختی اور عذاب میں مبتلا کیا ہے) سے جو قرآن میں منقول ہے۔ ثابت ہے۔ اور عذاب بطور جزا اور سزا کے ہوا کرتا ہے۔ جیسا کہ ان عقاب اور آلام کو جو بسبیل امتحان ہوں۔ عذاب اور عقاب نہیں کہا جاتا ✦ آیا تمام مفسروں نے روایت نہیں کیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بلا میں محض اس لئے مبتلا کیا تھا۔ کہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی منکر کو ترک کر دیا تھا۔ اور یہ قصہ نہایت مشہور ہے۔ جس کی شرح طول کا باعث ہے ✦

جواب۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ ظاہر قرآن اس امر پر دلالت نہیں کرتا ہے۔ کہ حضرت ایوبؑ پر جو بلائیں اور تکلیفیں وارد ہوئی ہیں۔ وہ بطور عقاب الٰہی کے تھیں۔ اور ظاہر آیت سے کوئی ایسی بات ثابت نہیں۔ جیسا کہ سائل کا گمان ہے۔ اس لئے کہ خدا فرماتا ہے۔ وَاذْکُرْ

عَبْدَنَا اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ۔ اور نصب کے معنی تعب کے ہیں۔ اور نصب لغت میں دو طرح آیا ہے۔ بفتح نون وصاد اور بضم نون وسکون صاد۔ اور تعب اُس مضرت کو کہتے ہیں۔ جو عقاب سے مخصوص نہیں ہے۔ اور کبھی امتحان اور آزمایش کے طور پر بھی ہوا کرتا ہے۔ اور عذاب بھی مقام مضرت میں مستعمل ہوتا ہے۔ جس کا اطلاق کسی جہتِ خاص سے مخصوص نہیں ہے۔ اسی لئے ظالم اور ظلم کی ابتدا کرنیوالے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اِنَّہٗ مُعَذِّبٌ وَمُضِرٌّ مُؤْلِمٌ۔ کہ وہ عذاب دینے والا اور ضرر رساں اور الم دینے والا ہے۔ اور کبھی مجازاً کہتے ہیں۔ کہ وہ معاقب یعنی عقاب دینے والا ہے۔ اور لفظ عذاب لفظ عقاب کا قائم مقام نہیں ہے۔ اس لئے کہ لفظ عقاب بظاہر جزا کا مقتضی ہے۔ کیونکہ وہ تعقیب اور معاقبۃ سے ہے۔ اور لفظ عذاب ایسا نہیں ہے۔ اب رہا اس آیت میں لفظ عذاب کا شیطان کی طرف مضاف ہونا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اس سے جناب کی آزمائش کی ہے۔ سو اس کے لئے وجہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ مرض اور سقم کو شیطان کی طرف مضاف نہیں کیا۔ بلکہ فقط ان افعال شیطانی کو اس کی طرف مضاف کیا ہے۔ جس سے حضرتؑ کو تکلیف پہنچی تھی۔ اور وہ وسوسہ ڈال کر حضرتؑ کو ضرر پہنچاتا تھا۔ اور پہلی نعمتیں اور آرام اور خوشحالی یاد دلا کر رنج وتعب میں ڈالتا تھا۔ اور ان بلیات اور تکالیف میں جو حضرتؑ پر امتحاناً نازل ہوئی تھیں۔ بیقراری اور الحاح وزاری کی طرف دعوت کر کے زحمت دیتا تھا۔ نیز ان کی قوم کے دلوں میں وسوسے ڈالتا تھا۔ کہ ان کو گندہ جانکر ان سے کنارہ کشی کریں۔ اور امراض شنیعہ کے سبب جن کا دیکھنا ناگوار تھا۔ ان کا استخفاف کریں۔ اور حقیر جانیں۔ اور اپنی قوم میں سے ان کو نکال دیں۔ اور یہ سب ضرر اور نقصان تھے۔ جو ابلیس ملعون کی طرف سے حضرت ایوبؑ کو پہنچتے تھے۔ اور روایت ہے۔ کہ ان کی بیوی لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کی خدمت گزاری کیا کرتی تھی۔ اور کھانے پینے کا سامان حضرتؑ کے لئے لایا کرتی تھی۔ اور شیطان ملعون ان لوگوں کو بہکاتا تھا۔ کہ ایوب علیہ السلام کی بیماری متعدی ہے۔ اور ان میں سرایت کر جائیگی۔ ان کی زوجہ سے خدمت نہ لینی چاہئے۔ اس لئے کہ وہ ایوبؑ کے زخموں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ اور ان کے جسم کو مس کرتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اس صورت میں حضرتؑ کے لئے نہایت ضرر اور نقصان متصور تھا۔

رہی وہ آیت جو سورۂ انبیاء میں ہے۔ وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ وَکَشَفْنَا مَا بِہٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰہُ اَھْلَہٗ وَمِثْلَھُمْ مَّعَھُمْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِکْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ (اور ایوبؑ نے جب اپنے پروردگار کو ندا دی۔ کہ مجھ کو سختی پہنچی۔ اور تو ارحم الراحمین ہے۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی۔ اور اس کی سختی کو دور کر دیا۔ اور اس کا اہل و عیال اس کو عطا کیا۔ اور اپنی رحمت سے اتنا ہی اور عنایت فرمایا۔ اور یہ نصیحت ہے عابدوں کے لئے)۔ سو اس آیت کے ظاہر معنی بھی اس امر کے مقتضی نہیں ہیں۔ جس کو سائل نے اپنے سوال میں ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ ضُرّ ضرر کو کہتے ہیں۔ جو کبھی امتحان اور محنت کے طور پر پہنچا کرتا ہے۔ جیسا کہ کبھی بطور عقوبت کے بھی پہنچتا ہے۔

رہی وہ روایت جو بعض جاہل مفسروں سے اس باب میں مروی ہے۔ وہ قابل التفات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ اپنے پروردگار بزرگ و برتر اور اس کے رسولوں اور پیغمبروں کی طرف ہر ایک برائی اور عیب کو منسوب کیا کرتے ہیں۔ اور ہر گناہ سے انکو متہم کرتے ہیں۔ اور اس ہیچ اور پوچ روایت میں جب صاحبان غور و فکر نگاہ تامل و بصیرت سے غور کرینگے۔ تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ یہ روایت وضعی ہے۔ اور سراسر باطل اور بناوٹی ہے اس لئے کہ وہ روایت کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ابلیس ملعون کو ایوب علیہ السّلام کے مال اور بھیڑ بکریوں اور ان کے اہل و عیال پر متسلط کیا۔ جب اس نے ان کو ہلاک اور برباد کر دیا۔ اور ایوب علیہ السلام نے مال اور عیال و اطفال کی تباہی اور بربادی پر صبر کیا۔ تو ابلیس نے بارگاہ ایزدی میں عرض کی اے پروردگار ایوبؑ نے جان لیا ہے۔ کہ تو مال اور عیال پھر اس کو عطا کر دیگا۔ اس لئے اس نے صبر کر لیا ہے۔ اب تو مجھ کو اس کے جسم پر مسلط کر۔ تب پروردگار نے فرمایا۔ میں نے تجھ کو اس کے سارے جسم پر سوائے دل اور آنکھ کے مسلّط کیا۔ مروی ہے۔ کہ ابلیس ایوب علیہ السّلام کے پاس آیا۔ اور سر سے پاؤں تک پھونک ماری۔ فوراً سارا جسم سر تا پا ایک گھاؤ بن گیا۔ تب آپ کو بنی اسرائیل کی کوڑی (گھورا) پر پھینک دیا گیا۔ اور سات برس اور چند مہینے تک وہیں پڑے رہے۔ کہ آپ کے جسم میں کیڑے چلتے پھرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جس کی تفصیل کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔ الغرض جس شخص کی عقل ایسے کفر اور جہل کو قبول کرتی ہے۔ اس کی روایت

اہل فطنت و خبرت اور صاحبان بصیرت کے نزدیک کب معتبر اور قابل قبول ہو سکتی ہے۔ اور جو شخص یہ بھی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ابلیس کو اپنی مخلوق پر مسلط نہیں کرتا۔ اور ابلیس کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ جسم کو گھائل کر سکے۔ اور امراض کو پیدا کر سکے۔ اس کی روایت کیونکر معتمد اور معتبر ہو سکتی ہے +

اور جو امراض ہولناک ایوب علیہ السلام کو لاحق ہوئے۔ وہ محض امتحان اور آزمایش کی بنا پر اور اس غرض سے تھے کہ ان پر صبر کرنے سے ان کو بیشمار اجر و ثواب ملیگا۔ اور دنیا اور آخرت میں ان کے مقابلے میں نہایت بے بہا اور نفیس عوض دیا جائیگا۔ اور یہ سُنّتِ الٰہی اس کے اصفیاء اور اولیاء کے باب میں جاری ہے +

اور جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔ کہ کسی نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ آدمیوں میں سب سے سخت بلا کس پر پڑتی ہے۔ فرمایا۔ اول انبیاء پر۔ پھر صالحین اور نیکوکاروں پر۔ بعد ازاں درجہ بدرجہ اور لوگوں پر باعتبار ان کے مراتب کے۔ **الغرض** حضرت ایوب علیہ السلام نے ان بلیات عظیمہ اور مصائب شدیدہ میں ایسا صبر و تحمل کیا کہ آپ کا صبر و سکون آج تک ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ روایت ہے کہ آپ ان تمام مصیبتوں میں صبر اور شکر کرتے رہے۔ اور ان کے فوائد اور منافع کو بیان کیا کرتے تھے۔ اور کبھی کسی قسم کا شکوہ اور بیقراری اور الحاح و زاری آپ کی زبان سے کسی نے نہیں سُنی پس اللہ تعالیٰ نے اس صبر و شکر کے عوض میں آخرت کی دائمی اور عظیم نعمتوں کے علاوہ دنیا میں آپ کا مال اور عیال پھر ان کو عطا فرمایا۔ بلکہ دو چند عنایت کیا۔ چنانچہ خدا قرآن میں اس کا ذکر فرماتا ہے۔ وَاٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ (اور ہم نے اس کو اس کے اہل و عیال عطا کئے۔ اور اتنا ہی اور اضافہ فرمایا) اور سورۂ ص میں فرماتا ہے۔ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ + پھر اپنے دست قدرت سے اسکی بیماریوں کو مسح کیا۔ اور ان کو شفا عنایت فرمائی۔ اور ان کو حکم دیا۔ جیسا کہ مروی ہے۔ کہ اپنے پاؤں کو زمین پر رگڑو۔ پس آپ کے لئے ایک چشمہ ظاہر ہوا۔ اور اس میں آپ نے غسل کیا۔ اور جو بیماریاں حضرتؑ کے جسم میں تھیں۔ غسل کرتے سب رفع دفع ہو گئیں۔ **چنانچہ** خدا قرآن میں فرماتا ہے۔ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارو۔ یہ ٹھنڈا پانی نہانے اور پینے کے قابل ہے)۔ اور رکض

زبان عرب میں تحریک کو کہتے ہیں چنانچہ اہل زبان کہتے ہیں۔ دکضت الدّابۃ یعنی میں نے چارپائے کو چلایا۔

سوال۔ اگر کوئی کہے کہ تمہارے نزدیک یہ روایت صحیح ہے۔ کہ حضرت ایوبؑ کو جذام کا عارضہ ہو گیا تھا۔ یہانتک کہ ان کے اعضا گر گئے تھے۔

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ وہ بیماریاں جن سے دیکھنے والا نفرت کرے۔ اور اس کو اس کے دیکھنے سے وحشت ہو۔ جیسے جذام اور برص۔ ان امراض کا ہونا انبیاء علیہم السّلام کے لئے جائز نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ ابتدائے کتاب میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کیونکہ نفرت کرنا محض امور قبیحہ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ کبھی امر حسن اور قبیح دونو سے ہو جاتی ہے۔ اور اس امر کا کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا۔ کہ حضرت ایوبؑ کی بیماریاں اور درد دکھ اور جسمانی اور مالی اور اہل و عیال کی تکالیف اس سخت درجہ کو پہنچ گئی تھیں۔ جس سے غم و الم میں وہ زیادتی ہو گئی تھی۔ جیسی مجذوم کو ہوتی ہے۔ اور ایوب علیہ السّلام کے غم و الم کی زیادتی میں کسی کو محل انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں اس بات کا انکار ضرور کیا جائیگا۔ کہ ان کی بیماری قابل نفرت تھی۔

اور اگر کوئی کہے۔ کہ تمہارا اس باب میں کیا قول ہے۔ کہ حضرت ایوب علیہ السّلام جو اس بلا میں مبتلا ہوئے۔ آیا یہ بغرض ثواب تھا۔ یا عوض لینا مطلوب تھا۔ یا دونو غرضیں مدنظر تھیں۔ اور کیا یہ جائز ہے۔ کہ جو مصلحت الٰہی اور لطف خداوندی اس رنج والام میں متصور ہے۔ وہ اور صورت میں بھی ہو جس میں کسی قسم کا رنج و الم ان کے لاحق حال نہ ہوتا۔ ممکن ہو سکتا تھا۔ یا تم اس کو ناممکن اور ممتنع جانتے ہو۔

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ وہ آلام جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندوں کو پہنچتے ہیں۔ اور عقوبت کے طور پر نہ ہوں۔ تو جائز نہیں ہے۔ کہ ان آلام کے پہنچانے میں خدا کی غرض عوض ہو۔ کیونکہ وہ اس امر پر قادر ہے۔ کہ مثل عوض ابتدا کرے۔ بلکہ ان رنج و آلام کے پہنچانے سے اصل غرض مصلحت اور ثواب کا مستحق کرنا ہے۔ پس عوض تابع ہے۔ اور مصلحت اصل ہے۔ اور خدا اپنے بندے کے لئے عوض مقرر کرنے کے سبب ظلم کرنے سے بری رہا۔ اور بوجہ موجود ہونے غرض کے یہ فعل عبث ہونے سے خارج ہوا۔

پس الم پہنچانے میں جب کہ مصلحت اور لطف ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ جو چیز مصلحت اور لطف میں الم کے قایمقام ہو۔ اور الم نہ ہو۔ تو وہ یا تو لذت ہوگی۔ یا ایسی چیز ہوگی۔ جو نہ الم ہو۔ اور نہ لذت + اس باب میں بعض لوگوں کا قول یہ ہے۔ کہ الم اس مقام میں بھلا نہیں لگتا۔ بلکہ اس حالت میں مستحسن ہوسکتا ہے۔ جب کہ مصلحت میں غیر الم اس کا قائم مقام نہ ہوسکے۔ مگر صحیح قول یہی ہے۔ کہ وہ مستحسن ہے + اور اللہ تعالے الم اور غیر الم کے پہنچانے میں مختار ہے۔ اور ہمارے اس قول کی صحت کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر وہ اس صورت میں قبیح ہو۔ تو دو حال سے خالی نہیں۔ کہ یا تو ظلم ہونے کی صورت میں قبیح ہوسکتا ہے۔ یا فعل عبث ہونے کی حالت میں۔ اور یہ بھی معلوم ہے۔ کہ وہ ظلم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کے بدلے میں جو نہایت عظیم اور جلیل عوض ملتا ہے۔ اس کو ظلم ہونے سے خارج کرتا ہے۔ نیز عبث بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ عبث وہ فعل ہوتا ہے جس میں کوئی غرض مدنظر نہ ہو۔ یا اس میں ویسی ہی کوئی غرض نہ ہو۔ اور اس الم کے پہنچانے میں نہایت عظیم اور جلیل غرض مدنظر رکھی گئی ہے۔ اور وہ غرض وہی ہے۔ جس کا بیان اوپر گزرا۔ اور اگر یہ عوض ناکافی ہو۔ اور اس کو فعل عبث ہونے سے خارج نہ کرے۔ تو بھی اس صورت میں فعل عبث نہ ہوگا۔ جب کہ وہاں کوئی چیز ایسی نہ ہو۔ جو اس کے قایمقام ہوسکے۔ اور یہ قول درست ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ وہ یہ کہیں۔ کہ وہ قبیح اور عبث ہے۔ اس لئے کہ وہاں وہ چیز موجود ہے۔ جس کے ہوتے اس (الم) کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دونو فعل خواہ دونو الم ہوں۔ یا دونو لذت۔ یا نہ الم ہوں اور نہ لذت۔ یا ایسے افعال جو حصول مصلحت میں یکساں ہوں۔ دونوں میں سے ہر ایک کا کرنا قبیح ہوگا۔ اس لئے کہ جس علت کا دعوے کیا گیا ہے۔ وہ حاصل ہے + اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ الم کا پہنچانا اس وقت قبیح ہے۔ جب کہ اس میں ویسی ہی مصلحت ہو۔ جیسی لذت میں حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ جو چیز الم نہیں ہے۔ وہ الم سے مستغنی کرتی ہے + اس قول کی نادرستی اس بات سے ظاہر ہے۔ کہ عوض جو الم کے مقابلہ میں ملتا ہے۔ وہ اس کو ضرر ہونے سے خارج کرتا ہے۔ اور نفع ہونے میں داخل کرتا ہے۔ اور کم سے کم اس کو غیر ضرر کا قایمقام تو ضرور ثابت کر دیتا ہے۔ الغرض یہ نتیجہ نکلا۔ کہ الم بالعوض غیر الم کے مساوی ضرور ہے۔ اور اس میں مصلحت الٰہی کی غرض ویسی ہی حاصل ہوتی ہے۔ جیسی غیر الم

میں۔ پس ضرور یہ کہنا واجب ہوا کہ اللہ تعالے باب استصلاح میں الم و غیر الم دونوں میں مختار ہے۔ (جو چاہے۔ سو کرے)*

اگر کوئی کہے۔ کہ تم اس بات کے تو قائل ہو۔ کہ دو نوا مروں یعنی الم بالعوض اور غیر الم میں کچھ فرق نہیں ہے۔ لیکن لذت محض لذت ہونے کی وجہ سے مستحسن اور خوب ہے۔ اور فعل حسن ہونے میں کسی امر زائد کی محتاج نہیں ہے۔ اور الم کا یہ حال نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تنہا فعل حسن نہیں ہے۔ بلکہ اس کو فعل حسن کرنے کے لئے امر زائد کی ضرورت ہے*

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ یہ فرق جو لذت اور الم میں معترض نے بیان کیا۔ وہ اس مقام میں نہیں ہے۔ جہاں ہم نے ان کو جمع کیا ہے۔ اس لئے کہ ہماری غرض ان کی مساوات سے اس وقت ہے۔ جبکہ ان دونوں سے ہر ایک میں یکساں مصلحت ہو۔ اور باب استصلاح میں ان میں سے ہر ایک کی تخییر کی صحت کا حکم دیا جائے۔ گو ہم اس بات کا کبھی انکار نہیں کرتے۔ کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ کہ ایک تو نفع ہے۔ کہ اس سے ابتدا جائز ہے۔ اور اس سے شکر کا استحقاق حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسرے میں یہ بات نہیں۔ مگر یہ صورت گو الم میں نہیں ہے۔ پر اس سے اس کا قبیح ہونا اور فعل لذت کا واجب ہونا لازم نہیں آتا۔ دیکھو کبھی ایسا فعل جو نہ الم ہے نہ لذت۔ مصلحت میں لذت کے مساوی ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو باب استصلاح میں اختیار ہے۔ دونوں میں سے جس کی چاہے۔ بندے کو تکلیف دے۔ اگرچہ جائز ہے۔ اور بھلا لگتا ہے۔ کہ محض لذت کو بلا غرض زائد کے کام میں لائے۔ اور دوسرا فعل (الم) جس کو ہم نے اس کے مقابلہ میں قرار دیا ہے تنہا بھلا نہیں لگتا۔ ہاں غرض زائد کے سبب اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں ان دونوں کا باہمی اختلاف ان کو اس حکمی مساوات سے جس کو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ خارج نہیں کرتا۔ اور جب کہ لذت در باب استصلاح مذکورہ بالا تخییر کے حکم میں غیر لذت سے مساوی ہے۔ اور ہم نے بیان کر دیا ہے۔ کہ عوض نے الم کو ضرر ہونے سے خارج کر دیا ہے۔ اور اس کو بمنزلہ غیر الم کے قرار دیا ہے۔ تو اس سے ہمارے بیان کی صحت ظاہر ہو گئی۔ اس لئے کہ لذت اور وہ چیز جو نہ لذت ہے نہ الم۔ ان دونوں کے

یابین تنخیر بھی حسن ہے جبکہ یہ دونو مصلحتیں مجتمع ہوں۔ پس اسی طرح لذت اور اس چیز میں (جو قائمقام غیر الم و غیر ضرر ہے۔ یعنی وہ الم جس کے مقابل بہت سے منافع ہوں) بھی تنخیر پسندیدہ ہے۔ اور اس کے بعد اس شخص کا قول رہتا ہے۔ جو فعل لذت کو اس کے نفع ہونے کے سبب واجب کرتا ہے۔ اور یہ مذہب بدیہی البطلان ہے۔ کہ ہم کو اس جگہ اس کی بابت بحث کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے۔ کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ استصلاح (طلب اصلاح) الم سے اسی وقت ہوتی ہے جب کہ وہاں وہ چیز پائی جائے جس سے اصلاح ہو سکے۔ اور وہ الم فعل قبیح اور عبث ہونے میں اس شخص کا قائمقام نہ ہو۔ جو مال کو اس شخص کے لئے صرف کرتا ہے۔ جو اس کے کوڑوں کی ضرب کا متحمل ہوتا ہے۔ اور اس شخص کی غرض مال کے پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو عبث اور قبیح ہے۔

جواب ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ تم نے جو قبیح ہونے کی صورت بیان کی ہے۔ وہ درست نہیں ہے۔ بلکہ اس میں قبیح ہونے کی صورت اس کے سوا ہے۔ جو تم نے گمان کی ہے۔ اس لئے کہ وہاں غرض کا قائمقام موجود ہے۔ اس لئے کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ کہ اگر یہی صورت قبیح ہونے کی ہو۔ تو ہر فعل جس کی غرض کی قائمقام غیر شے ہو سکے عبث اور قبیح ہوگا۔ حالانکہ ہم کو اس کے خلاف کا یقین ہے۔ اور مال کا صرف کرنا اس شخص کے لئے جو کوڑوں کی ضرب سہتا ہے۔ اس وجہ سے قبیح ہے۔ کہ وہ مارنے کی تکلیف دینے کے بغیر ابتدا ہی مال عطا کر سکتا ہے۔ اس کو مال پہنچانے کی غرض اس طرح پسندیدہ ہو سکتی ہے۔ جو امر حسن اور پسندیدہ فعل ہے۔ اس وجہ سے عبث اور قبیح ہے۔ اور ایسی صورت الم میں ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب کہ اس کے مقابل میں غیر الم موجود ہے۔ اس لئے کہ اس میں جو غرض ہے۔ اس سے ابتدا کرنا ممکن نہیں ہے۔

بیان تنزیہ حضرت شعیب علیہ السلام

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالے وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ۔ جو حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی قرآن میں منقول ہے اس کے کیا معنی ہیں۔ اس لئے کہ ایک چیز اپنے نفس پر معطوف نہیں ہوتی۔ علے الخصوص اس حرف کے ساتھ جو تراخی اور مہلت کا

مقتضی ہے۔ اور وہ حرف ثُمَّ ہے۔ جبکہ استغفار اور توبہ ایک ہی چیز ہیں پس اس کلام کی وجہ بیان کی جائے +

جواب ۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ اس آیت کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں +

صورت اول ۔ یہ کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ تم مغفرت کو اپنی غرض اور اپنا مقصد مقرر کرو جس کو تم چاہتے ہو۔ اور جس کی طرف تم متوجہ ہو۔ پھر توبہ سے اس کو حاصل کرو + او مغفرت طلب میں اول ہے۔ اور سبب میں آخر ہے +

صورت دوم ۔ یہ کہ ممکن ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ کا استغفروا ربکم سے یہ مقصود ہو کہ تم اپنے پروردگار سے یہ سوال کرو۔ کہ تم کو مغفرت کی توفیق دے۔ اور اس میں تمہاری مدد کرے۔ بعد ازاں اس کی طرف توبہ کرو۔ یا رجوع کرو + وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ توفیق کی درخواست کا توبہ سے مقدم ہونا مناسب ہے +

صورت سوم ۔ یہ کہ ثمّ واو کے معنی میں ہو۔ اور آیت کے معنی یہ ہوں۔ کہ تم اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو۔ اور اس کی طرف رجوع کرو + اور یہ دو نو حرف ثمّ اور واو کبھی ہم معنی ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسری کی جگہ مستعمل ہوتا ہے +

صورت چہارم ۔ یہ کہ استغفروا سے مراد یہ ہو۔ کہ قولاً اور نطقاً اس سے استغفار کرو۔ پھر اس کی طرف توبہ کرو۔ تاکہ توبہ سے اس چیز کے فاعل بن جاؤ۔ جو عقاب کو ساقط کر دے۔ اور صرف قول ہی پر اکتفا نہ کرو۔ جس سے سقوط عقاب باعتماد کلّی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قولاً او فعلاً دونو طرح سے بخشش طلب کرو +

صورت پنجم ۔ یہ کہ حضرت شعیبؑ نے مشرکین قوم کو اللہ تعالےٰ کی طرف مخاطب کیا ہے۔ اور ان سے فرمایا اے مشرکو شرک کو چھوڑ کر خدا سے مغفرت طلب کرو۔ پھر اسکی طرف توبہ کرو یعنی طاعات اور افعال خیر کے ذریعہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ طاعات اور افعال خیر کے ذریعہ اللہ تعالےٰ سے جبھی نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ جبکہ پہلے شرک سے استغفار کی جائے۔ اور اس کو ترک کر دیا جائے۔ اور تائب۔ آئب۔ نائب اور منیب سب ہم معنی ہیں +

صورت ششم ۔ وہ ہے۔ جس کی طرف ابوجبائی نے اس آیت کی تفسیر میں

اشارہ کیا ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ کی مراد استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ سے یہ ہے۔ کہ اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو۔ اور اس کی طرف توبہ کرنے پر قائم رہو۔ اس لئے کہ اللہ کی طرف توبہ کرنے والے شخص کے لئے واجب ہے۔ کہ پہلی توبہ کے بعد جس وقت اپنے گناہوں کو یاد کرے۔ ان سے توبہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے واجب ہے۔ کہ وہ ہر وقت اپنے گناہوں پر نادم اور پشیمان ہے۔ اور یہ عزم رکھے۔ کہ پھر ان گناہوں کی طرف رجوع نہ کرونگا۔ اس لئے کہ اگر اس عزم کو فسخ کردے۔ تو پھر اس گناہ پر عود کرنے کا عازم ہوگا۔ اور یہ جائز نہیں ہے۔ ایسا ہی اگر عزم کو فسخ کردے۔ تو معصیت پر رضامند اور مسرور ہوگا۔ اور یہ جائز نہیں ہے۔ ابو علی کے الفاظ یہی ہیں۔ اور اس صورت میں اس کی مراد تکرار اور تاکید کرنا اور توبہ کے بعد توبہ کا حکم دینا ہے۔ جیسا کہ ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے۔ اِضْرِبْ زَیْدًا ثُمَّ اِضْرِبْہ۔ وَافْعَلْ ھٰذَا ثُمَّ اِفْعَلْہ (زید کو مار۔ پھر اسکو مار۔ اور یہ کام کر۔ اور اس کام کو کر) اور ابو علی کا یہ قول جو ہم نے ذکر کیا۔ اس قول سے بہتر ہے۔ جو اس نے اس سورۃ کی ابتدا میں ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس مقام میں کہتا ہے۔ وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْہِ کے معنی یہ ہیں۔ کہ تم اپنے گزشتہ گناہوں سے اپنے پروردگار کے سامنے استغفار کرو۔ پھر بعد ازاں ہر گناہ اور معصیت سے جو تم سے سرزد ہو۔ اس کی طرف توبہ کرو۔ اور یہ محض لوچ اور بیکار ہے۔ کیونکہ استغفار کو جو آیت میں مذکور ہے۔ جب توبہ پر محمول کیا جائے۔ تو پھر اس کو صرف گزشتہ گناہوں سے مخصوص کرنا کیا معنی۔ اس لئے کہ توبہ تمام ہی گناہوں سے واجب ہے۔ خواہ گزشتہ ہوں۔ یا آئندہ۔ نیز ثم توبوا الیہ کو صرف گناہان آئندہ سے مخصوص کرنا بھی بے معنی ہے۔ اس لئے کہ گناہان گزشتہ و آئندہ سب ہی سے توبہ کرنا واجب ہے۔ الغرض ابو علی کا جو قول ہم نے اول ذکر کیا ہے۔ وہ ہی عمدہ اور بہتر ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی کے قول کے جواب سے عدول کیا۔ جب کہ اس نے باپ سے کہا۔ یَا اَبَتِ اسْتَاْجِرْہُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (اے میرے باپ اس شخص کو نوکر رکھ لو۔ کیونکہ قوی اور امین نوکر اچھا ہوتا ہے)۔ اور باپ نے اس کو جواب نہ دیا۔ بلکہ موسےؑ سے کہا۔ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ ھَاتَیْنِ عَلٰی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ (میرا ارادہ ہے۔ کہ

اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ تمہارا نکاح کردوں۔ اس مہر پر کہ آٹھ برس میری خدمت کرو) حالانکہ لڑکی نے نکاح کا سوال نہیں کیا تھا۔ اور یہ بات اس نے پیش نہیں کی تھی۔ مگر حضرت شعیبؑ نے اس کی بات کا تو اس کو جواب رد دیا۔ اور ایسی چیز کو بیان کیا۔ جو اس کے سوال کا مدعا نہ تھا۔

جواب ۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ جب بیٹی نے اپنے باپ سے درخواست کی۔ کہ موسےٰ کو نوکر رکھو۔ اور اس کی قوت اور امانت داری کی تعریف کی۔ تو اس کا کلام اس پر دال تھا۔ کہ اس کو موسےٰ علیہ السّلام کی طرف رغبت ہے۔ اور وہ اس کا قرب چاہتی ہے۔ اور اس کی مدح اس طور پر کی ہے۔ جس سے نکاح کرنے کی خواہش مفہوم ہوتی ہے اس لئے حضرت شعیب علیہ السّلام نے موسےٰ علیہ السّلام سے کہدیا۔ کہ میں تجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ جو نہایت درجہ خصوصیت کا باعث ہے۔ غرض جو کچھ حضرت شعیبؑ نے کیا۔ وہ ان کی دختر کے جواب کے نہایت ہی مطابق اور عین اس کے سوال کے مدعا کے موافق ہے۔

مسئلہ ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قول حضرت شعیبؑ کے کیا معنی ہیں۔ جس کی نقل قرآن میں خدا یوں فرماتا ہے۔ اِنِّیٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۔ اور صداق زناں میں ایسا اختیار دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے اور اس شرط سے جو شعیبؑ نے اپنے نفس کے لئے کی۔ اس سے ان کی بیٹی کو کیا فائدہ ہوا۔ آیا اس سے کچھ نفع بیٹی کی طرف بھی عود کرتا ہے یا نہیں؟

جواب ۔ ہم اسکے جواب میں کہتے ہیں ممکن ہے کہ بکریاں جن کے چرانے کی حضرت موسےٰ سے شرط کی تھی۔ حضرت شعیبؑ کی ہوں۔ اور چرانے والے کا فائدہ بھی انہی کو ہو۔ مگر یہ بات ہو۔ کہ حضرت شعیبؑ نے یہ ارادہ کر رکھا ہو۔ کہ ان کی چرائی کی قیمت کا معاوضہ اپنی بیٹی کو عطا فرمائیں۔ اور یہ معاوضہ اس کا مہر ہو جائے۔ رہی تخییر (اختیار دینا) سو وہ اس مدت میں ہے۔ جو آٹھ برس سے زائد ہے۔ اور اس مدت (ہشت سالہ) میں جو اصلی طور پر مقرر کی ہے تخییر نہیں ہے۔ بلکہ تخییر صرف اس مدت میں ہے۔ جو اصلی مدت سے زائد اور علاوہ ہے۔

جواب دوم۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ بکریاں بیٹی ہی کی ہوں۔ اور باپ اس کے کاروبار کا متولی اور اس کے مہر پر قابض ہو۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ کہ باپ کا قبضہ دختر باکرہ اور بالغ کے مہر پر جائز ہے۔ اور باپ کے سوا اور کسی ولی کے لئے یہ بات جائز نہیں۔ اور اس امر پر سب کا اجماع ہے۔ کہ دختر شعیبؑ باکرہ تھی +

جواب سوم۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ نے صداق کا ذکر نہ کیا ہو۔ اور مہر کے علاوہ جو شرط اپنے نفس کے لئے کی تھی۔ اس کو بیان کیا ہو۔ اس لئے کہ جائز ہے۔ کہ ولی مہر کے علاوہ اپنے لئے کچھ شرط کر لے + یہ جواب ظاہر عبارت کے برخلاف ہے۔ اس لئے کہ خدا یہ فرماتا ہے۔ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نکاح اور خدمت ہشت سالہ دونوں سے ایک چیز دوسری چیز کا عوض ہے +

جواب چہارم۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ کی شریعت کا یہ دستور ہو۔ کہ عقد نکاح بلا مہر معین کے صرف رضامندی باہمی پر منعقد ہوتا ہو۔ اور آپ نے جو حضرت موسےٰؑ سے خدمت لینے کا عہد لیا تھا۔ وہ بطور مہر کے نہ ہو۔ اور جواب کی جو صورتیں پہلے گزریں۔ وہ بہت قوی ہیں +

تنزیہ حضرت موسےٰ علیہ السلام

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا سبب ہے۔ کہ موسےٰ علیہ السلام نے قبطی کو قتل کیا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ یا تو وہ قابل قتل تھا۔ یا نہ۔ اگر وہ مستوجب قتل تھا۔ تو حضرت موسےٰؑ کا پشیمان ہونا اور یہ فرمانا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ اور یہ فرمانا رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ محض بے سود اور بیفائدہ تھا۔ اور اگر وہ شخص قتل کا سزاوار نہ تھا۔ تو حضرت موسےٰؑ اس کو قتل کر کے عاصی اور گنہگار ہوئے۔ اور ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ہم یہ کہیں۔ کہ قتل نفس گناہ صغیرہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تم تو صغائر اور کبائر ہر دو قسم کو انبیاء علیہم السلام سے نفی کرتے ہو +

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ موسےٰ علیہ السلام نے عمداً اس شخص کو قتل نہیں کیا۔ اور نہ ہی آپ نے اس کا ارادہ کیا۔ بلکہ بات صرف یہ تھی۔ کہ آپ اس

دستہ سے چاہتے تھے۔ کہ آپ کے شیعوں میں سے ایک شخص نے اپنے ایک دشمن کے ہاتھ سے جو اس پر ظلم و ستم کر رہا تھا۔ اور اس کے مار ڈالنے کی ٹھانے ہوئے تھا۔ حضرت موسےٰؑ سے فریاد کی۔ حضرتؑ نے چاہا۔ کہ اپنے شیعہ کو اس ظالم کے پنجے سے چھڑائیں۔ اور اس بلا سے اس کو نجات دیں۔ اسی کشمکش میں وہ ظالم حضرت موسےٰؑ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ حالانکہ قطعاً آپ کا ارادہ اس کے قتل کرنے کا نہ تھا۔ اور ظالم کو دفع کرنے کی صورت میں جو الم کہ وقوع میں آئے۔ بشرطیکہ اس کا قصد اور ارادہ نہ کیا گیا ہو۔ وہ حسن ہے۔ اور قبیح نہیں ہے۔ اور اس الم کا عوض نہیں لیا جائیگا۔ اور مدافعہ خواہ انسان اپنے نفس سے کرے۔ خواہ کسی غیر سے یکساں حکم رکھتا ہے۔ مگر ہر دو حالت میں ضروری شرط یہ ہے۔ کہ ضرر و الم پہنچانا مقصود اور مطلوب نہ ہو۔ اور مکروہ کو دفع کرنا اور ضرر کو وقوع پذیر نہ ہونے دینا بالکلیہ مرغوب اور محبوب ہو۔ باوجود اس کے اگر ضمناً کچھ ضرر وقوع میں آجائے۔ وہ غیر قبیح اور مستحسن ہے + اور تعجب کی بات یہ ہے۔ کہ ابوعلی جبائیؒ نے اس صورت مذکورہ کو اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے پھر بھی اس نے حضرت موسےٰؑ کی طرف یہ نسبت دی ہے۔ کہ ان سے معصیت صغیرہ سرزد ہوئی۔ اور اپنی معصیت کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔ اور قولہ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ کی تفسیر میں کہا ہے۔ کہ حضرت موسےٰؑ نے عرض کی۔ کہ اے میرے پروردگار میں نے اس فعل میں جس کا تو نے مجھ کو حکم نہیں دیا تھا۔ اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اور حضرت اس فعل پر نادم ہوئے۔ اور خدا کے سامنے اس بات سے توبہ کی + کاش مجھکو معلوم ہو جاتا۔ کہ حضرتؑ نے وہ کونسا فعل کیا۔ جس کے کرنے کا خدا نے ان کو حکم نہ دیا تھا۔ حالانکہ اس جناب نے صرف ظالم کا مدافعہ کیا تھا۔ اور اس کو اپنے شیعہ سے ہٹایا تھا۔ اور حضرتؑ نے مُکّا جو اس ظالم کو مارا۔ وہ صرف مدافعہ کے طور پر تھا۔ اور مارنے کا قصد نہ تھا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں ہے۔ کہ خدا نے حضرتؑ کو مامور فرمایا تھا۔ کہ ظالم کو مظلوم سے دفع کریں۔ پس آپ کا یہ فعل ایسا فعل کیونکر ہوا۔ جس کے کرنے کا خدا نے حکم نہ دیا تھا + اور فعل واجب کو بجالانے والا کیونکر توبہ کر سکتا ہے۔ اور جبکہ ابوعلی کا منشا یہ تھا۔ کہ معصیت کو حضرتؑ کی طرف منسوب کرے۔ تو مدافعت اور ممانعت کے ذکر کرنے کی کیا حاجت تھی۔ اور اس کو لازم تھا۔ کہ مُکّا مارنے کو مقصود اور مطلوب قرار دیتا۔ جو معصیت صغیرہ

ہوتی ہے۔

اگر کوئی کہے۔ کہ کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ حضرت علیہ السلام نے مکا مارنے کا قصد ضرور کیا تھا۔ اگرچہ آپ کا ارادہ مار ڈالنے کا نہ تھا۔

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ یہ ضروری نہیں ہے۔ جو تو نے گمان کیا ہے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ مکا مارنا حضرتؑ کا مقصود تھا۔ حالانکہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ کہ حضرت موسٰےؑ کا قصد یہ تھا۔ کہ اپنے شیعہ کو اس ظالم کے پنجے سے چھڑا دیں۔ اور اس کے شر کو اس مظلوم سے دفع کریں۔ اور جس شخص کا ارادہ محض مدافعہ ہو۔ اس کو ضرر پہنچانے کا قصد کرنا جائز نہیں ہے۔ اور مکا مارنا محض بلا ارادہ وقوع میں آیا۔ بلکہ آپکا ارادہ محض چھڑانے کا تھا۔ مگر اسی چھڑانے میں ضمناً مکا مارنا اور قتل ہو جانا بلا ارادہ ظہور میں آگیا۔

اور دوسری صورت اس کی یہ ہو سکتی ہے۔ کہ اللہ تعالٰے نے حضرت موسٰےؑ کو معلوم کرا دیا ہو۔ کہ یہ قبطی اپنے کفر کی وجہ سے قتل کا سزاوار ہے۔ اور یہ حکم دیا ہو۔ کہ جب تک اس پر قدرت حاصل نہ ہو۔ اس کے قتل کرنے میں تاخیر کرنی مستحب ہے۔ پس جب حضرت موسٰےؑ نے دیکھا۔ کہ اس قبطی نے حضرت کے ایک شیعہ پر حملہ کر رکھا ہے۔ تو حضرتؑ نے اس مستحبی تاخیر کے حکم کو ترک کر کے عمداً اس کو قتل کر ڈالا ہو۔

اور آپ نے جو یہ فرمایا۔ کہ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (یہ شیطان کا کام ہے) اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

---

[1] عن الرضا علیہ السلام۔ ان موسی دخل مدینۃ من مدائن فرعون علی حین غفلۃ من اھلھا وذالک بین المغرب والعشاء فوجد فیھا رجلین یقتتلان ھذا من شیعتہ وھذا من عدوہ فاستغاثہ الذی من شیعتہ علی الذی من عدوہ فقضٰی موسٰی علی العدو بحکم اللہ تعالٰے وکزہ فمات قال ھذا من عمل الشیطان یعنی الاقتتال الذی کان وقع بین الرجلین لا ما فعلہ موسی من قتلہ انہ یعنی الشیطان عدو مضل مبین۔ خلاصہ ترجمہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ موسٰےؑ ایسے وقت میں فرعون کے شہروں میں سے کسی شہر میں داخل ہوئے۔ کہ شہر کے باشندوں کو خبر نہ ہوئی۔ یعنی مغرب و عشا کے درمیان پس حضرتؑ نے دو آدمیوں کو لڑتے پایا۔ ایک آپ کا دوست تھا۔ اور دوسرا دشمن لہٰذا آپ نے

صورت اول یہ کہ حضرت موسےٰؑ کی مراد اس قول سے یہ ہو۔ کہ اس قبطی کا قتل کرنا جو میری نظر میں بھلا معلوم ہؤا اور مجھ کو جو اس کے قتل میں تاخیر کرنے کا مستحبی حکم ہؤا تھا۔ اس کو جو میں نے ترک کیا۔ اور اس امر مستحب کے بجالانے میں جو ثواب مجھ کو ملتا۔ اس کا مجھ سے فوت ہونا یہ سب شیطان کا عمل ہے ٭

صورت دوم یہ کہ حضرت موسےٰؑ نے مقتول کے عمل کو اس کی رسوائی کی غرض سے شیطان کا عمل کہا ہے۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالےٰ کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور اس کے باعث قتل کا سزاوار تھا ٭

رہا حضرت موسےٰؑ کا یہ قول رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ (اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ پس تو مجھ کو بخش دے)۔ سو بعینہ ایسا ہے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو ہم کو نہ بخشیگا۔ اور ہم پر رحم نہ کریگا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں ہونگے)۔

(بقیہ نوٹ) دوست نے فریاد کی۔ کہ مجھ کو اس دشمن سے چھڑائیے۔ حضرت موسےٰ نے خدا کے حکم سے اسکے ایک مکا مارا۔ کہ وہ مرگیا۔ اور آپ نے کہا۔ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (یہ شیطان کا عمل ہے) یعنی یہ فعل لڑائی کا جو ان دونوں آدمیوں میں واقع ہؤا۔ نہ حضرت موسےٰؑ کا اس دشمن کو قتل کرنا۔ اور مطلب آپ کا یہ تھا کہ شیطان انسان کا دشمن اور کھلم کھلا گمراہ کرنے والا ہے۔ انتہی۔ اس حدیث سے ثابت ہؤا۔ کہ حضرت موسےٰؑ نے اپنے فعل کو عمل شیطان نہیں کہا۔ بلکہ ان دونو کے لڑنے کو عمل شیطان کہا ہے۔ اور یہ بالکل درست ہے۔ نیز اس سے یہ ثابت ہؤا۔ کہ حضرت موسےٰؑ نے خدا کے حکم سے مکا مارا تھا۔ نہ خود بخود۔ پس حضرت موسےٰؑ پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہوسکتا ٭

سے قال الرضا علیہ السلام۔ فی معنی قول موسی علیہ السلام رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی قال انی وضعت نفسی غیر موضعها بدخولی هذه المدینه فاغفر لی ای استرنی من اعدائك لئلا یظفروا بی فیقتلونی فغفر له انه هو الغفور الرحیم۔ (ترجمہ) امام علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ موسےٰؑ کے قول (رب انی الخ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ پس مجھ کو بخش) کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس شہر میں داخل ہونے کی وجہ سے اپنے نفس کو ایسے مقام میں رکھا۔ جو اس کی جگہ نہ تھی (کہ وہ دشمنوں کا شہر تھا) فاغفر لی مجھ کو اپنے دشمنوں سے پوشیدہ رکھ۔ اور چھپا۔ کہ مبادا مجھ پر ظفریاب ہوں۔

اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو حضرت کی مراد اس کلام سے اللہ تعالےٰ کی طرف رجوعیت اور انابت اور اس کی نعمتوں کے حقوق کے ادا کرنے سے اپنی تقصیر کا اقرار اور اعتراف ہے۔ گو آپ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ یا اس سبب سے یہ فقرہ زبان پر جاری ہوا ہے کہ فعل مندوب و مستحب کے بجالانے سے جو ثواب کے مستحق ہوتے۔ اس سے اپنے نفس کو محروم کیا *

اور قول حضرت موسےٰؑ فَاغْفِرْ لِی کے معنی یہ ہیں کہ اے خدا میری اس قربت اور طاعت اور رجوعیت اور انابت کو قبول فرما * اور یہ جانتے ہی ہو کہ استغفار اور توبہ کی قبولیت کو غفران کہا جاتا ہے۔ اور جب کہ استحقاق ثواب کے مستحق بنانے اور مدح کے سزاوار کرنے میں اور چیز اس قبولیت کی شریک ہو۔ تو اس کو بھی غفران کے نام سے نامزد کرنا جائز ہوگا *

پھر اس شخص سے جو اس امر کا قائل ہے۔ کہ حضرت موسےٰؑ کا اس قبطی کو قتل کرنا گناہ صغیرہ تھا ہم یہ کہینگے۔ کہ ظاہر ہے۔ یا تو حضرت موسےٰؑ نے اس کو عمداً قتل کیا۔ اور وہ شخص واقع میں قتل کا مستحق تھا۔ یا حضرتؑ نے اس کو قتل تو عمداً کیا۔ مگر وہ قتل کا سزاوار نہ تھا۔ یا حضرتؑ نے غلطی سے اس کو قتل کر ڈالا۔ اور وہ قابل قتل تھا۔ یا قابل قتل نہ تھا *

پہلی صورت میں یعنی حضرت موسےٰؑ نے اس کو عمداً قتل کیا۔ اور وہ قابل قتل بھی تھا حضرت موسےٰؑ کسی طرح عاصی نہیں ہوسکتے۔ رہی دوسری صورت کہ حضرتؑ نے اس کو عمداً قتل کیا ہو۔ اور وہ قابل قتل نہ ہو۔ سو ایسا فعل انبیاء علیہم السّلام سے صادر

(بقیہ نوٹ) اور مجھ کو قتل کردیں۔ خدا نے اُس کو محفوظ رکھا۔ اور قتل نہ ہونے دیا۔ انتہی۔ پس معلوم ہوا۔ کہ حضرت موسےٰؑ کے قول ظلمت نفسی میں ظلم اپنے اصل اور لغوی معنی پر مبنی ہے۔ کیونکہ ظلم کے اصل معنی وضع الشیٔ فی غیر موضعہ۔ یعنی کسی چیز کو اُس کی نامناسب جگہ میں رکھنا۔ یہی معنی یہاں صادق ہیں۔ اور یہی مطلب ہے کہ حضرت فرماتے ہیں۔ کہ میں نے اپنے نفس کو ایسی جگہ پہنچایا تھا۔ جو اسکی جگہ نہ تھی۔ ایسے ہی غفر انسا بھی اپنے اصلی و لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ یعنی لغت میں غفران کے معنی ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اور حضرت موسیٰؑ نے یہاں انہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ کہ اے خدا مجھ کو اپنے دشمنوں سے پوشیدہ کر کہ مبادا مجھ کو قتل کر ڈالیں۔ لہذا جناب موسےٰؑ کے اس قول سے یہ ہرگز ثابت نہیں۔ کہ انھوں نے گناہ کیا تھا۔ اور اُس کی مغفرت چاہی۔ فافہم *

ہونا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ عمداً بلا استحقاق کسی نفس کو قتل کر ڈالنا اگر کسی صورت میں اس کا صغیرہ ہونا جائز ہو۔ تو یہی حکم زنا اور دیگر بڑے بڑے گناہوں میں بھی جائز ہوگا۔ اگر مخالف کہے۔ کہ زنا اور اس کے امثال دیگر گناہ باعث نفرت خلایق ہیں۔ تو ہم کہینگے کہ قتل تو اس سے بھی بڑھ کر موجب نفرت ہے۔ اور اگر وہ قبطی غلطی سے مارا گیا۔ خواہ وہ قتل کا سزاوار تھا۔ یا نہ تھا۔ تو اس صورت میں حضرتؑ کا فعل قبیح ہونے سے بالکل خارج ہوگا۔ تو پھر صغیرہ کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (یعنی یہ گناہ ہی نہیں نہ صغیرہ نہ کبیرہ) ۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ موسےٰ علیہ السلام اپنے شیعہ کو جو ان سے دادخواہ تھا۔ یوں کہیں۔ اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ۔ کہ تو کھلم کھلا اور صاف طور پر گمراہ اور سرکش ہے ۔

جواب۔ اس سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ موسےٰؑ کی قوم نہایت درشت خو اور سخت طبع تھی۔ یہاں تک کہ بہت سے معجزے اور آیات الٰہی دیکھ چکے تھے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا۔ کہ کچھ لوگ بت پرستی کر رہے ہیں۔ تو حضرت موسےٰؑ سے عرض کی۔ اے موسےٰؑ۔ اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ۔ ہمارے لئے بھی کوئی معبود پرستش کے لئے مقرر کر جیسا کہ ان لوگوں کے معبود ہیں۔ اور حضرت موسےٰؑ کے ہاتھ سے چونکہ قبطی قتل ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ قوم فرعون سے خایف ہو کر کہ ایسا نہ ہو مجھ کو قتل کر ڈالیں باہر نکلے تھے رستے میں دیکھا۔ کہ وہی شخص جس کے باعث یہ دن دیکھا تھا۔ فرعون کے کسی مصاحب سے لڑ جھگڑ رہا ہے۔ جب اس کی نظر حضرتؑ پر پڑی۔ پکارا۔ یا حضرت میری مدد کیجئے اس وقت اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا۔ اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ۔ اور حضرت کی مراد اس قول سے یہ تھی۔ اِنَّكَ خائبٌ فی طلب ما لا تُدرِكُه و تكلّف ما لا تطيقه (کہ تو خائب و خاسر ہے اس چیز کی طلب میں جو تجھ کو نہ ملیگی۔ اور تو اس چیز کی تکلیف کر رہا ہے جس کی تجھ میں طاقت نہیں ہے) بعد ازاں کل کی طرح اس کی مدد کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس نے اپنی بیوقوفی اور نادانی سے یہ سمجھا۔ کہ حضرت مجھ ہی پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال کر کے وہ پکار اٹھا۔ اَتُرِيدُ اَنْ تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اِنْ تُرِيدُ اِلَّا اَنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيدُ اَنْ تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ (آیا تم چاہتے

ہو سکہ مجھے قتل کر ڈالو جس طرح کل ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ تم چاہتے ہو۔ کہ زمین پر جابر اور ظالم ہو۔ اور نیکوکار اور اصلاح کرنے والا بننا نہیں چاہتے) جب حضرت سے اپنے شیعہ کی یہ گفتگو سُنی۔ تو اس مصاحب کے قتل سے باز رہے۔ اور اسی سبب سے وہ کل والے قبطی کے قتل کا واقعہ مشہور ہو گیا۔

مسئلہ[1]۔ اگر کوئی کہے۔ کہ فرعون نے جو حضرت موسےٰؑ سے کہا۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ (تُو نے جو کام کیا سو کیا۔ اور تُو کفران نعمت کرنے والوں میں سے ہے)۔ اور حضرت موسےٰؑ نے اس کے جواب میں فرمایا۔ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ (میں نے وہ کام یعنی قتل نفس اس وقت کیا تھا جب کہ میں رستہ بھولا ہوا تھا)۔ اس سے کیا مراد ہے۔ اور حضرتؑ نے ضلال یعنی گمراہی کو اپنے نفس سے کیونکر منسوب کیا۔ حالانکہ تمہارے مذہب کے موافق حضرت کسی وقت بھی ضال یعنی گمراہ نہ تھے۔

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ فرعون نے جو حضرت موسےٰؑ کو کہا۔ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ یعنی تُو کافروں میں سے ہے۔ اس سے فرعون کی مراد یہ ہے۔ کہ تُو نے میری نعمت اور حق تربیت کا کفران کیا۔ کیونکہ فرعون نے حضرت موسےٰؑ کی

---

[1] عن الرضا علیہ السلام۔ ان فرعون قال لموسیٰ لما اتاہ وفعلت فعلتك التی فعلت وانت من الکافرین بی قال موسیٰ فعلتہا اذا وانا من الضالین عن الطریق بوقوعی الی مدینۃ من مدائنك ففررت منکم لما خفتکم فوھب لی ربی حکما وجعلنی من المرسلین۔ (خلاصہ ترجمہ) جب حضرت موسےٰؑ فرعون کے پاس آئے۔ تو اُس نے حضرت سے کہا۔ تم نے یہ فعل کیا جبکہ تو میرا نافرمان اور میری اطاعت کا منکر تھا۔ تو حضرت موسےٰؑ نے فرمایا۔ میں نے یہ فعل (قتل قبطی) اُس وقت کیا۔ جبکہ میں راہ سے الگ ہو گیا اور تیرے ایک شہر میں جا نکلا پس میں بھاگا تم سے جبکہ میں تم سے ڈرا پس خدا نے مجھ کو اظہار نبوت کا حکم عطا کیا۔ اور مجھ کو نبی مرسل قرار دیا۔ اس حدیث سے انت من الکافرین اور انا من الضالین کے معنی بخوبی واضح ہو گئے۔ کہ فرعون نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کو کافر خدا نہیں کہا۔ بلکہ اپنی اطاعت سے کافر و منکر کہا ہے۔ اور حضرت موسےٰ علیہ السلام نے جو انا من الضالین کہا اُس کے یہ معنی نہیں۔ کہ میں گمراہوں میں سے تھا۔ بلکہ لغوی معنی راستے سے الگ ہو جانا مراد ہیں۔ فافہم۔

تربیت کی تھی۔ اور سن بلوغ تک آپ کو پرورش کیا تھا۔ چنانچہ قول فرعون کو اللہ تعالےٰ بطور حکایت ذکر فرماتا ہے۔ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ یعنی فرعون نے حضرت موسےٰؑ سے کہا۔ اے موسےٰ۔ آیا ہم نے تجھ کو بچپن میں پرورش نہیں کیا۔ اور تو اپنی عمر کے کئی برس تک ہم میں رہتا رہا ہے۔ اور حضرت موسےٰؑ نے جو فرعون کے جواب میں یہ فرمایا کہ فَعَلْتُهَا إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّالِّيْنَ میں نے وہ کام یعنی قتل نفس اس وقت کیا تھا جب کہ میں ضالین میں سے تھا۔ اس جگہ حضرتؑ کی مراد ضالین سے ذاہبین ہے یعنی میں اس بات سے الگ ہونے والا تھا کہ اُسکا مارنا۔ اس کی جان لے لیگا۔ یا مدافعہ اس کے قتل کا باعث ہوگا۔ اور ذاھب عن الشئے کو زبان عرب میں کہا جاتا ہے۔ إِنَّهٗ ضَالٌّ عَنْهُ۔

نیز یہ بھی جائز ہے۔ کہ حضرت کی مراد مِنَ الضَّالِّيْنَ کہنے سے ہو۔ إِنِّيْ ضَلَلْتُ عَنْ فِعْلِ الْمَنْدُوْبِ إِلَيْهِ مِنَ الْكَفِّ عَنِ الْقَتْلِ فِيْ تِلْكَ الْحَالِ وَالْفَوْزِ بِمَنْزِلَةِ الثَّوَابِ کہ میں فعل مستحب سے الگ رہا جس کا مجھ کو حکم دیا گیا تھا۔ کہ میں اس حالت میں قتل سے باز رہوں۔ تاکہ ثواب کا درجہ حاصل کروں۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰؑ سے فرمایا۔ أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ تو ظالم قوم کے پاس جا۔ تو ان کو اس کے جواب میں یہ کہنا کیونکر جائز تھا۔ کہ إِنِّيْ أَخَافُ أَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَأَرْسِلْ إِلٰى هَارُوْنَ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائینگے۔ اور میرا سینہ تنگ ہے۔ اور میری زبان نہیں چلتی ہے۔ پس تو ہارون کو بلا بھیج۔ حضرت موسےٰؑ کا اللہ تعالےٰ کے جواب میں یہ کہنا رسالت سے استعفا دینا ہے۔

جواب۔ حضرت موسےٰؑ کا یہ قول استعفا پر دلالت نہیں کرتا۔ جیسا کہ سائل کا خیال ہے۔ بلکہ اس سے پہلے حضرت موسےٰؑ کو اجازت دی گئی تھی۔ کہ خدا سے درخواست کرے۔ کہ رسالت فرعون میں میرے بھائی کو میرا شریک کردے۔ اور ان کی درخواست بھی قبول ہوگئی تھی۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَهَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى إِذْ رَأٰى نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوْا إِنِّيْ آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْ آتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى۔ اس سے آگے حضرت موسےٰؑ کا وادی مقدس میں جانا اور خدا کا ان سے ہمکلام ہونا مذکور ہے۔

پھر عصا کا اژدہا بننے اور ید بیضا کے ظاہر ہونے وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ اے موسےٰ فرعون کی طرف جا۔ کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے عرض کی۔ اے میرے پروردگار میرے سینے کو کھول دے۔ اور میرے کام کو آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے۔ کہ وہ میری بات کو سمجھیں۔ اور میرے اہل میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا۔

جب حضرت موسےٰؑ نے اس طرح دعا کی۔ تو اللہ تعالےٰ نے ان کی درخواست کو قبول کیا چنانچہ اسی سورۃ میں آگے چل کر فرماتا ہے۔ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى۔ اے موسےٰ تیری التماس ہم نے قبول کر لی۔

یہاں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ چونکہ حضرت موسےٰؑ کو اپنی پہلی درخواست کی قبولیت پر جس کی ان کو اجازت دی گئی تھی اعتماد اور وثوق تھا۔ اس لئے اس جناب نے بارگاہ ایزدی میں عرض کی۔ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ (اے میرے پروردگار میں ڈرتا ہوں۔ کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔ اور میرا سینہ تنگ ہے۔ اور میری زبان نہیں چلتی)۔ اس درخواست میں حضرتؑ نے اپنی صورت حال کو عرض کیا ہے۔ جو اس امر کی مقتضی ہے۔ کہ ان کے بھائی کو رسالت میں ان کا شریک کیا جائے۔ الغرض حضرت موسےٰؑ نے یہ درخواست اس سبب سے کی تھی۔ کہ خدا کی طرف سے ان کو اس امر کی اجازت مل چکی تھی۔ اور ان کو اس کی قبولیت کا علم اور اعتماد حاصل تھا۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ حضرت موسےٰؑ نے جو جادوگروں کو جادو کی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالنے کا حکم دیا۔ یہ حکم دینا کیونکر جائز ہوا۔ حالانکہ یہ افعال کفر اور سحر اور تلبیس اور تمویہ ہیں۔ اور ایسا حکم مستحسن اور پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

جواب۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ حضرت موسےٰؑ نے جو جادوگروں کو یہ حکم دیا۔ اس میں شرط کا ہونا ضروری ہے۔ گویا آپ نے یہ فرمایا تھا۔ اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُحِقِّيْنَ۔ ڈالو جو کچھ تم ڈالتے ہو۔ اگر تم حق پر ہو۔ اور ان جادوگروں کے کام میں حضرت موسےٰؑ کے لئے حجت تھی۔ چونکہ کلام خود وجود شرط پر دال ہے۔ اور صورت حال اس کی مقتضی ہے۔ اس لئے شرط کو حذف کیا گیا۔ اور کلام عرب میں ایسے کلام جس میں شرط محذوف

ہو۔ گو شرط مراد اور مقصود ہو۔ کثرت سے مروج ہیں۔ اور حضرت موسےٰؑ کا یہ قول اللہ کے اس قول کے مانند نہیں ہے۔ جس میں خدا کفار قریش سے فرماتا ہے۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ تم بھی قرآن جیسی کوئی سورت بنا لاؤ۔ حالانکہ اس کو معلوم تھا۔ کہ وہ ایسا کلام نہیں بنا سکتے۔ اور یہ کلام الفاظ تحدی سے بہت ہی مشابہ ہے۔ اس لئے کہ یہ تحدی گو امر کی صورت میں ہے۔ مگر اصل میں امر نہیں ہے۔ اور ارادہ فعل اس میں موجود نہیں ہے۔ اور ارادہ کیونکر پایا جائے۔ حالانکہ خدا کو معلوم ہے۔ کہ ایسا کلام بنانا ان سے ناممکن اور متعذر ہے۔ اور تحدی ایک لفظ ہے۔ جو اس لئے وضع کیا گیا ہے کہ تحدی کئے جانے والے شخص پر حجت قائم کی جائے۔ اور جس امر کی تحدی کی گئی ہے۔ اس کی بابت اس کے عجز و قصور کا اظہار کیا جائے۔ اور یہاں کوئی فعل ایسا نہیں ہے۔ جس کو ارادہ پا سکے۔ اور رہا رسیاں اور لاٹھیاں ڈالنے کا حکم۔ سو وہ اس کے برخلاف ہے۔ اس لئے کہ وہ ممکن اور ان کے مقدور میں ہے۔ پس یہ کہنا درست ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ اس کلام سے یہ مقصود تھا۔ کہ جادوگر رسیاں اور لاٹھیاں ڈالنے سے عاجز ہو جائیں۔ اور جس امر کی ان کو دعوت کی گئی ہے۔ وہ ان کے لئے متعذر ہو جائے۔ جب کہ یہ بات نہیں ہے۔ تو یہ امر بالشرط ہوا۔ اور ممکن ہے۔ کہ یہ امر بطور تحدی کے ہو۔ اس طرح پر کہ حضرت موسےٰ علیہ السّلام نے ان کو اس امر کی دعوت کی ہو۔ کہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں اس طرح ڈالیں۔ کہ اس میں حضرت موسےٰؑ کے برابر ہو جائیں۔ اور جو چیز کہ وہ ڈالیں۔ اس کے سعی اور تصرف حقیقی ہو۔ خیالی اور غیر حقیقی نہ ہو۔ (جیسا کہ حضرت موسےٰؑ نے جو چیز دکھائی۔ وہ واقعی اور حقیقی تھی۔ نہ کہ خیالی اور غیر حقیقی) کیونکہ اس حالت میں ان کا یہ فعل اس معجزے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ جو حضرت کے ہاتھ پر ظاہر ہوا تھا۔ کہ ایک جمادی شے اپنی حالت بدل کر محض خیالی طور پر نہیں۔ بلکہ حقیقی طور پر اژدہا بن گئی۔ چونکہ یہ بات ان جادوگروں کے دائرہ قدرت و طاقت سے خارج تھی۔ اس لئے حضرت موسےٰؑ نے بطور تحدی کے ان سے ایسا فرمایا ہو۔ تاکہ حضرت کی حجت ظاہر ہو جائے اور ان کی دلالت سب پر منکشف اور عیاں ہو جائے۔ اور یہ واضح اور ظاہر ہے۔ اور حق تعالےٰ قرآن شریف میں نہایت واضح طور پر اس کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَمِنَ

الْمُقَرَّبِيْنَ قَالُوْا يَا مُوْسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ قَالَ اَلْقُوْا فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صَاغِرِيْنَ ٥ یعنی جادوگر فرعون کے پاس آئے۔ اور عرض کی کہ اگر ہم حضرت موسٰے پر غالب آجائیں۔ تو ہم کو اجر ملیگا؟ اس نے کہا ہاں۔ میں تمکو غالب ہونے کی صورت میں اپنا مقرب خاص بناؤنگا + اس بحث و پرسش کے بعد ان جادوگروں نے حضرت موسےؑ سے کہا۔ اے موسےؑ تم پہلے ڈالوگے۔ یا ہم پہلے ڈالیں۔ فرمایا۔ تم ہی ڈالو۔ پس جب انہوں نے ڈالا۔ تو لوگوں کی آنکھوں کو جادو کر دیا۔ اور ان کو خوف زدہ کر دیا۔ اور بہت بڑا جادو کیا۔ اس وقت ہم نے موسےؑ پر وحی بھیجی۔ کہ اب تو اپنے عصا کو ڈالدے۔ پس وہ ان جادوگروں کے ساختہ پرداختہ افک وافترا کو نگل گیا۔ الغرض حق غالب ہوا۔ اور جادوگروں کے عملیات سب باطل ہوگئے۔ اور جادوگر مغلوب ہوکر ذلیل و خوار ہوئے +

مسئلہ ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ حضرت موسےؑ کس چیز سے خایف ہوئے تھے جس کی حقیقت حال کو حق تعالےٰ قرآن میں حکایۃً ذکر فرماتا ہے۔ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى یعنی موسےؑ اپنے جی میں خائف و ترساں ہوئے + آیا حضرت کا ڈرنا اس بات کا مقتضی نہیں ہے۔ کہ حضرتؑ کو ان احکام الٰہی کی صحت میں جو حضرتؑ پر نازل ہوئے۔ شک تھا +

جواب ۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ حضرتؑ کے ڈرنے کا سبب وہ نہ تھا جو کہ سوال میں مذکور ہے۔ بلکہ جب حضرت نے جادوگروں کی تلبیس اور تخییل کی قوت مشاہدہ کی۔ تو آپ کو یہ خوف ہوا کہ جو شخص غور و تامل سے اس وقت نظر نہ کریگا۔ وہ شبہ میں پڑ جائیگا۔ پس اللہ تعالےٰ نے لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (اے موسےؑ کچھ خوف نہ کر کیونکہ تو ہی سب پر غالب ہوگا) فرما کر آپ کو اس خوف سے مطمئن کیا۔ اور آپ پر ظاہر کر دیا کہ تمہاری حجت تمام قوم پر واضح اور منکشف ہو جائیگی +

مسئلہ ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ آیۂ ذیل کے معنی کیا ہیں۔ جس میں اللہ تعالےٰ موسےؑ کا حال حکایۃً ذکر فرماتا ہے۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○ اے میرے پروردگار تو نے فرعون اور اس کی قوم کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال دئے ہیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے گمراہ کریں۔ اے پروردگار ان کے مالوں کو خاک سیاہ کردے۔ اور ان کے دلوں پر مہر کردے پس وہ جب تک دردناک عذاب نہ دیکھینگے۔ ایمان نہ لائینگے۔

جواب ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آیۂ لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِكَ میں کئی صورتیں ہوسکتی ہیں :۔

صورت اوّل ۔ یہ کہ لیضلوا سے مراد لِئَلَّا یضلوا ہو۔ اور لا محذوف کردیا ہو۔ اور اس کے نظائر قرآن اور کلام عرب میں بیشمار موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى۔ اس آیت میں ان تضل سے مراد لئلا تضل ہے۔ دوسری آیت میں ہے۔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ یعنی لِئَلَّا تقولوا نیز فرماتا ہے وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ یعنی لِئَلَّا تَمِيْدَ بِكُمْ۔ اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

نَزَلْتُمْ مَنْزِلَ الْاَضْيَافِ مِنَّا ✤ فَعَجَّلْنَا الْقِرٰى اَنْ تَشْتِمُوْنَا

یعنی لئلا تشتمونا۔

اب اگر کوئی یہ کہے۔ کہ یہ آیات اور شعر آیۂ لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِكَ کی نظیر نہیں ہیں۔ اس لئے کہ تم نے آیت مذکورہ میں تو ان اور لا دو محذوف نکالے ہیں۔ اور ان آیات اور اس شعر میں جو تم نے نظیراً پیش کئے ہیں۔ فقط لا محذوف ہے۔

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ جو نظیریں ہم نے شہادت میں پیش کی ہیں۔ ان میں لام اور لا دونو محذوف ہیں۔ چنانچہ شعر مذکور میں اَنْ تَشْتِمُوْنَا کی تقدیر لئلا تشتمونا ہے۔ اور آیت مذکورہ میں بھی دو حرف ان اور لا محذوف ہیں۔ صرف اتنی بات ہے۔ کہ ہماری پیش کردہ نظائر میں ان کی جگہ لام محذوف ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے۔ کہ یہ دونو یعنی ان اور لام غرض اصلی سے خبر دیتے ہیں۔ اور مقصود کلام پر دلالت کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔ جئتک لِتکرمنی۔ اسی طرح کہتے ہیں۔ جئتک اَنْ تکرمنی۔ اور معنی ان دونو کے یہ ہیں۔ کہ میں تیرے پاس اس غرض سے آیا ہوں۔ کہ تو میرا اکرام اور عزت کرے۔

پس جب ان میں سے ایک حرف کا حذف کرنا جائز ہے۔ تو دوسرے کا حذف بھی جائز ہوگا +

صورت دوم۔ یہ کہ لام یہاں لام عاقبت ہے۔ اور لام غرض نہیں ہے۔ اور مثل آیہ فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا کے ہے۔ کہ اس میں لِيَكُونَ کی لام لام عاقبت ہے۔ کیونکہ آل فرعون نے حضرت موسےٰ کو اس لئے نہیں اٹھایا تھا۔ کہ وہ ان کا دشمن بنے اور باعث غم وملال ہو۔ مگر چونکہ مآل اور انجام اس اٹھانے کا یہی ہوا۔ تو لام کا داخل کرنا اس پر مستحسن ہے۔ اور ایسا ہی شاعر کے شعر میں بھی ہے۔ شعر
وَلِلْمَوْتِ تَغْذُو الْوَالِدَاتُ سِخَالَهَا + كَمَا لِخَرَابِ الدَّهْرِ تُبْنَى الْمَسَاكِنُ
اور اس کے نظائر کلام عرب میں بیشمار ہیں۔ گویا یوں سمجھو۔ کہ چونکہ اللہ تعالےٰ کو علم تھا۔ کہ ان کا انجام کار کفر ہے۔ اور کافر ہی مرینگے۔ اور اس بات سے اس نے اپنے نبی (موسےٰ) کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس حالت میں زیبا ہے۔ کہ حضرت موسےٰ کہیں۔ اِنَّكَ آتَيْتَهُمْ اَمْوَالًا لِيُضِلُّوا۔ یعنی تونے جوان کو مال دیا۔ اسی کا انجام یہ ہے۔ کہ وہ گمراہ کریں +

صورت سوم۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ یہ کلام بمنزلہ نفی اور انکار کے ہو۔ اس شخص کے مقابلہ میں جو گمان کرتا ہو۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ایسا ان لوگوں کے گمراہ کرنے کی غرض سے کیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ وہاں کوئی جبریہ فرقہ کا آدمی موجود ہو۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہی دین سے گمراہ کرتا ہے۔ پس اللہ تعالےٰ نے اس کے قول کی تردید میں ایسا فرمایا ہو جیسا کہ کوئی شخص کہتا ہے۔ اِنَّمَا اٰتَيْتُ عَبْدِیْ مِنَ الْاَمْوَالِ مَا اٰتَيْتُهٗ لِيَعْصِيَنِیْ وَلَا يُطِيْعَنِیْ (میں نے مال اپنے غلام کو اسی لئے دیا تھا کہ وہ میری نافرمانی کرے۔ اور متابعت نہ کرے) سو اس کے نہیں ہے۔ کہ اس قول میں اس شخص کے گمان کا انکار ہے۔ جو سمجھتا ہے۔ کہ اس نے مال اسی لئے دیا تھا + نیز اپنی طرف معصیت کے منسوب کرنے کی نفی کی ہے + اور یہ مطلب دو حالتوں میں سے ایک ہی حالت میں ہوسکتا ہے۔ یا تو اس میں استفہام مقدر مانا جائے۔ گو حرف استفہام وہاں سے محذوف ہے۔ یا یہ کہ لیعصینی کی لام لام عاقبت تسلیم کی جائے۔ جس کا بیان پیشتر گزرا۔ اگر ہم ان دونو وجہوں کا خیال اپنے دل سے اٹھادیں۔ تو یہ بات کسی طرح تصور میں آہی نہیں سکتی۔

کہ یہ کلام نفی اور انکار کے لئے بولا گیا ہے ✦

صورت چہارم - یہ ہو سکتی ہے - کہ اس آیت میں استفہام مراد ہو - اور اس کے حرف خاص کو حذف کر دیا ہو - اور حرف استفہام کلام عرب میں اکثر مقام پر حذف کیا جاتا ہے مگر یہ جواب چنداں معقول نہیں - کیونکہ حرف استفہام کلام میں سے اسی وقت محذوف کیا جاتا ہے - جبکہ وہاں کوئی قرینہ ایسا موجود ہو - جو اس کے حذف پر دلالت کرتا ہو - اور اس کا عوض ہو سکتا ہو - چنانچہ شاعر کا شعر ہے - شعر

کذبتك عينك ام رايت بواسط ✦ غلس الظلام من الرباب خيالا

اس شعر میں فقط ام استفہام کا مقتضی ہے ✦

اور ابو علی جبائی نے اپنی تفسیر میں اپنے دل سے یہ سوال کیا ہے - اور اس کا یہ جواب دیا ہے - کہ اس آیت میں حرف استفہام کے حذف پر جو چیز دلالت کرتی ہے - وہ دلیل عقل ہے - جو اس امر پر دلالت کرتی ہے - کہ اللہ تعالے اپنے بندوں کو دین سے گمراہ نہیں کرتا - اور دلیل عقل دلیل کلامی سے جو حرف استفہام پر دال ہو - قوی تر ہے - مگر ہم کہتے ہیں - کہ ابو علی کا یہ قول بالکل ہیچ اور پوچ ہے - اس لئے کہ دلیل عقلی گو کلام کی تمام دلائل سے قوی تر ہے - مگر وہ اس امر کی مقتضی نہیں ہے - کہ اس آیت میں حرف استفہام محذوف ہے - کیونکہ عقل صرف اس امر کی مقتضی ہے - کہ اللہ تعالے اس بات سے بالکل پاک اور منزّہ ہے - کہ اس کا فعل بندوں کو دین سے گمراہ کرنا ہو - اور اس آیت سے بلا ذکر استفہام اور بدون حذف حرف استفہام کے ایسے معنی لے سکتے ہیں - جن سے دلیل عقلی کے مطابق اللہ تعالے کا امر قبیح سے منزّہ و مبرّا ہونا عیاں اور ظاہر ہو جائے - پس جب کہ یہ ممکن ہے - تو پھر عقل حرف استفہام کے حذف کی دلیل نہ ٹھیری - اور یہ اس امر کی دلیل اس وقت ہو سکتی تھی جبکہ بلا تقدیر استفہام ارادۂ اضلال سے ذات الٰہی کا منزّہ اور مبرّا ثابت نہ ہو سکتا ✦

اور قول تعالے فَلَا يُؤْمِنُوا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ کے بارے میں سب سے عمدہ قول یہ ہے - کہ وہ قول لِيُضِلُّوا پر عطف ہے - اور قول تعالے رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کا جواب نہیں ہے - اور اس کلام کی تقدیر یوں ہے - رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ

سَبِیْلِکَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِہِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ○ اور یہ جواب ہر دو حالت کے مطابق ہے۔ جبکہ لیضلوا کی لام کو لام عاقبت تسلیم کیا جائے۔ دوم جبکہ لیضلوا کے معنی لئلا یضلوا لئے جائیں ✦

اور بعض لوگوں کا قول یہ ہے۔ کہ فلا یومنوا سے مراد فلنؔ یُؤمِنُوا ہے۔ الف نون خفیفہ کے بدلے میں ہے۔ چنانچہ اعشی کے قول میں ہے۔ شعر

وَصَلِّ علٰی حِیْنِ العشیاتِ والضُّحٰی ✦ ولا تحمدُ المشرکینَ واللہ فاحمدا

فاحمدن کی نون الف ہوگئی ✦ اور عمر بن ربیعہ کا قول ہے۔ شعر

وَقُمیرٍ بدا ابن خمسٍ وعشرین ✦ لہ قالتِ الفتاتان قُوْمَا

اس میں قوما بجائے قُومن ہے ✦

اور جس شخص نے یہ جواب دیا ہے۔ جس کو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ کہ یہ کلام خبر ہے۔ گو دعا کی صورت میں ہے۔ اس نے اس کے ثبوت میں سنداً وہ حدیث پیش کی ہے۔ جو آنحضرت صلعم سے مروی ہے۔ لَنْ یُلْدَغَ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ حالانکہ یہ نہی ہے گو خبر کی صورت میں ہے۔ اور اس کی تقدیر یہ ہے۔ کہ لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ اس لئے کہ اگر یہ کلام خبریہ ہو۔ تو ضرور کذب ہے۔ اور جب لفظ خبر سے نہی مراد لینا جائز ہؤا۔ تو لفظ دعا سے خبر مراد لینا بھی جائز ہوگا۔ اور فلا یومنوا سے مراد فلن یومنوا ہوگی ✦

اور ابو علی نے ذکر کیا ہے۔ کہ اہل لغت کی ایک جماعت کا قول یہ ہے۔ کہ قولہ تعالیٰ فلا یومنوا منصوب ہے۔ اور نون اس میں سے محذوف ہوگیا ہے۔ اور اس کے معنی فلا یُومنونَ ہے۔ اور یہ کلام خبریہ ہے۔ کہ اس میں کفار کے حال کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے کہ قولہ تعالےٰ فلا یومنوا اس امر کے جواب کے مقام میں وارد ہؤا ہے۔ اور وہ امر رَبَّنَا اطْمِسْ علٰٓی اموالِہِم وَاشْدُدْ علٰی قُلُوْبِہِم ہے۔ پس جب کہ فلا یومنوا امر کے جواب میں ہے۔ اور اس میں فا موجود ہے۔ تو وہ باضمار اَنْ منصوب لایا گیا۔ اس لئے کہ جواب امر جو بالفاء ہو۔ لغت میں منصوب ہوتا ہے۔ پس فلا یومنوا کو بھی نصب دیا گیا۔ کیونکہ جواب امر کے مقام میں ہے۔ گو اصل میں جواب نہیں ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ انظر الی الشمس تغرب۔ اور اس میں تغرب بالجزم ہے۔ حالانکہ تغرب

دراصل جواب امر نہیں ہے۔ اس لئے کہ شمس اس دیکھنے والے کے دیکھنے کیلئے غروب نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ جواب کے مقام میں واقع ہوا ہے۔ اس لئے جزم میں اس کا قائمقام ہوا۔ گو دراصل جواب نہیں ہے۔

اور ابومسلم محمد بن بحر نے اس آیت میں ایک صورت اور ذکر کی ہے جو صورت ہائے مذکورہ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے گروہ کو دنیاوی زینت اور مال و منال صرف اس لئے عطا کئے تھے کہ ان کے کفر و ضلالت کا ان سے انتقام لے۔ اور ان کو عذاب دے۔ اور اس لئے کہ اس کو ان کے آئندہ احوال کا علم تھا۔ کہ وہ ایمان نہیں لانے کے۔ اور یہ بعینہ ایسا ہے۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ یعنی ان کے مال اور اولاد تجھ کو تعجب میں نہ ڈالیں۔ اس سے اللہ تعالےٰ کا ارادہ صرف یہ ہے۔ کہ ان کے ذریعے ان (کفار) کو دنیوی زندگی میں عذاب کرے۔ اور حالت کفر ہی میں ان کی جانیں ان کے بدنوں سے نکل جائیں۔ پس حضرت موسےٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔ اے میرے پروردگار تو نے فرعون اور اس کی قوم کو یہ مال اور زینت اس لئے عطا کی ہے۔ تاکہ دنیا میں عذاب کرے۔ اور آخرت میں اپنی راہ سے کہ وہ راہِ جنت ہے۔ گمراہ کرے۔ اور ان کے کفر کے سبب ان کو جہنم میں داخل کرے۔ پھر اس سے درخواست کی۔ اے خدا ان کے اموال کو بدل دے یعنی ان کو سلب کر دے۔ تاکہ اس سبب سے ان کی حسرت اور عذاب اور تکالیف میں زیادتی ہو۔ اور ان کے دلوں پر مہر کر دے۔ کہ اسی مکروہ حالت میں مر جائیں۔ اور یہ جواب اقرب بصواب اور قرین بسداد ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی کہے۔ کہ قول تعالےٰ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (یعنی جب موسےٰؑ ہماری میقات کے لئے آیا۔ اور اس کے

ھو قال الرضا علیہ السلام فی تفسیر قولہ تعالیٰ حکایۃ عن موسیٰ رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی الآیۃ قال ان کلیم اللہ موسیٰ بن عمران علم ان اللہ تعالیٰ اجل ان یری بالابصار لکنہ لما کلم اللہ عزوجل وقربہ نجیا فرجع الی قومہ فاخبرھم ان اللہ عزوجل کلمہ وقربہ ونلجاہ

پروردگار نے اس سے کلام کیا۔ تو موسےؑ نے کہا۔ اے میرے پروردگار مجھ کو اپنا جمال دکھا۔ تاکہ میں تجھ کو دیکھوں) کے کیا معنی ہیں۔ کیا یہ آیت اس امر پر دلالت نہیں کرتی۔ کہ اس ذات باریتعالےٰ کی رؤیت جائز ہے۔ کیونکہ اگر رویت باری تعالےٰ جائز نہ ہوتی۔ تو حضرت موسےؑ کو ایسا سوال کرنا جائز نہیں تھا۔ جیسا کہ صاحبہ (جورو) اور اولاد کے اختیار کرنیکا سوال اس جلشانہ کے حق میں جائز نہیں ہے +

جواب۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ اس آیت کا سب سے بہتر جواب یہ ہے۔ کہ موسےؑ نے رؤیت کا سوال اپنے نفس کے لئے نہیں کیا تھا۔ بلکہ صرف اپنی قوم کے لئے ایسا سوال کیا تھا۔ کیونکہ روایت ہے۔ کہ ان کی قوم نے حضرت سے یہ درخواست کی تھی۔ اور آپ نے ان کو یہ جواب دیا تھا۔ کہ اس جل شانہ کی رویت جائز نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے نہایت الحاح اور اصرار سے کہا۔ کہ اللہ تعالےٰ سے درخواست کرو۔ کہ وہ اپنی ذات کو ہمیں دکھاوے۔ اور حضرت موسےؑ کو اس امر کا گمان غالب تھا۔ کہ جب جناب احدیت عزشانہ کی طرف سے اس سوال کا جواب وارد ہوگا۔ تو وہ شبہ کی بیخ کنی کر دیگا۔ اور کسی قسم کا شک ریب باقی نہ رہنے دیگا۔ اس لئے حضرتؑ نے حاضرین میقات میں سے ستر شخصوں کو منتخب

(بقیہ نوٹ) فقالوا لن نؤمن لک حتے نسمع کلامہ کما سمعت وکان القوم سبعمائۃ الف رجل فاختار منہم سبعین الفا ثم اختار منہم سبعۃ الاف ثم اختار منہم سبعمائۃ ثم اختار منہم سبعین رجلا لمیقات ربہ فخرج بہم الی طور سیناء فاقامہم فی صفح الجبل وصعد موسیٰ الی الطور فسئل اللہ تعالیٰ ان یکلمہ ویسمعہم کلامہ فکلمہ اللہ تعالیٰ ذکرہ وسمعوا کلامہ من فوق واسفل ویمین وشمال ووراء وامام لان اللہ تعالےٰ عزوجل احدثہ فی الشجرۃ وجعلہ منبعثا منہا حتی سمعوہ من جمیع الوجوہ فقالوا لن نؤمن لک بان ھذا الذی سمعناہ کلام اللہ حتی نری اللہ جہرۃ فلما قالوا ھذا القول العظیم واستکبروا وعتوا بعث اللہ عج علیہم صاعقۃ فاخذتہم بظلمہم فماتوا فقال موسیٰ ما اقول لبنی اسرائیل اذا رجعت الیہم وقالوا انک ذھبت بہم فقتلت لانک لم تکن صادقا فیما ادعیت من مناجاۃ اللہ ایاک فاحیاہم فبعثہم معہ فقالوا انک لو سئلت اللہ ان یریک ان تنظر الیہ لاجابک وکنت تخبرنا کیف ھو فنعرفہ حق معرفتہ فقال موسیٰ یا قوم ان اللہ لا یری بالابصار ولا کیفیۃ لہ وانما یعرف بایاتہ ویعلم باعلامہ فقالوا لن نؤمن لک

کیا۔ تاکہ یہ سوال ان کے سامنے کیا جائے۔ اور وہ اس کے جواب کو جو جناب باری سے صادر ہو۔ خوب طرح جان لیں۔ تب حضرتؑ نے سوال کیا۔ جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے۔ اور وہاں سے وہ جواب ملا۔ جو اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ اس عز و جل کی رویت جائز نہیں ہے۔ اور اس جواب کی تقویت چند امور سے ہوتی ہے منجملہ ان کے ایک یہ ہے۔ کہ خدا فرماتا ہے۔ يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ یعنی اے محمدؐ اہل کتاب تجھ سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ تو آسمان سے ایک کتاب ان پر نازل کرے۔ انہوں نے موسےٰؑ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ انہوں نے اس سے کہا تھا۔ کہ ہم کو اللہ کو ظاہر طور پر دکھا دے۔ تب ان کے ظلم کے سبب ان پر بجلی گر پڑی تھی ✤

دوسرا امر یہ ہے۔ کہ خدا فرماتا ہے۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يَا مُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ یعنی اے بنی اسرائیل تم اس وقت کو یاد کرو۔ جب کہ تم نے کہا۔ اے موسےٰؑ۔ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہ لائینگے جب تک کہ اللہ کو ظاہر طور پر نہ دیکھ لینگے۔ پس تم کو بجلی نے گھیر لیا۔ اور تم دیکھ رہے تھے ✤

(بقیہ نوٹ) حتی نسئلہ فقال موسیٰؑ یا رب قد سمعت مقالۃ بنی اسرائیل وانت اعلم بصلاحہم فاوحی اللہ عزوجل الیہ یا موسیٰؑ سلنی ما سئلوک فلن او اخذک بجہلہم فعند ذالک قال موسیٰؑ رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ وھو یھوی فسوف ترانی فلما تجلی ربہ للجبل بآیۃ من آیاتہ جعلہ دکا وخر موسیٰؑ صعقا فلما افاق قال سبحانک تبت الیک یقول رجعت الی معرفتی بک عن جہل قومی وانا اول المومنین منہم بانک لا تری (خلاصہ) موسےٰؑ بن عمران کلیم اللہ جانتے تھے۔ کہ خدا آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جب کہ اللہ عز و جل نے ان کو ہمکلامی کا شرف عطا فرمایا۔ اور رازگوئی سے مقرب کیا۔ تو آپ اپنی قوم کے پاس گئے۔ اور ان کو خبر دی۔ کہ مجھ سے خدا نے کلام کیا۔ اور راز بیان کیا۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ ہم اس پر یقین نہ لائینگے۔ جب تک ہم خود خدا کے کلام کو نہ سنیں۔ جس طرح کہ تم نے سنا ہے۔ اور اس قوم میں سات لاکھ آدمی تھے۔ پس آپ نے (اول) ان میں سے ستر ہزار انتخاب کئے۔ پھر ان میں سے سات ہزار چنے پھر ان میں سے سات ہزار اختیار کئے۔ بعد ازاں ستر آدمیوں کو اپنے پروردگار سے ہمکلام ہونے کی جگہ لے جانے کے واسطے پسند فرمایا۔ پس ان کو کوہ طور کے پاس لے گئے۔ اور ان سب کو

اور یہ آیت ہے۔ فَلَمَّا اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ۔ یعنی جب ان کو زلزلے نے گھیرا۔ تو حضرت موسےؑ نے عرض کی۔ اے میرے پروردگار۔ اگر تو چاہتا۔ تو ان کو اور مجھ کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ہمکو سفیہ اور بیوقوف لوگوں کے فعل کے سبب ہلاک کرتا ہے۔ یہ محض تیری طرف سے ہماری آزمایش ہے۔

پس حضرت موسےؑ نے اس درخواست کو سفہاء قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور حضرت کا یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ یہ سب کچھ انہی نادان لوگوں کے سبب وقوع میں آیا۔ کیونکہ انہوں نے ایسی درخواست کی تھی۔ جو اللہ تعالےٰ کیلئے جائز نہیں ہے۔

اور منجملہ ان امور کے **رویت** میں **جھرۃ** کا مذکور ہونا ہے۔ اور بالجہر دیکھنا آنکھ ہی سے ہو سکتا ہے۔ علم کے لئے جہر کی ضرورت نہیں۔ اور یہ امر اس بات کا مؤید ہے۔ کہ یہ درخواست **علم ضروری** کے لئے نہ تھی۔ جیسا کہ ہم اس کلام خداوندی کا جواب عنقریب ذکر کرینگے۔

اور منجملہ ان کے قولہ تعالےٰ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ہے۔ کیونکہ جب ہم اس آیت کو اس

(بقیہ نوٹ) پہاڑ کے نیچے کھڑا کر دیا۔ اور آپ اوپر چڑھ گئے۔ اور خدا سے سوال کیا۔ کہ خدا کلام کرے۔ اور ان لوگوں کو اپنا کلام سنائے۔ پس اللہ تعالےٰ اُن سے (موسےؑ سے) ہمکلام ہوا۔ اور اُن لوگوں نے اوپر نیچے داہنیں۔ بائیں۔ آگے پیچھے سے کلام خدا کو سُنا۔ اس لئے کہ خدا نے درخت میں کلام پیدا کیا۔ اور اس کو پھیلا دیا۔ یہاں تک کہ ہر ایک طرح سے انہوں نے اُس کلام کو سُنا۔ پس اُن لوگوں نے کہا۔ کہ ہم تجھ پر ہرگز یقین نہ کرینگے۔ کہ یہ جو کچھ ہم نے سُنا ہے۔ خدا کا کلام ہے۔ جب تک کہ ہم خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔ پس جب اُن لوگوں نے یہ بڑی بات کہی۔ اور بہت بڑی چیز کی خواہش کی۔ اور حد سے بڑھ گئے۔ تو حق سبحانہ تعالےٰ نے اُن کے اوپر صاعقہ (بجلی) بھیجا۔ اور اُس نے اُن کو ہلاک کر دیا۔ اُس وقت حضرت موسےٰؑ نے اپنے پروردگار سے عرض کیا۔ کہ جب میں واپس جاؤنگا۔ تو بنی اسرائیل سے کیا کہونگا۔ جب وہ مجھے یہ کہینگے۔ کہ تو اُن لوگوں کو لے گیا۔ اور اُن کو اس لئے قتل کر دیا۔ کہ تو اپنے اس دعوے میں سچا نہ تھا۔ کہ تجھ سے خدا نے باتیں کی ہیں اور راز بیان کئے ہیں۔ تب خداوند عالم نے اُن سب کو زندہ کیا۔ اور موسےؑ کے ساتھ بھیج دیا۔ تو پھر اُن لوگوں نے حضرت موسےؑ سے کہا۔ کہ اگر تم خدا سے یہ سوال کرتے۔ کہ خدا تمکو دکھائی دے۔ اور تم اس کو دیکھ لو۔ تو خدا تمہاری اس دعا کو قبول کر لیتا۔ اور پھر تم ہم کو خبر دیتے۔ کہ خدا کیسا ہے۔ تو ہم سب اُس کو

بات پر محمول کرینگے۔ کہ رویت کی درخواست قوم کی طرف سے تھی۔ تو ممکن ہے۔ کہ قولہ انظر الیک حقیقت پر محمول ہو۔ اور جب اس آیت کو علمِ ضروری پر حمل کیا جائے۔ تو اس کلام میں محذوف نکالنے کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کی تقدیر یوں ہوگی۔ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلٰی الْاٰیَاتِ الَّتِیْ عِنْدَھَا اَعْرِفُکَ ضَرُوْرَۃً (مجھ کو دکھلا۔ تاکہ میں ان علامات کو دیکھوں۔ جن کی موجودگی کے وقت میں بدیہی طور پر تجھکو پہچان لوں)۔ اور خاص کر اس آخری صورت میں یہ کہنا ممکن ہے۔ کہ جب مذہب صحیح تمہارے نزدیک یہ ہے۔ کہ نظر دراصل رویت نہیں ہے۔ تو جو شخص اس آیت کو قوم کی طرف سے طلبِ رویت پر محمول کرتا ہے۔ تو اس کے جواب میں قولہ اَنْظُرْ اِلَیْکَ حقیقی معنی میں کیونکر ہوگا۔

اگر تم کہو۔ کہ ممکن ہے۔ کہ بنی اسرائیل نے اسی رویت کی درخواست کی ہو جس میں نظر اور ایک خاص جہت کی شرط ضروری ہوتی ہے۔ اور حضرت موسےؑ نے انہی کی درخواست کے موافق خدا سے سوال کیا ہو۔

تو اس کے جواب میں تم سے کہا جائیگا۔ کہ تم نے اس جواب میں رویت کے سوال اور بیوی اور بیٹا اختیار کرنے اور دیگر تمام ممکنات اور محال امور مقتضیات جسمانیت

(بقیہ نوٹ) خوب اچھی طرح پہچان لیتے۔ حضرت موسےؑ نے فرمایا۔ اے لوگو۔ خدا آنکھوں سے نہیں دکھلائی دیتا۔ وہ اپنی آیات سے پہچانا جاتا ہے۔ اور اس کی نشانیوں سے اس کا علم ظاہر ہوتا ہے۔ تو پھر انہوں نے کہا۔ کہ ہم تمہاری اس بات کا یقین نہ کرینگے۔ جب تک تم خدا سے یہ سوال نہ کرو۔ پس حضرت موسےؑ نے عرض کیا۔ اے پروردگار تو نے بنی اسرائیل کا قول سنا اور تو اُن کی صلاح وبہتری کو خوب جانتا ہے۔ اُس وقت خدا نے موسےؑ کو وحی کی۔ کہ اے موسےؑ تم مجھ سے وہ سوال کرو۔ جو وہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں۔ میں اُن کی جہالت کی وجہ سے تم سے ہرگز کچھ مواخذہ نہ کرونگا۔ پس اُس وقت موسےؑ نے کہا۔ رب ارنی انظر الیک (اے پروردگار تو مجھ کو دکھلا دے۔ کہ میں تجھ کو دیکھ لوں) قال لن ترانی۔ خدا نے کہا۔ اے موسےؑ۔ تم مجھ کو ہرگز نہ دیکھو گے۔ لیکن تم اس پہاڑ کی طرف نظر کرو۔ اگر وہ اپنے مقام پر ٹھیر جائے (اور وہ پہاڑ ہل رہا تھا) تو مجھکو دیکھ لوگے۔ پس جب خدا اپنی ایک آیت کے ساتھ پہاڑ پر ظاہر ہوا (یعنی خدا نے اپنی کوئی آیت ظاہر فرمائی) تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اور موسےؑ بیہوش ہوکر گر پڑے۔ اور جب ہوش میں آئے۔ تو عرض کیا۔ اے میرے پروردگار۔ تو پاک وپاکیزہ اور جملہ نقائص وعیوب سے مبرا ومنزہ

کے سوال میں جو فرق کیا ہے۔ وہ اس طرح باطل ہو جاتا ہے۔ کہ ہم یہ کہیں۔ کہ رویت میں شک کرنا معرفتِ سمعی کی صحت کا مانع نہیں ہے۔ اور باقی اور امور مذکورہ میں سب کا مانع ہے۔ اس لئے کہ جو شک معرفت سمعی کا مانع نہیں ہے۔ وہ صرف اسی رویت میں ہو سکتا ہے۔ جس کے ساتھ نظر اور مقتضیات تشبیہ موجود نہ ہوں +

پس اگر تم یہ کہو کہ نظر کا ذکر اس پر محمول کیا جائیگا کہ اس سے مراد مجازی طور پر نفس رویت ہے۔ کیونکہ عرب کی عادت ہے کہ چیز کو اس کے طریق کے نام سے اور جو چیز اس کے قریب اور نزدیک ہو۔ اس کے نام سے موسوم کر دیا کرتے ہیں +

اس کے جواب میں ہم کہینگے۔ کہ اب تم نے ایک مجاز سے دوسرے مجاز کی طرف عدول کیا + الغرض یہ صورت کچھ قوی نہیں ہے۔ اور جو پہلی صورتیں ہم نے اس جواب کی تقویت میں ذکر کی ہیں بہتر ہیں + اور کسی شخص کو یہ کہنا مناسب نہیں ہے۔ کہ اگر موسےٰ اپنی قوم کے لئے رویت کا سوال کرتے۔ تو سوال کو اپنے نفس کی طرف منسوب نہ کرتے۔ اور یوں نہ کہتے۔ اَرِنی انظر الیک۔ اور جواب جو خدا کی طرف سے ملا۔ کہ لن ترانی۔ وہ حضرت موسےٰ ہی سے مخصوص نہ ہوتا + کیونکہ اس صورت میں اس نسبت کا وقوع میں آنا ممتنع نہیں ہے۔ حالانکہ درخواست غیر کی خاطر ہے جبکہ وہاں ایسی دلالت پائی جاتی ہے۔ جو التباس اور شک کو رفع کرتی ہے۔ اسی سبب سے جب کوئی شخص کسی غیر کے لئے کسی شخص کے پاس سفارش کرتا ہے۔ تو اس سے کہتا

(بقیہ نوٹ) ہے تبت الیک۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا۔ یعنی عرض کرتے ہیں کہ میں نے اپنی قوم کی جہالت سے اپنی اس معرفت کی طرف رجوع کیا۔ جو تیرے باب میں مجھ کو پہلے سے حاصل ہے۔ کہ دکھلائی نہیں دیتا۔ اور تیری رویت محال ہے۔ انتہیٰ۔ اس حدیث سے بخوبی واضح ہے کہ اس باب میں حضرت موسےٰ پر کوئی الزام قائم نہیں ہو سکتا۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ حضرت نے رویت کا سوال نہایت مجبوری کے عالم میں اپنی قوم سے تنگ آکر کیا تھا۔ اور وہ بھی خداوند عالم کی منشا پاکر اور اس کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کہ جب خود خدا نے فرما دیا۔ کہ موسےٰ جو یہ لوگ تم سے سوال کرتے ہیں۔ اب تم اس سے مجھ سے سوال کرو۔ پس نہ حضرت موسےٰ نے علم یقینی حاصل کرنے کے واسطے سوال کیا تھا۔ اور نہ شکوک و تردداتِ کے رفع کرنے کی غرض سے۔ اور نہ آپ نے تبت الیک جو فرمایا ہے۔ کہ میں نے تیری طرف توجہ کی سو توجہ کے اصلی معنی رجوع میں بھی

ہے۔ اَسْئَلُکَ اَنْ تَفْعَلَ بِیْ کَذَا مَکَذَا وَیُجِیْبَنِیْ اِلیٰ کَذَا وَکَذَا (میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ سے ایسا سلوک کر۔ اور میری فلاں بات کو قبول کر)۔ اور یہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ شخص جس سے سفارش کی جائے۔ جواب میں کہے۔ قَدْ اَجَبْتُکَ وَشَفَّعْتُکَ وَمَا جَرٰی مَجْرٰی ھٰذِہِ الْاَلْفَاظ (میں نے تمہاری بات مان لی۔ اور تمہاری سفارش قبول کرلی) وغیرہ وغیرہ اس کے ہم معنی الفاظ کہے) اور اس کے بھلا ہونے کی وجہ یہی ہے۔ کہ سائل کی اس درخواست میں کچھ غرض ہے۔ گو دراصل وہ درخواست غیر کی طرف راجع ہے۔ اور وہ غرض متحقق نہیں ہوتی۔ مگر اس کے اس طرح درخواست کرنے اور اس میں اس طرح تکلف کرنے سے جیسا کہ وہ اپنے سے مخصوص ہونے کی حالت میں کرتا۔

اگر کوئی کہے۔ کہ حضرت موسےؑ نے اپنی قوم کے لئے رویت کا سوال کیونکر کیا۔ جبکہ آپ کو علم تھا۔ کہ رویت الٰہی محال ہے۔ اور اگر یہ سوال جائز ہے۔ تو دیگر امور محال جسمانیت وغیرہ کا سوال بھی قوم کے لئے جبکہ وہ لوگ اس امر میں شک کریں جائز ہوگا۔

اس کے جواب میں ہم کہینگے۔ کہ رویت کی درخواست کرنا تو صحیح ہے۔ اور جس امر کا تو نے سوال کیا ہے۔ اس کی نسبت درخواست کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو رویت اللہ تعالےٰ کے جسم ہونے کی مقتضی نہ ہو۔ اس کے جواز میں شک کرنیکی حالت میں سوال کرنے سے یہ مقصود ہو۔ کہ معرفت سمعی حاصل ہو جائے۔ اور یہ کہ وہ حق سبحانہ تعالیٰ صاحب حکمت اور اپنے خبروں میں سچا ہے۔ پس یہ صحیح ہوگا۔ کہ وہ اس جواب سے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہو۔ اس امر کا محال ہونا جان لیں۔ جس کے جواز میں ان کو شک تھا۔ اور اس ذات احدیت کے جسمانیت کی بابت شک کرنے کی حالت میں معرفت سمعی کا حاصل ہونا صحیح نہیں ہے۔ پس اس کے جواب سے کچھ فائدہ اور

(بقیہ نوٹ) پر مبنی ہے۔ اور آپ کی غرض یہ ہے۔ کہ خدایا میں اپنی قوم کی اس جہالت سے کہ انہوں نے مجھ سے یہ سوال کرایا۔ اپنی اسی سابق معرفت کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ تو آنکھوں سے دیکھنے کے لائق نہیں۔ اور میں تصدیق کرتا ہوں۔ کہ تیری ذات اقدس مرئی ہونے سے اجل و ارفع ہے۔ اور تیری رویت بالکلیہ محال ہے۔ نہ تو دنیا میں دکھائی دیتا ہے۔ اور نہ آخرت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ فقط۔

علمی ثمرہ حاصل نہیں ہو سکتا +

اور اس آیت میں کلام کرنے والوں میں سے بعض متکلمین کا یہ قول ہے۔ کہ جائز تھا۔ کہ موسےؑ اپنی قوم کے لئے ایسا سوال کریں۔ جس کا محال ہونا حضرت کو معلوم تھا۔ (گو دلالت سمعی وقتِ معرفت سے پہلے ثابت نہیں ہو سکتی)۔ جبکہ ان کو معلوم ہو۔ کہ اس میں مکلفین شریعت کی بہتری ہے۔ اور جواب کا وارد ہونا ان کے لئے لطف ہے۔ تاکہ وہ دلائل میں غور کریں۔ اور ان کے ذریعے سے حق پر پہنچ جائیں + مگر اتنا ضرور ہے کہ جس شخص نے یہ جواب دیا ہے۔ اس نے یہ شرط کی ہے۔ کہ پیغمبر علیہ السلام ایسے وقت میں اس بات کو ظاہر کرے۔ کہ مجھ کو معلوم ہے۔ کہ یہ درخواست امر محال کا سوال ہے۔ اور پیغمبر کی غرض سوال کرنے سے یہ ہو۔ کہ ایسا جواب وارد ہو۔ جو بندوں کے لئے لطف ہو +

آیت مذکورہ کا دوسرا جواب۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ حضرت موسےؑ نے یہ سوال اس لئے کیا ہوگا۔ کہ اللہ تعالےٰ آخرت کی بعض نشانیاں ظاہر کرے جن کو دیکھ کر بے اختیار معرفت حاصل ہو جائے۔ بدیہی طور پر اپنی ذات اقدس کا علم مجھ کو کرائے۔ تاکہ شکوک اور شبہات کی ردوبدل اور دلی خیالات مجھ سے زائل ہو جائیں۔ اور مجھ کو لوگوں کے سامنے دلائل کے پیش کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ اور اس سبب سے میری تکلیف اور محنت کم ہو جائے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے سوال کیا تھا۔ کہ اے خدا مجھ کو دکھلا۔ کہ تو مُردوں کو کیونکر زندہ کریگا۔ اور آپ کا یہ سوال محض تخفیف محنت کی غرض سے تھا۔ گو آپ کو اس امر کی معرفت اس واقعہ کے دیکھنے سے پہلے ہی حاصل تھی + اور یہ سوال گو بلفظ رویت ہے۔ مگر **رویت علم** کا فائدہ دیتی ہے۔ جیسے **ادراک** سے **بصر** کا فائدہ حاصل ہوتا ہے + چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ شعر

رأیتُ اللہَ اذ سمّیٰ نزارًا + واسکنہم بمکۃ قاطنینَ

اور رویت علم کے معنی میں اس قدر مشہور و معروف ہے۔ کہ اس کے لئے دلیل لانے کی حاجت نہیں ہے + پس اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےؑ کے جواب میں فرمایا۔ لَنْ تَرَانِی اے لم تعلمنی علی ھذا الوجہ الذی التمستہ یعنی اس طور پر جس طرح تو نے درخواست کی ہے۔ تجھ کو میرا علم ہرگز حاصل نہ ہوگا۔ بعد ازاں اس کی

تائید کے طور پر کوہ طور پر ایسے علامات اور نشانیاں ظاہر کیں جن سے معلوم کرا دیا۔ کہ معرفت ضروریہ دار دنیا میں باوجود تکلیف شرعی اور ظہور انوار الٰہی کے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ حکمت الٰہی اس کی مانع ہے۔ اور صورت اول سب صورتوں سے بہتر ہے۔ اسی لئے ہم نے اس کو مقدم رکھا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں حضرت موسےٰ کا حال دو حالتوں سے خالی نہیں ہے۔ (۱) یا تو آپ کو اس بات میں شک تھا۔ کہ معرفت ضروریہ کا حصول دنیا میں صحیح نہیں ہے۔ (۲) یا آپ کو اس بات میں شک تھا۔ اگر آپ کو اس امر میں شک تھا۔ تو ایسے امور میں جو اصول دینی اور قواعد تکلیفیہ کی طرف راجع ہوں۔ شک کرنا انبیاء علیہم السّلام کے لئے علی الخصوص جائز نہیں ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ ان کی امت میں سے کوئی شخص ان اصول و قواعد سے حقیقی طور پر واقف ہو۔ پس وہ شخص معرفت دینی میں ان سے بڑھ کر ہوگا۔ اور یہ بات یعنی امتی کا نبی سے معرفت میں بڑھ جانا منجملہ امور منفرہ کے سب سے زیادہ نفرت خلائق کا باعث ہے۔ اور اگر حضرت موسےٰ اس بات کو جانتے تھے۔ اور ان کو اس میں شک نہ تھا۔ تو آپ کے اس سوال کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ مگر ہاں اگر یوں کہا جائے۔ کہ آپ نے اپنی قوم کے لئے ایسا سوال کیا۔ تو یہ قول پہلے جواب کا ہم معنی ہوگا۔

جواب سوم۔ بعض اہل توحید نے اس آیت کی تاویل میں یہ بیان کیا ہے۔ کہ جائز ہے۔ کہ موسےٰ علیہ السّلام کو یہ درخواست کرتے وقت اس ذات باری تعالیٰ کی رویت کے جائز ہونے میں شک ہو۔ اس لئے آپ نے اس کی بابت سوال کیا۔ تاکہ معلوم ہو جائے۔ کہ جائز ہے۔ یا نہیں۔ نیز اس کا یہ بھی قول ہے۔ کہ حضرت کا اس امر میں شک کرنا اس بات کا مانع نہیں ہے۔ کہ وہ صفات کے ساتھ معرفت الٰہی رکھتے ہوں۔ بلکہ معرفت الٰہی کے حاصل کرنے میں جن امور کی ضرورت ہے۔ ان کے خلل انداز نہ ہونے کے باب میں آپ کا یہ شک ایسا ہی ہے۔ جیسے بعض اغراض شرعی جو دکھائی نہیں دیتیں۔ ان کے جواز رویت میں شک کیا جائے۔ پھر وہ کہتا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ آپ کی یہ غلطی گناہ صغیرہ ہو۔ اور اس گناہ سے آپ نے توبہ کر لی ہو۔ مگر اس کا یہ جواب اس سبب سے نہایت ہی بعید از قیاس ہے۔ کہ رویت الٰہی جو تشبیہ کی مقتضی نہیں ہے۔ اس میں شک کرنا گو یہ صفات معرفت الٰہی کو مانع نہ ہو

مگر انبیاء علیہم السلام کے لئے ایسا شک کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے۔ کہ ان کی امت کا ایک شخص اس مسئلہ کو واقعی اور حقیقی طور پر جانتا ہو۔ اس حالت میں نبیؑ کو تو اس امر میں شک ہوگا۔ اور امتی اس کا پورا عارف۔ حالانکہ اہل امت معارف الٰہی اور اس کے جائز اور ناجائز امور کی تعلیم میں اپنے نبی کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ اور یہ امر نہایت ہی قبیح اور سب سے بڑھ کر نفرتِ خلائق کا باعث ہے۔ جن سے انبیاءؑ کو بالکل مبرّا اور منزّہ ہونا واجب ہے۔

اب اگر کوئی کہے۔ کہ پہلے دو جوابوں کی بنا پر حضرت موسےؑ نے کس چیز سے توبہ کی تھی؟

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ جس شخص کا مذہب یہ ہے۔ کہ حضرت کی یہ درخواست قوم کے لئے تھی۔ اس کا قول یہ ہے۔ کہ موسےؑ نے اس وجہ سے توبہ کی تھی۔ کہ انہوں نے اپنی قوم کے کہنے سے ایسی درخواست کرنے پر پیش قدمی کی۔ جس کی ان کو خدا کی طرف سے اجازت نہ تھی۔ اور انبیاء علیہم السّلام کو ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ ممکن ہے۔ کہ اس امر کے نہ کرنے ہی میں مصلحت ہو۔ اور بنا بریں ان کی درخواست ایسے امر کی بابت مقبول نہ ہو۔ اور دعا کا قبول نہ ہونا تنفیرِ خلائق کا باعث ہو۔ اور ان حضرات کا پوشیدہ طور پر اور اپنی قوم کی غیر حاضری میں کچھ دعا کرنا مذکورہ بالا درخواست کے مشابہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ وہ پوشیدگی میں ایسی دعا کریں۔ جن کی ان کو اجازت نہ ہو۔ تو اس حالت میں ان کی درخواست کا قبول نہ ہونا باعث تنفیر خلائق نہیں ہوسکتا۔

اور جس شخص کا مذہب یہ ہے۔ کہ حضرت موسےؑ نے معرفت ضروریہ کی درخواست کی تھی۔ اس کا قول توبہ موسےؑ کے باب میں یہ ہے۔ کہ حضرت موسےؑ نے اس لئے توبہ کی تھی۔ کہ آپ نے اس معرفت کا سوال کیا تھا۔ کہ تکلیف شرعی جس کی مقتضی نہ تھی۔

اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت موسےؑ نے اس وجہ سے توبہ کی۔ کہ انہوں نے اس وقت پہلے گناہ صغیرہ کو یاد کیا۔ اور اس مقام پر جو واجب اور ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ان کی زبانی توبہ کا ذکر بطور انقطاع الی اللہ و رجوعیت و انابت کے تھا۔ گو وہاں

کسی مشہور گناہ کا نشان تک نہیں پایا جاتا +

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس گریہ وزاری اور خشوع وخضوع اور عبادت مذکورہ بالا کے علاوہ اس توبہ کرنے میں ان کی غرض ہم کو تعلیم دینا اور اس امر سے ہم کو واقف کرنا ہو کہ آفات و بلیات کے نازل ہونے اور اہوال وخطرات کے ظاہر ہونے کے وقت اس کو استعمال کریں۔ اور اسی طرح خدا سے دعا کریں۔ اور خاص کر اس قوم خطا کار کو تنبیہ کرنا مقصود ہو۔ کہ اس رویت آلہی سے جو امر محال ہے۔ اور جس کی انہوں نے خدا سے درخواست کی تھی۔ توبہ کریں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے گو کسی قسم کی برائی وقوع میں نہیں آئی۔ مگر ان کے سوا اور لوگوں سے ضرور قبائح اور برائیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں اور وہ لوگ ان قبائح کے وقوع میں آنے کے سبب توبہ اور استغفار اور طلب مغفرت کے محتاج ہیں۔ اور یہ بات نہایت ظاہر اور واضح ہے +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے کہ خدا جو قرآن میں حضرت موسےٰ کی نسبت حکایتاً ذکر فرماتا ہے۔ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (اور تختیوں کو ڈال دیا۔ اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس نے کہا۔ اے ماں کے بیٹے (بھائی) قوم نے مجھ کو ضعیف جانا۔ اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں پس تو دشمنوں کو مجھ پر نہ ہنسا۔ اور مجھ کو ظالم لوگوں کا ہمراہی قرار نہ دے) اس کی کیا وجہ ہے؟ آیا اس آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ ہارون علیہ السلام نے کچھ ایسا امر تو ضرور کیا تھا۔ جو کہ حضرت موسےٰ کی طرف سے ان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا باعث ہوا۔ اور اب حضرت موسےٰ کی طرف سے اس امر میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ حالانکہ آپ نے بالکل کم عقلوں اور جلد بازوں کا سا فعل کیا ہے۔ اور حکماء ذیوقار اور عقلاء حکمت شعار کا یہ شیوہ نہیں ہے +

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے کہ اللہ تعالےٰ نے جو قرآن میں حضرت موسےٰ اور ہارون ؑ کے فعل کا ذکر کیا ہے۔ اس سے دونوں میں سے کسی ایک سے بھی کسی معصیت یا امر قبیح کا وقوع میں آنا ظاہر نہیں ہوتا۔ اور اس کا قصہ اس طرح پر ہے۔ کہ قوم موسےٰ نے جو انکی غیبت میں فعل (؟) کا احداث کیا تھا۔ اور جب حضرت موسےٰ

تے ان کی یہ حرکت سنی۔ تو ان کے اس فعل کو گناہِ عظیم خیال کر کے اور ان کی اس بیجا حرکت میں فکر کر کے نہایت غضب آلود واپس آئے۔ اور آتے ہی اپنے بھائی کا سر پکڑ کر ان کو اپنی طرف کھینچا۔ جیسا کہ انسان غضب و شدت تفکر کی حالت میں اپنے نفس سے کیا کرتا ہے چنانچہ تم نے دیکھا ہو گا۔ کہ آدمی فکر اور غضب کی حالت میں اپنے ہونٹوں کو کاٹتا ہے۔ اور اپنی انگلیاں مروڑتا ہے۔ اور اپنی ڈاڑھی کو پکڑتا ہے۔ پس حضرت موسےٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ کے ساتھ اپنے نفس کا سا سلوک کیا۔ اس لئے کہ وہ انکے بھائی اور ان کے شریک تھے۔ اور ان کی نیکی اور بدی بمنزلہ ان کی نیکی اور بدی کے تھی۔ پس حضرت موسےٰؑ نے ان کے ساتھ وہ برتاؤ کیا۔ کہ جو آدمی غضب اور فکر کی حالت میں اپنے نفس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ اور ان امور کے احکام بلحاظ عادات کے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ پس جو بات بعض کے نزدیک اکرام و عزت میں داخل ہوتی ہے۔ وہ اوروں کے نزدیک استخفاف اور توہین میں شمار کی جاتی ہے۔ اور جو بات ایک مقام میں داخل استخفاف ہوتی ہے۔ وہ دوسرے مقام میں داخل اکرام ہوتی ہے۔ اور یہ جو حضرت ہارونؑ نے اپنے بھائی سے کہا۔ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي (اے بھائی تم میری ڈاڑھی اور سر کو نہ پکڑو) سو ان کا یہ قول اس بات پر دلالت نہیں کرتا۔ کہ وہ استخفاف اور بیعزتی کے طور پر وقوع میں آیا تھا۔ بلکہ ممکن ہے۔ کہ ہارونؑ کو یہ خوف ہوا ہو۔ کہ کہیں بنی اسرائیل اپنی بدظنی سے یہ خیال نہ کریں۔ کہ موسےٰؑ اس سے لڑ رہے ہیں اور عتاب و خطاب کر رہے ہیں۔ پھر اپنے حال کی شرح کرنے لگے۔ اور اثنائے تقریر میں بیان کیا۔ جیسا کہ خدا حضرت ہارونؑ کی زبانی فرماتا ہے۔ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي میں ڈرا۔ کہ کہیں تم یہ نہ کہو۔ کہ اے ہارونؑ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ اور میرے قول کو نگاہ نہ رکھا۔ اور دوسرے مقام میں ان کی زبانی منقول ہے۔ يَا ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي اے ماں جائے بھائی قوم نے مجھ کو ضعیف و حقیر جانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ممکن ہے۔ کہ آپ کا قول لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي (اے بھائی میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑو) ناراضگی اور خفگی کے طور پر نہ ہو۔ بلکہ آپ کے اس کلام کا مطلب یہ ہو کہ اے بھائی غضبناک نہ ہو۔ اور اپنی بے صبری اور تاسف کو مت بڑھاؤ۔ کیونکہ جب ہم حضرت موسےٰؑ کے اس فعل کو غضب اور بے صبری کی دلیل ٹھہرائینگے۔ تو حضرت ہارونؑ کا حضرت موسےٰؑ کو

اس فعل سے نہی کرنا در اصل غضب و جزع سے نہی کرنا ہوگا +

اور بعض کا قول یہ ہے۔ کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسےؑ کے پیچھے ناشائستہ حرکت کی۔ تو یہ حالت دیکھ کر آپ کو نہایت حزن وملال اور سخت بیقراری اور بے صبری لاحق ہوئی۔ اور دیکھا کہ آپ کے بھائی حضرت ہارونؑ کی بیقراری اور قلق کا بھی یہی حال ہے۔ تب آپ نے اظہار دردمندی اور تسکین دلانے کی غرض سے ان کا سر پکڑا۔ جیسا کہ ہم لوگوں میں دستور ہے۔ کہ جس شخص پر کوئی سخت مصیبت پڑتی ہے اور وہ اس کے سبب بے صبر ہوتا اور گھبراہٹ اور قلق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے اور لوگ اظہار دردمندی کرتے اور اس کو تسکین اور تسلی دلایا کرتے ہیں + اس جواب کے مطابق حضرت ہارونؑ کا قول لَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَاءَ حضرت موسےؑ کے اس فعل سے متعلق نہ ہوگا۔ بلکہ یہ ایک جدید کلام اور الگ فقرہ ہوگا +

اور آپ کا قول لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي اس جواب کے موافق اس معنی پر محتمل ہوگا۔ کہ حضرت ہارونؑ کی مراد اس سے یہ ہوگی۔ کہ اے بھائی۔ ایسا نہ کیجئے۔ اگرچہ آپ کا منشا مجھ کو تسکین دلانے کا ہے۔ مگر قوم یہ گمان کریگی۔ کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں +

اور ایک جماعت کا اس آیت میں یہ مقولہ ہے۔ کہ بنی اسرائیل حضرت موسےؑ سے نہایت بدظن تھے۔ یہاں تک کہ حضرت ہارونؑ کچھ عرصے کے لئے کہیں چلے گئے۔ اس پر انہوں نے حضرت موسےؑ کو تہمت لگا دی تھی۔ کہ تم نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ پس جب کہ اللہ تعالےٰ نے موسےؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا۔ اور دس راتیں اور بڑھا کر یعنی چالیس راتوں کے بعد اس وعدے کو پورا کیا۔ اور آپ کے لئے الواح یعنی تختیوں میں تمام احکام شریعت تحریر فرمائے۔ اور نہایت شریف اور عظیم الشان امور سے آپ کو خصوصیت بخشی۔ کہ پہاڑ پر اپنی نشانی ان کو دکھائی۔ اور ان سے ہم کلام ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ نہایت بزرگ اور شریف امور سے آپ کی عزت افزائی کی۔ بعد ازاں جب حضرت کوہ طور سے واپس آئے۔ تو اپنے بھائی ہارونؑ کا سر پکڑا۔ تاکہ ان کو اپنے قریب کریں۔ اور جو نئی باتیں اللہ نے عنایت کی ہیں۔ ان کو تعلیم کریں۔ اور ان کو

یہ بشارت پہنچائیں۔ اس وقت حضرت ہارونؑ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں بنی اسرائیل کے دلوں میں کوئی بے اصل خیال پیدا نہ ہو جائے۔ اس سے اپنے بھائی موسےٰؑ کی نسبت بدگمانی پیدا ہونے کے ڈر سے فرمایا۔ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي اے بھائی آپ جو اسرار الٰہی مجھ کو تعلیم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس غرض سے آپ نے میرے سر کو اپنے نزدیک کیا ہے۔ آپ ان کے روبرو ایسا نہ کریں۔ تا کہ کہیں یہ لوگ آپ کی نسبت ایسی بدگمانی نہ کریں جو آپ کے لئے جائز اور آپ کی شان کے لائق نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ - اگر کوئی کہے کہ ان آیات کا کیا مطلب ہے جنمیں خدا تعالیٰ حضرت موسےٰؑ اور ایک عالم کی صحبت کا ذکر کرتا ہے۔ اور وہ عالم بعض مفسرین کے قول کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اور ان آیات کی ابتدا یہ ہے۔ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَن شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ..... الخ۔

اس میں تم سے پہلی دریافت طلب بات یہ ہے۔ کہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ موسےٰؑ غیر شخص کی متابعت کرے۔ اور اس سے علم حاصل کرے۔ حالانکہ تمہارے مذہب کی

سلہ ان آیات سے جو ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت موسےٰؑ کو اُن بواطن کا علم نہ تھا۔ جس کی بنا پر اُس عالم (خضر بنا بر بعض اقوال) نے کشتی کو غرق اور لڑکے کو قتل کیا دیوار گرا کر بنایا۔ اور یہ امر اُنکی نبوت میں کسی طرح قادح نہیں ہو سکتا کیونکہ فوق کل ذی علم علیم۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ جملہ انبیاء کو جملہ بواطن کا بھی علم ہو۔ ان علوم میں انبیاء کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔ یہ علوم حسب ضرورت وموافق مصلحت مبدء فیاض سے ہر ایک نبی کو اُس کی شان کے لایق عطا ہوتے ہیں۔ اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے۔ کہ ان بعض علوم خاصہ کے نہ جاننے سے حضرت موسےٰؑ سے حضرت خضرؑ افضل ہو جائیں۔ اس لئے کہ گو یہ بعض علوم حضرت موسےٰؑ کو عطا نہ ہوئے تھے۔ لیکن بہت سی وجوہات فضیلت اُن میں موجود ہیں۔ حضرت کو تسعہ آیات نو معجزے عطا ہوئے۔ جن میں سے ایک ید بیضا ہے۔ حضرت کلیم اللہ ہوئے۔ خدا اُن سے بلا واسطہ ہمکلام ہوتا تھا۔ وغیرہ ذالک کہ جن میں سے ایک بات بھی حضرت خضرؑ میں نہیں پائی جاتی۔ اور نہ خدا کا ایک نبی کے ذریعہ دوسرے

رُو سے جائز نہیں ہے کہ پیغمبرؑ اپنے غیر کا محتاج ہو۔ اور کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ شخص حضرت موسےٰؑ سے کہے۔ لَن تَستَطِیعَ مَعِیَ صَبراً کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ اور استطاعت سے مراد تمہارے نزدیک قدرت ہے۔ اور تمہارے مذہب کے موافق حضرت موسےٰؑ صبر کی قدرت رکھتے تھے۔ اور حضرت موسےٰؑ نے یہ کیوں فرمایا۔ سَتَجِدُنِی اِن شَاءَ اللہُ صَابِرًا وَّلَا اَعصِی لَکَ اَمرًا (اگر خدا چاہے تو تم مجھ کو صابر پاؤ گے۔ اور میں کسی امر میں تمہاری نافرمانی نہ کرونگا) صبر کے لئے تو مشیت الٰہی کی شرط لگائی۔ مگر اطاعت گزاری اور نافرمانی سے بچے رہنے کو مطلق طور پر بیان کیا۔ اور اس میں کچھ قید اور شرط نہیں لگائی۔ اور اس عالم سے حضرت موسےٰؑ نے یہ کیوں کہا۔ لَقَد جِئتَ شَیئًا اِمرًا وَشَیئًا نُکرًا یعنی تو نے بُرا کام کیا۔ حالانکہ خود حضرت نے اصل میں بُرا کام کیا تھا۔ اور حضرت موسےٰؑ نے جو اس عالم سے فرمایا۔ لَا تُؤَاخِذنِی بِمَا نَسِیتُ مجھ کو اس امر میں مواخذہ مت کرو۔ جس میں مجھ سے بھول چوک ہو گئی۔ اس سے کیا مراد ہے۔ حالانکہ تمہارے نزدیک نسیان اور بھول کو انبیاءؑ سے منسوب کرنا جائز نہیں ہے اور موسےٰ علیہ السّلام نے اس لڑکے کو جس کو اس عالم نے قتل کر دیا تھا۔ نفس زکیہ کیوں کہا۔ حالانکہ اصل میں وہ ایسا نہ تھا۔ اور اس لڑکے کی بابت یہ کیوں کہا گیا۔ فَخَشِینَا اَن یُّرهِقَهُمَا طُغیَانًا وَّکُفرًا (پس ہم ڈرے کہ وہ اپنے والدین کو سرکشی اور کفر سے نہ گھیر لے) اگر اس سے ڈرنے والا جیسا کہ ایک جماعت مفسرین کا خیال ہے۔ اللہ تعالےٰ ہے تو یہ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ڈرنا اس ذات اقدس کو نازیبا اور ناجائز ہے۔ اور اگر ڈرنے والا خضرؑ ہے۔ تو ڈر کی وجہ سے لڑکے کا خون کیونکر مباح جان لیا۔ جبکہ ڈرنا علم اور یقین کا باعث نہیں ہو سکتا۔

جواب۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ان آیتوں میں جس عالم کی تعریف بیان کی

(بقیہ نوٹ) نبی کو کوئی علم تعلیم کرنا قادح فی النبوۃ ہو سکتا ہے۔ اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السّلام تمام علوم کے عالم ہوتے ہیں۔ تو یہ مراد نہیں کہ جمیع العلوم علی الاطلاق بلا استثناء ان کو آتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ جو علوم محتاج الیہ امت ہوں۔ اور امت کو ضرورت پڑے۔ خواہ تعلیمی ہوں۔ یا تشریعی۔ دینی ہوں یا دنیوی۔ اُن سب کا جاننا نبی کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ غرض بعثت پوری نہ ہوگی۔ والباقی ھو الکافی۔

ہے۔ وہ ضرور نبی صاحب فضیلت ہوگا۔ اور یہ بھی قول ہے۔ کہ وہ خضر علیہ السلام تھے۔
مگر ابوعلی اس قول کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور کہتا ہے۔ کہ یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ خضر علیہ السلام
کی بابت یہ قول ہے۔ کہ وہ بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں میں سے ہیں۔ جو حضرت موسےٰؑ
کے بعد مبعوث ہوئے۔ اور یہ ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اس عالم کو وہ باتیں تعلیم
کی ہوں۔ کہ جو حضرت موسےٰؑ کو نہ سکھائی تھیں۔ اور موسےٰ علیہ السلام کو ہدایت کی۔ کہ
اس عالم کے پاس جاؤ۔ اور اس سے وہ باتیں سیکھو۔ اور بُری اور نازیبا بات یہ ہوتی
ہے۔ کہ پیغمبر علم میں اپنی امت کے کسی شخص کی احتیاج رکھتا ہو۔ اور اگر وہ ایسے شخص کا
محتاج ہو۔ جو اس کی امت میں داخل نہیں۔ تو جائز ہے اور حضرت موسےٰؑ کا اس
عالم سے سیکھنا ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ حامل وحی فرشتے سے وحی الٰہی کو سیکھا کرتے
تھے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ وہ عالم کل علوم میں حضرت موسےٰؑ سے
افضل تھا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ ماسوا اس علم کے جو حضرت نے اس عالم سے سیکھا
تھا۔ دیگر اشرف اور اعلےٰ علوم میں حضرت موسےٰؑ اس عالم پر فوقیت رکھتے ہوں۔
چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ہم میں سے ایک شخص بات کو جانتا ہے۔ اور اس
کے ذریعہ ایک اور شخص کو جو علم میں اس سے افضل اور اشرف ہے۔ وہ بات معلوم
کرائی جاتی ہے۔

اور لَنْ تَسْتَطِيْعَ کہکر جو اس عالم نے حضرت موسےٰؑ سے استطاعتِ صبر کی
نفی کی۔ سو اس سے اس عالم کی مراد یہ ہے۔ کہ صبر کرنا تم پر آسان نہ ہوگا۔ بلکہ تمہاری
طبیعت پر نہایت گراں گزریگا۔ چنانچہ ہم میں سے ایک شخص دوسرے سے کہتا
ہے۔ اِنَّكَ لَا تَسْتَطِيْعُ اَنْ تَنْظُرَ اِلَيَّ (تو میری طرف نہ دیکھ سکیگا)۔ اور جس مریض
کو روزہ رکھنا دشوار ہو۔ گو وہ اس کی قدرت رکھتا ہو۔ کہا جاتا ہے۔ اِنَّكَ لَا تَسْتَطِيْعُ
الصِّيَامَ وَلَا تُطِيْقُهٗ (یعنی تو روزہ نہ رکھ سکیگا اور تو اس کی تاب نہ لائیگا)۔ اور کبھی
لفظ استطاعت سے نفس فعل مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ قرآن میں حواریانِ
حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی زبانی ذکر فرماتا ہے۔ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (آیا تیرا پروردگار آسمان پر سے ایک خوانِ طعام ہم پر نازل کریگا؟)
بنا بریں گویا اس عالم نے حضرت موسےٰؑ سے یہ کہا۔ انک لن تصبر ولن یقع منک الصبر

یعنی تو صبر نہ کریگا۔ اور تجھ سے صبر وقوع میں نہ آئیگا۔ اور اگر وہ عالم حضرت موسےؑ سے قدرت صبر کی نفی کرتا جیسا کہ ان جاہلوں کا گمان ہے۔ تو اس صورت میں وہ عالم اور حضرت موسےؑ اس بات میں یکساں تھے۔ پھر حضرت موسےؑ سے خاص کر کے نفی استطاعت کے کیا معنی ۔ اب رہی یہ بات کہ اس عالم نے حضرت موسےؑ سے صبر کی نفی کی ہے۔ نہ کہ استطاعت کی ۔ اس پر حضرت موسےؑ کا قول دلالت کرتا ہے۔ جو اس عالم کے جواب میں ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللهُ صَابِرًا (اگر اللہ چاہے۔ تو عنقریب تو مجھ کو صبر کرنے والا پائیگا)۔ اور حضرتؑ نے بجائے اس کے سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللهُ مُسْتَطِيعًا نہیں فرمایا۔ اور جواب کا حق بھی یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ کلام اول یا سوال کے مطابق ہو۔ پس اس جواب سے معلوم ہو گیا۔ کہ قول اول میں استطاعت سے صرف نفس فعل مراد ہے ۔

اور حضرت موسےؑ کا اس کے جواب میں دوسرا فقرہ وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا فرمانا سو یہ بھی جواب اول کی طرح مشروط بہ مشیت الٰہی ہے۔ مطلق اور غیر مقید نہیں ہے۔ جیسا کہ سائل کہتا ہے ۔ یعنی یہ فرمایا کہ اگر خدا چاہے۔ تو میں کسی امر میں تیری نافرمانی نہ کرونگا۔ گویا حضرت موسےؑ نے یہ جواب دیا۔ ستجدنی صابرًا ولا اعصی لك امرًا انشاء اللہ۔ صرف اتنی بات ہے۔ کہ شرط کو دونوں امروں پر مقدم کر دیا ہے۔ اور یہ بات کلام سے ظاہر ہے ۔

اور یہ جو اس عالم سے حضرت موسےؑ نے فرمایا۔ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا اس میں بعض مفسرین کا یہ قول ہے۔ کہ شَيْئًا إِمْرًا سے مراد شیئًا عجبًا ہے۔ یعنی تو نے عجیب کام کیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ اس سے مراد شیئًا منکرًا ہے۔ اور بعض کا قول ہے۔ کہ اِمر کے معنی داهیۃ۔ گویا یوں کہا۔ جئت داهیۃ۔ بعض اہل لغت یہ کہتے ہیں۔ کہ لفظ اِمر أَمِرَ القوم (یعنی قوم بہت کثیر ہو گئی) سے مشتق ہے۔ اور اس سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے۔ جو بہت عجیب ہو ۔ اور جب اس لفظ کو عجب کے معنی میں لیا جائے۔ تو اس میں سوال کی ذرا گنجایش نہیں ہے۔ اور اگر منکر کے معنی میں استعمال کیا جائے۔ تو اس کا اور قولہ لقد جئت شیئًا نکرًا کا ایک ہی جواب ہوگا۔ اور اس جواب کی کئی صورتیں ہیں ۔

صورت اول - یہ کہ حضرت موسےٰ نے اس عالم سے کہا - کہ اِنَّ ظَاہِرَ مَا اَتَیْتَہٗ اَلْمُنْکَرُ جو کام کہ تو نے کیا ہے - یہ ظاہر میں برا معلوم ہوتا ہے - اور جو شخص اس کو دیکھتا ہے - برا جانتا ہے جب تک کہ اس کی وجہ اس کو نہ بتلائی جائے +

صورت دوم - یہ کہ یہاں سے شرط محذوف ہے - گویا آپ کی مراد یہ تھی - اِنْ كُنْتَ قَتَلْتَهٗ ظَالِمًا فَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا - اگر تو نے ظلم سے اس کو قتل کیا ہے تو تو نے برا کام کیا ہے +

صورت سوم - یہ کہ آپ کی مراد یہ تھی - کہ اَتَیْتَ اَمْرًا بَدِیْعًا غَرِیْبًا تو نے نہایت عجیب اور نادر کام کیا ہے - کیونکہ اہل عرب جس چیز کو عجیب و غریب پاتے ہیں - اور اس کی علت ان کو معلوم نہیں ہوتی - اس کے لئے کہتے ہیں - انہ فنکر و منکر کہ یہ چیز نہایت عجیب و غریب ہے - کہ ہم اس کی ماہیت سے واقف نہیں اور یہ امر ناممکن نہیں ہے - کہ یہ کلام بطور استفہام اور تقریر کے ہو - نہ بطور یقین کے دیکھو - قول حضرت موسےٰ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا اور اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ میں دونو جگہ حرف استفہام موجود ہے - اور یہ ظاہر ہے - کہ اگر کشتی کا توڑنا غرق کرنے کی نیت سے ہو - تو بیشک اس نے برا کام کیا - اسی طرح اگر قتل نفس بطور ظلم کے ہو - تو وہ بھی فعل منکر کہلائیگا +

اور حضرت موسےٰ نے جو یہ فرمایا کہ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ - اس میں تین صورتیں مذکور ہیں +

صورت اول - یہ کہ آپ کی مراد نسیان معروف ہو - اور لمبی مدت کے سبب یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے - اس لئے کہ انسان کبھی کثرت اشغال اور مصروفیت قلب کے سبب ایسی بات کو بھول جایا کرتا ہے - جو ابھی تھوڑی دیر گذرے ہو چکی ہو +

صورت دوم - یہ کہ آپ کی مراد اس سے لَا تُؤَاخِذْنِیْ مَا تَرَکْتُ ہے - یعنی جو چیز میں نے ترک کر دی - اس کا مواخذہ مجھ سے مت کر - اور یہ قول بعینہ ایسا ہے - جیسے خدا فرماتا ہے - وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ - اس میں نسی بمعنی ترک ہے - اور یہ صورت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے - کہ اس نے

ابی بن کعب سے اور اس نے جناب رسالت مآب صلعم سے روایت کی ہے۔ کہ حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ حضرت موسےٰ نے جو اس عالم سے فرمایا۔ لا تواخذنی بما نسیت۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ بما ترکت من عہدک یعنی میں نے جو تیرے عہد کو ترک کر دیا۔ اس کا مواخذہ مجھ سے مت کر۔

صورت سوم۔ یہ ہے۔ کہ آپ کی مراد اس سے لا تواخذنی بما فعلتہ مما یشبہ للنسیان ہے۔ یعنی میرے اس فعل کا جو نسیان کے مشابہ ہے۔ مجھ سے مواخذہ مت کر۔ پس اپنے اس فعل کو مشابہت کی وجہ سے نسیان کے نام سے نامزد کر دیا۔ جیسا کہ موذن یوسف علیہ السلام نے آپ کے سب بھائیوں کو کہا تھا۔ انکم لسارقون تم چور کے مشابہ ہو۔ اور جس طرح اس حدیث کی تاویل کی جاتی ہے۔ جو ابوہریرہ کی زبانی آنحضرت صلعم سے مروی ہے۔ کہ حضرت نے فرمایا۔ کذب ابراھیم ثلث کذبات فی قولہ سارۃ اختی وفی قولہ بل فعلہ کبیرھم ھذا وقولہ انی سقیم۔ اگر یہ حدیث صحیح ہو۔ تو اس سے مراد یہ ہوگی۔ کہ حضرت ابراہیم نے ایسے تین فعل کئے۔ جو ظاہر میں کذب معلوم ہوتے تھے۔ نہ کہ معاذ اللہ در اصل کذب تھے۔ اور جب ہم لفظ نسیت کو نسیان حقیقی پر محمول نہ کریں۔ بلکہ اس کے سوا پر محمول کریں۔ تو اس میں سوال کی گنجایش ہی نہیں۔ اور اگر نسیان حقیقی پر محمول کریں۔ تو اس میں یہ صورت ہوگی۔ کہ پیغمبر جو حکم خدا کی طرف سے امت کو پہنچاتا ہے۔ اس میں یا اپنی شریعت میں یا ایسے امر میں جو باعث نفرت خلق ہو۔ نسیان جائز نہیں ہے۔ مگر جو امر کہ امور مذکورہ بالا سے خارج ہے۔ اس میں نسیان ہونا ممکن ہے۔ دیکھو۔ اگر پیغمبر سے اپنے کھانے یا پینے میں ایسے طور پر جو بالاستمرار اور پے در پے نہ ہو۔ نسیان یا سہو وقوع میں آئے۔ تو اس کو مغفل کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ایسا ہونا ممکن ہے۔

اور حضرت موسےٰ نے جو اس لڑکے کو جس کو اس عالم نے حکم خدا سے قتل کر ڈالا تھا نفس زکیہ یعنی پاکیزہ نفس کہا۔ اس کی بابت ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ کہ وہ محل استفہام

مؤلف۔ سہو و نسیان کسی امر میں بھی پیغمبر کے لئے جائز نہیں۔ و ھذا قال بعض المحققین القول بجواز السھو والنسیان علی النبی اول انکار النبوۃ۔ پیغمبر کے لئے سہو و نسیان کا قائل ہونا اول انکار نبوت ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

میں ہے۔ نہ کہ بطور اخبار کے۔ اور جب کہ استفہام کے طور پر ہوا۔ تو اس پر کسی قسم کا اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس نفس کے باب میں مفسروں کا باہم اختلاف ہے۔ اکثر کا قول یہ ہے۔ کہ وہ نا بالغ لڑکا تھا۔ اور خضرؑ اور موسےٰ علیہ السلام ایک جگہ پر سے گذرے۔ کہ لڑکے وہاں کھیل رہے تھے۔ خضرؑ نے ان میں سے ایک لڑکے کو پکڑا۔ اور زمین پر لٹا کر چھری سے ذبح کر ڈالا ✤

اور جو لوگ اس تفسیر کے قائل ہیں۔ ان پر واجب ہے۔ کہ لفظ زکیۃ کو اس پر محمول کریں۔ کہ وہ زکا سے مشتق ہے۔ جو زیادۃ اور نما کے معنی میں ہے۔ نہ کہ زکاء سے جو طہارت فی الدین کے معنی میں ہے۔ زکا و بمعنی زیادت اور نما کی مثال اہل عرب کا قول ہے۔ کہ جب زمین کی چراگاہیں اور سبزہ زار زیادہ ہو جاتے ہیں۔ تو کہتے ہیں۔ زکت الارض تزکوا ✤

اور ایک جماعت کا یہ قول ہے۔ کہ وہ مقتول ایک مرد بالغ اور کافر تھا۔ اور حضرت موسےٰؑ کو اس کا قابل قتل ہونا معلوم نہ تھا۔ اس لئے اس کی بابت دریافت کیا ✤ اور جب ان مفسروں سے قولہ تعالےٰ حتی اذا لقیا غلامًا فقتلہ کی بابت سوال کیا جاتا ہے۔ کہ تم کہتے ہو۔ کہ وہ مرد بالغ تھا۔ اور یہاں آیت میں لفظ غلام آیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں۔ کہ قاعدۂ عرب کے موافق رجل کو اگرچہ وہ بالغ ہو۔ غلام کہنا ممکن ہے ✤

اور رہا آیہ فخشینا ان یرھقھما طغیانًا وکفرًا۔ سو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خشینا یعنی ڈر عالم کی طرف منسوب ہے۔ نہ کہ خدا کی طرف۔ اور خشیۃ سے مراد اس مقام میں بقول بعض مفسرین علم ہے۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔ وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِھَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا۔ اور دوسری آیت میں ہے۔ اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللہِ۔ اور مقام میں خدا فرماتا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً۔ ان سب آیتوں میں خوف بمعنی علم ہے۔ اور خشیۃ اور خوف دو لو مرادف ہیں۔ اس صورت میں اس آیت کے یہ معنی ہوئے سوا تنی علمت باعلام اللہ متی ابقی کفر ابویہ ومتی قتل بقیا علی ایمانھما فصار تبقیتہ مفسدۃ ووجب اخترامہ (کہ اللہ تعالےٰ نے مجھکو معلوم کرا دیا ہے۔ کہ اگر وہ زندہ

رہیگا۔ تو اپنے والدین کو کافر بنا دیگا۔ اور اگر قتل ہو جائے۔ تو وہ اپنے ایمان پر قائم رہینگے۔ پس اس کا باقی رکھنا باعث فساد ہے۔ اور اس فساد کا رفع کرنا واجب ہے)۔ اور یہ ایک ہی بات ہے۔ خواہ خدا خود مار ڈالے۔ یا اس کے قتل کا کسی اور کو حکم دے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خشیۃ اس آیت میں ایسے خوف کے معنی میں ہے۔ جو یقینی اور قطعی نہ ہو۔ اور یہ جواب اس شخص کے جواب کے مطابق ہے۔ جو اس بات کا قائل ہے کہ غلام جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ وہ کافر تھا۔ اور اپنے کفر کے سبب قتل کا سزاوار تھا۔ اور علاوہ ازیں یہ خوف تھا۔ کہ وہ والدین کو کفر میں داخل نہ کر دے۔ اور ان کی نظروں میں اس کو زینت نہ دے۔

اور بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ خشیتاً اس آیت میں کراہیۃ کے معنی میں ہے۔ چنانچہ کوئی شخص کہے۔ فَرَّقْتُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ خَشْيَةَ اَنْ يَقْتَتِلَا یعنی دو شخصوں کو جدا جدا کر دیا۔ کیونکہ میں نے اس بات کو مکروہ سمجھا۔ کہ وہ باہم لڑیں پس اس تاویل کے موافق اور تاویل مذکورہ کے مطابق جس میں خشیۃ بمعنی **علم** ہے خشیۃ کو اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔

اگر کوئی کہے ۔ کہ آیہ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (یعنی وہ کشتی چند مسکین شخصوں کا مال تھی۔ جو سمندر میں کام کرتے تھے) کے کیا معنی ہیں کیونکہ بحری کشتی بڑی قیمتی ہوتی ہے پس اس کے مالک کو مسکین کہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ اور مسکین ایک گروہ کے نزدیک فقیر سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ اور یہ کیوں کہا۔ وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا (اور ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ لیا کرتا تھا)۔ حالانکہ جو شخص ان کے پیچھے تھا۔ اس کے شر سے وہ بچ آئے تھے۔ اور اس کی تکلیف سے ان کو نجات حاصل ہو چکی تھی۔ اور ڈر تو ہمیشہ اسی چیز سے ہوا کرتا ہے۔ جو آگے آنے والی ہو۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں ۔ کہ قولہ لمساکین کی کئی وجہیں ہیں:-

وجہ اول ۔ یہ کہ اس آیت میں مسکنت سے فقر مراد نہیں لی گئی۔ بلکہ یہاں مسکین سے بے یار و مددگار اور بے حیلہ وسیلہ اشخاص مقصود ہیں۔ چنانچہ جس شخص کا کوئی دشمن ہو۔ جو اس پر ظلم اور جبر کرتا ہو۔ اور طرح طرح کے نقصان پہنچاتا ہو۔ اس کو

کہتے ہیں۔ کہ وہ شخص مسکین اور مستضعف ہے۔ گو وہ کیسا ہی مالدار اور خوشحال کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اسی کے مطابق حدیث میں حضرت ؐ سے منقول ہے۔ مسکینٌ مسکینٌ رجلٌ لا ذوجۃ لہ۔ مسکین وہ شخص ہے جس کی زوجہ نہ ہو۔ اس حدیث میں اس شخص کو محض عجز اور قلت حیلہ کے باعث مسکین کہا گیا۔ گو وہ مالدار اور خوشحال ہی کیوں نہ ہو +

وجہ دوم۔ یہ کہ جس شخص کے پاس صرف ایک بحری کشتی ہو۔ کہ اس کی معاش کا دارومدار صرف اسی پر ہو۔ اور اسی کے ذریعہ اپنی روزی کماتا ہو۔ وہ بمنزلہ گھر کے ہے جس میں کوئی فقیر آدمی خود اپنے عیال سمیت رہتا ہو۔ اور اس کے سوا دوسرا گھر اس کو میسر نہ آسکے۔ ایسا شخص اس کشتی کی طرف مضطر ہوگا۔ اور اس کا حیلہ وسیلہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ پھر اگر ایک جماعت اس میں اس کی شریک ہو۔ کہ ایک ادنےٰ جز اس کی ملکیت میں ہو۔ تب تو وہ بہت ہی بدحال اور شکستہ بال ہوگا۔ اور اس کی فقیری اور محتاجی اظہر من الشمس ہوگی +

وجہ سوم۔ یہ ہے۔ کہ لفظ مساکین کو مسّاکین بتشدید سین وبفتح نون بعض قاریوں نے پڑھا ہے۔ اگر یہ قرأت صحیح ہو۔ تو مساکین سے مراد بخلاء ہوگی۔ پھر اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی +

اور آیت وَکَانَ وَرَاءَھُمْ مَلِکٌ میں لفظ وراء کے معنی آگے اور پیچھے دونو آتے ہیں پس اس مقام میں وہ آگے کے معنی میں ہے۔ اور اس پر قولہ تعالےٰ وَمِنْ وَرَائِہٖ جَھَنَّمُ شاہد ہے۔ کہ یہاں مِنْ وَرَائِہٖ کے معنی مِنْ قُدَّامِہٖ وبین یدیہ کے ہیں۔ اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

لیس علی طول الحیوۃ ندام + ومن وراء المرء مالا یعلم

اور دوسرا شاعر کہتا ہے۔ شعر

الیس ورای ان تراخت منیتی + لزوم العصی تحنی علیہا الاصابع

اور اس میں شک نہیں ہے۔ کہ ان تمام مثالوں میں وراء کے معنی قدام یعنی آگے کے ہیں۔ اور بعض عربی دانوں کا قول ہے۔ کہ لفظ وراء کو قدام کے معنی میں لینا اسی وقت مناسب ہے۔ جب وہ چیز جس کی بابت لفظ وراء سے خبر دی گئی ہے۔ اس کی نسبت یہ معلوم ہو۔ کہ وہ ضرور پہنچ جائیگی۔ پھر آگے بڑھ جائیگی۔ اور پیچھے چھوڑ جائیگی۔ پس اہل عرب کہتے ہیں۔ البرد وراءک۔ اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ جاڑا تیرے آگے ہے۔

اس لئے کہ وہ جانتے ہیں۔ کہ جاڑا ضرور پہنچیگا۔ پھر آگے بڑھ جائیگا ❖

وجہ دوم یہ ہے۔ کہ کان ورائھم سے مراد یہ ہو۔ کہ وہ ظالم بادشاہ ان کے پیچھے تھا۔ اور واپس آتے وقت ان کے رستے میں پڑتا تھا۔ کہ وہ کسی طرح اس سے الگ نہ ہو سکتے تھے۔ اور نہ اس راہ پر سے گزرنے کے سوا ان کو چارہ تھا۔ پس اس عالم نے کشتی کو توڑ دیا۔ تاکہ واپسی کے وقت وہ اس کشتی کو نہ پکڑے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ وراءھم کے معنی پیچھے کے لئے جائیں۔ اس بنا پر کہ وہ ان کی تلاش اور جستجو میں تھا۔ واللہ اعلم بمرادہ ❖

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قول تعالٰے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَکَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا (اے ایماندارو ان لوگوں کی مانند مت ہو جنہوں نے موسٰےؑ کو اذیت دی۔ پس اللہ تعالٰے نے ان کے اقوال سے اس کو نجات دی۔ اور وہ اللہ کے نزدیک وجیہ اور صاحب رتبہ تھا) کے کیا معنی ہیں۔ کیا احادیث میں یہ وارد نہیں ہوا ہے۔ کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسٰےؑ کو یہ تہمت لگائی تھی۔ کہ وہ ادر (جس کے دونو خصیے پھول جائیں) اور ابرص (جس کو برص کا مرض ہو) ہیں۔ اور حضرت نے ایک دفعہ غسل کے ارادہ سے اپنے کپڑے اُتار کر ایک بڑے پتھر پر رکھ دئے۔ اس وقت اللہ تعالٰے کے حکم سے وہ پتھر اس مقام سے متحرک ہو کر چلا گیا۔ اور حضرت موسٰےؑ ننگے رہ گئے۔ اور وہ اسی حالت میں بنی اسرائیل کی محفلوں اور مجمعوں میں پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان کو دیکھ کر جان لیا۔ کہ ان کو کسی قسم کا عارضہ نہیں ہے ❖

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ جو روایت اس معنی میں وارد ہوئی ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ جائز نہیں ہے۔ کہ اللہ تعالٰے اپنے پیغمبر کی ایسی ہتک عورت کرے۔ جو کہ روایت میں مذکور ہے۔ تاکہ اس کو اس تہمت سے بری کرے۔ کیونکہ خدا کو قدرت تھی۔ کہ ان کو اس تہمت سے ایسے طور پر بری کرے۔ جس میں ان کی ایسی رسوائی اور فضیحت نہ ہو۔ اور جو شخص انبیاؑ کے منازل و مراتب سے واقف ہے۔ وہ ان کو ایسی تہمت نہیں لگا سکتا۔ اور جو روایت اس باب میں صحیح ہے۔ وہ مشہور ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جب حضرت ہارونؑ کا انتقال ہو گیا۔ تو بنی اسرائیل نے

حضرت موسےٰؑ پر تہمت لگائی۔ کہ انھوں نے ہارونؑ کو قتل کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت ہارونؑ کی طرف بہت مائل تھے۔ پس اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰؑ کو اس تہمت سے اس طرح بری کیا۔ کہ ملائکہ کو حکم دیا۔ کہ وہ ہارونؑ کی میت کو اٹھائیں۔ پس فرشتے ان کی میت کو اٹھا کر بنی اسرائیل کی محفلوں اور جماعتوں کے پاس سے گزرے۔ اور ان کی موت اور حضرت موسےٰؑ کے ان کے قتل سے بری الذمہ ہونے کا حال بیان کرتے جاتے تھے۔ اور یہ روایت جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے مروی ہے۔ نیز یہ بھی روایت ہے۔ کہ حضرت موسےٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ کو آواز دی۔ پس وہ اپنی قبر سے باہر آئے۔ تب حضرت موسےٰؑ نے ان سے دریافت کیا۔ کہ کیا میں نے تجھ کو قتل کیا ہے؟ حضرت ہارونؑ نے جواب دیا۔ کہ نہیں۔ پھر اپنی قبر میں واپس چلے گئے۔ اور یہ سب کچھ جائز ہے۔ اور جو ان جاہلوں کا قول ہے۔ وہ بالکل ناجائز اور نادرست ہے۔

ذکر تنزیہ داؤد علیہ السلام

مسئلہ اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالےٰ وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ کے معنی کیا ہیں۔ آیا اکثر مفسرین نے یہ روایت نہیں کی ہے کہ داؤد علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کی۔ کہ اے پروردگار

جو حضرت داؤد علیہ السلام کا اوریا کی عورت سے اس طرح نکاح کرنے کا قصہ جو عوام میں مشہور ہے۔ بالکل بے سروپا افترا محض و کذب صریح ہے۔ نہ قرآن میں اس کی طرف کوئی تصریح۔ اشارہ یا کنایہ پایا جاتا ہے۔ اور نہ احادیث صحیحہ نبویہ میں اس کا کہیں ذکر ہے۔ یہ سب عامہ کی روایتیں ہیں۔ علماء محققین میں سے کوئی اس کا قائل نہیں۔ اور کوئی مدرک صحیح نہیں رکھتیں۔ البتہ توریت میں

تو نے ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو اپنا ذکر ایسا عطا فرمایا تھا۔ کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ اس کی مثل مجھ کو بھی عطا فرمایا جائے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ میں نے ان کی ایسی آزمائش کی تھی کہ ویسی آزمائش تمہاری نہیں کی۔ اگر تو چاہے تو میں تیری بھی ویسی ہی آزمائش کروں۔ اور ویسا ہی تجھ کو بھی عطا کروں۔ داؤدؑ نے عرض کی۔ کہ ہاں۔ تب اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ تو اپنا کام کر۔ یہاں تک کہ میں تمہارا امتحان دیکھوں۔ پس جو اللہ چاہتا تھا ہوا۔ اور اس بات کو بہت مدت گزر گئی۔ یہاں تک کہ قریب تھا۔ کہ داؤدؑ اس کو بھول جائیں۔ اسی اثنا میں کہ وہ محراب عبادت میں تھے کہ ایک کبوتری ان پر وارد ہوئی۔ اور داؤدؑ نے اس کو پکڑنا چاہا۔ وہ اڑ کر محراب کے دریچہ پر جا بیٹھی۔ حضرتؑ اس کو پکڑنے کے لئے اوپر گئے۔ وہ اڑ کر دریچہ سے اتر آئی۔ اس وقت ایک عورت اپنے کوٹھے پر نہا رہی تھی۔ حضرتؑ اس کو دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئے۔ اور اس سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ اور وہ شوہر دار تھی۔ اور اس کے شوہر کا نام اوریا تھا۔ حضرتؑ نے اس کو ایک لڑائی میں بھیج دیا۔ اور حکم دیا۔ کہ تابوت سکینہ کے آگے رہے۔ اور اس حکم سے غرض یہ تھی۔ کہ وہ اس لڑائی

(بقیہ نوٹ) اس کا پتہ چلتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہودیوں کی مجہولات و مفتریات میں سے ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اس کے قائل ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں۔ کہ معاذ اللہ حضرت سلیمانؑ اسی عورت کے بطن سے ہیں۔ اور اسی طریق ناجائز سے۔ اور چونکہ جناب عیسےٰ علیہ السلام کا سلسلۂ نسب ایک جانب سے حضرت سلیمانؑ تک پہنچتا ہے۔ اس واسطے وہ لوگ اس بنا پر بھی حضرت عیسےٰ پر تخطیہ کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یا تو مسلمانوں نے یہودیوں سے سنا۔ یا توریت میں دیکھا۔ یا ان منافقین نے مسلمانوں میں شائع کر دیا۔ جو در اصل یہودی تھے۔ خیر کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی روایت پر اعتماد کرنا خلاف تدین ہے۔ وہی اس کے قائل ہو سکتے ہیں۔ جن کے دلوں میں انبیاء کی کچھ بھی عظمت و وقعت نہیں۔ اور خدا کے ان مخصوص بندوں پر جن کی خدا خود تعریف و تمجید فرماتا ہے تہمت و الزام لگانا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ چند مقام پر کلام حمید مجید میں خداوند عالم اپنے اس برگزیدہ بندے کا ذکر نہایت تمجید کے ساتھ فرماتا ہے۔ واذکر عبدنا داؤد ذالایدا انہ اواب (ترجمہ) یاد کر ہمارے بندے داؤدؑ صاحب قوت و توانائی کو۔ بیشک وہ ہماری طرف بہت رجوع کرنے والا ہے۔ اب رہا قصۂ مدعی

میں مارا جائے۔ اور حضرتؑ اس کی بیوی سے نکاح کرلیں۔ پس اللہ تعالےٰ نے دو فرشتوں کو مدعی و مدعا علیہ کی صورت میں حضرتؑ کی طرف بھیجا۔ تاکہ ان کی خطا پر ان کو سرزنش کریں۔ اور اس دعوے میں نعاج یعنی گوسپندوں سے کنایۃً عورتیں مراد تھیں ✤ اور ان آیات میں تم سے ایک اور بھی سوال ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ملائکہ تو جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ پس انہوں نے یہ کیوں کہا۔ کہ خصمانِ بغیٰ بعضنا علیٰ بعضٍ۔ ہم دو دعویدار ہیں۔ کہ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ اور ایک نے یہ کیوں کہا۔ ان ھذا اخی.. کہ اس میرے بھائی کے پاس ننانوے گوسپند ہیں۔ اور میرے پاس ایک..... حالانکہ واقع میں کچھ بھی نہ تھا ✤

جواب۔ ہم ان آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں۔ کہ ان آیات سے داؤد علیہ السّلام کی کوئی خطا ثابت نہیں ہوتی۔ اور یہی ضروری بھی ہے ✤ رہی وہ روایت جو سوال میں پیش کی گئی ہے۔ سو وہ مردود اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسا مضمون درج ہے۔ جس کو انسانی عقلیں کبھی انبیاء علیہم السّلام کے لئے تجویز نہیں کرسکتیں۔ اور وہ سراسر اُن حضرات کی شان کے برخلاف ہے۔ اور اس کے راوی بھی مطعون اور مقدوح ہیں۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ اور ہم کو اس کے ذکر کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے ✤ اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ۔ سو لفظ **خصم** مصدر ہے۔ اور مصدر کی جمع اور تثنیہ اور مؤنث نہیں آتی۔ پھر فرمایا۔ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ۔ اس میں ان کی جماعت کی طرف کنایہ ہے۔ کیونکہ تسوّروا جمع کا صیغہ ہے۔ اس آیت میں بعض مفسرین کہتے ہیں۔ کہ یہاں بلحاظ معنی کے جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔ اس

(بقیہ نوٹ) اور مدعا علیہ۔ سو اس سے بھی حضرت کا کسی گناہ کا مرتکب ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں ظواہر آیات سے یہ ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت داؤدؑ کا امتحان کیا گیا۔ چنانچہ فظن داؤد انما فتناہ (اور داؤدؑ کو یقین ہوگیا۔ کہ ہم نے اُس کا امتحان کیا۔ ظن یہاں یقین کے معنی میں ہے) سے ظاہر ہے۔ اور امتحان بھی خود حضرت داؤدؑ کی خواہش سے کیا گیا تھا۔ کہ انہوں نے بعض انبیاء علیہم السّلام کے مراتب عالیہ دیکھ کر جو اُن کو بوجہ ابتلائٔت و امتحانات عطا ہوئے تھے شوق ظاہر کیا۔ کہ مجھ کو بھی یہ مراتب عطا ہوں۔ اور میرا بھی امتحان کیا جائے۔ اس بنا پر اُن کا امتحان کیا گیا۔ اور خدا نے اُن کو اس امتحان کی خبر دیدی تھی۔ اور وقت بھی بتلا دیا تھا (جیسا کہ احادیث میں آیا ہے)۔ اور اس میں جو بظاہر ترک اولےٰ ہوا وہ یہی ہے۔ کہ حضرت نے مدعا علیہ کا جواب نہ سُنا۔ اور حکم دیدیا۔

میں لفظ خصم کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ خصمین یعنی مدعی مدعا علیہ اس مقام پر دو گروہ یا دو جنسوں کی مانند ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ اس لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ کہ دو کم سے کم جماعت اور اس کی ابتدا ہے۔ اور اس میں انضمام اور اجتماع کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ ان دونوں کے ساتھ اور مددگار بھی موجود تھے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے۔ کہ جو شخص بادشاہ کے دروازے پر حاضر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اور معاون اور سفارشی بھی جایا کرتے ہیں۔

اور داؤد علیہ السلام جوان دونوں کے آنے سے ڈر گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ حضرت اس وقت عبادت پروردگار کے لئے تنہا تھے۔ اور ہمیشہ یہ قاعدہ مقرر تھا۔ کہ اس وقت میں کوئی شخص ان کے پاس نہ آتا تھا۔ چونکہ وہ بے وقت داخل محراب ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت ان کو دیکھ کر ڈر گئے۔ یا حضرت ؑ کے خوف کا باعث یہ تھا۔ کہ راہ مقررہ سے نہ آئے تھے۔ بلکہ غیر راستے سے آئے تھے۔ اور انہوں نے جو یہ کہا۔ کہ خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ۔ سوان کا یہ قول بطور تقدیر اور تمثیل کے ہے۔ اور یہ کلام پہلے کلام سے الگ ہے۔ اور اس کی تقدیر یہ ہے۔ اَرَئَيْتَ لَوْ كُنَّا خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلَى الْبَعْضِ وَاحْتَكَمْنَا اِلَيْكَ ہے۔ اور اس آیت میں ہر واحد کے لئے اِضمار ضروری ہے۔ ورنہ یہ کلام صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ خصمان مبتدا نہیں بن سکتا ہے۔ مفسرین کہتے ہیں۔ کہ اس کلام کی تقدیر نَحْنُ خَصْمَانِ ہے۔ اس میں متکلم کی ضمیر محذوف ہے۔ اور متکلم کی ضمیر محذوف بھی ہوا کرتی ہے۔ جیسے متکلم کہتا ہے۔ سَامِعٌ مُطِيعٌ یعنی اَنَا سَامِعٌ مُطِيعٌ۔ اور حاجی حج سے واپس آتے ہوئے کہتے ہیں۔ اٰيِبُوْنَ تَائِبُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ یعنی نَحْنُ اٰيِبُوْنَ ..... اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

وَقُوْلَا اِذَا جَاوَزْتُمَا اَرْضَ عَامِرٍ ✦ وَجَاوَزْتُمَا الْحَيَّيْنِ نَهْدًا وَخَثْعَمًا

نَزِيعَانِ مِنْ جَرْمِ بْنِ رَبَّانَ اِنَّهُمْ ✦ اَبَوْا اَنْ يُجِيْرُوْا فِي الْهِزَاهِزِ مُحْجَمًا

(بقیہ نوٹ) اور حضرت کو اپنے دانا حکم ہونے پر فخر بھی تھا۔ پس حضرت داؤد نے اپنی اس کمی کے پورا کرنے کی مانگی۔ اور عبادت الٰہی میں جھک گئے۔ اور اس کی طرف رجوع کیا۔ قال عز من قائل فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ۔ بہرحال داؤد علیہ السلام کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ یہ سب افترآت ہیں۔ اور یہی اعتقاد مومن کے لئے ضروری ہے۔

یعنی نحنُ نتزیعان ٭ اور اس متکلم کے لئے بولا جاتا ہے (جو بالمشافہ گفتگو کرتا ہے)۔ مُطَاعٌ مُطاعٌ - اور اس کے لئے کہا جاتا ہے۔ اَرَاحِلٌ اَم مقیمٌ۔ اور شاعر کہتا ہے شعر

تقول ابنةُ الکعبیِّ لما لقیتُہا ٭ امنطلقٌ فی الجیش ام متثاقلُ

یعنی ءانت مُنطلقٌ ..... الخ ٭

الغرض جب کہ اس آیت میں محذوف نکالنا ضروری ہے تو جو محذوف کہ ہم نے نکالا ہے۔ وہ اس سے بہتر اور محذوف نہیں نکال سکتے ٭

اور آیہ اِنَّ هٰذَا اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً ... الخ۔ یہ بھی تقدیراً و تمثیل کے طور پر ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے۔ اور اس میں کچھ محذوف ہے۔ جو اسی تقدیر کو چاہتا ہے ٭

اور قولہ عَزَّنِیْ کے معنی صار اَعَزَّ مِنِّیْ (مجھ سے زیادہ عزت والا ہو گیا) ہے۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ اس سے مراد قہرنی وغلبنی ہے ٭ یعنی مجھ پر غالب ہو گیا ٭

اور حضرت داؤدؑ نے جو مدعی کا دعوے سن کر مدعا علیہ سے دریافت کئے بغیر یہ فرما دیا۔ لَقَدْ ظَلَمَكَ۔ اس سے حضرتؑ کی مراد یہ ہے۔ کہ اگر یہ معاملہ فی الواقع یونہی ہے۔ جیسا کہ تو نے بیان کیا۔ تو اس نے تجھ کو ضرر پہنچایا۔ اور ظلمک کے معنی نقصک و ثلمک کے ہیں۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا۔ اس میں لم تظلم کے معنی لم تنقص ہیں ٭

اور آیہ وَظَنَّ دَاوٗدُ میں ظَنَّ کے معنی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں :-

صورت اوّل یہ کہ ظَنَّ کے معنی وہی مشہور اور مروج عام معنی لئے جائیں۔ کہ جو مخالف یقین ہیں ٭

صورت دوم یہ کہ ظن سے مراد علم و یقین ہو۔ اس لئے کہ ظن کبھی علم کے معنی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا۔ (یعنی جب گنہگار دوزخ کو دیکھینگے۔ تو یقین کر لینگے کہ ہم اس میں ڈالے جائینگے)۔ اور یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اہل آخرت دوزخ میں داخل ہونے کا گمان کرینگے۔ بلکہ ان کو اس بات کا قطعی اور واقعی علم حاصل ہوگا ٭ اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

فقلتُ لهم ظنوا بالفَیْ مدجّجٍ ٭ سَراتُهم فی الفارسیِّ المُسرَّدِ

بندگان

اس شعر میں ظنوا بمعنی ایقنوا ہے +

اور آیۂ ظنّ داؤد انّما فتنّاہ میں فتنہ سے مراد اختبار اور امتحان ہے۔ اور اس مقام میں اس کے سوا اس کی اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (اور آزمایا ہم نے تجھ کو جو حق آزمایش ہے) +

رہا حضرت داؤد علیہ السلام کا استغفار کرنا اور سجدہ بجالانا سو یہ کسی گناہ کے سبب سے نہ تھا۔ جو ان سے اس وقت یا اس سے پیشتر سرزد ہوا ہو۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا قول ہے۔ بلکہ محض خدا کی طرف رجوعیت اور انابت و خشوع و خضوع اور اظہار عجز و انکسار اور عبادت الٰہی کے طور پر تھا۔ اور یہ اکثر لوگوں کا قاعدہ ہے۔ کہ جب کوئی جدید نعمت خدا کی طرف سے ان کو عطا ہوتی ہے۔ تو وہ اپنے مولاء برحق کے شکرانے میں سجدے کیا کرتے ہیں۔ اور استغفار اور عبادت الٰہی بجالاتے ہیں۔ ایسا ہی کبھی محض تعظیم اور شکر اور عبادت کے طور پر تسبیح و استغفار کا ورد کرتے ہیں +

اور آیۂ وخرّ راكعًا وّاناب کی تفسیر یہ ہے۔ کہ انابت بمعنی رجوع ہے۔ چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جو کچھ عمل کیا تھا۔ وہ محض خدا کی طرف رجوع کر کے اور غیر خدا سے قطع تعلق کر کے کیا تھا۔ اس لئے ان کے لئے فرمایا۔ انّہ اَوّاب یعنی حضرت داؤد نے خدا کی طرف رجوع کی۔ جیسا کہ توبہ کرنے والے شخص کو جو توبہ اور ندامت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ کہتے ہیں۔ انہ منیب یعنی وہ انابت کرنیوالا یعنی رجوع کرنیوالا ہے +

اور قولہ تعالےٰ فغفرنا لہٗ ذالك کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہم نے داؤد علیہ السلام کے اس عمل کو قبول کیا۔ اور اس کے لئے اس عمل کے عوض ثواب ان کے نامۂ عمل میں ثبت کیا۔ اس آیت میں جزا کو مجازاً لیے ہر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (کفار اللہ کو فریب دیتے ہیں۔ اور وہ ان کو ان کے فریب کی جزا دیگا)۔ نیز فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (اللہ ان کو استہزا کرنے کی جزا دیگا)۔ ان آیات میں جزا کو مجازاً لفظ علیہ کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور شاعر کا شعر ہے۔ شعر

الا لا یجھلن احد علینا + فنجھل فوق جھل الجاھلینا

چونکہ توبہ اور استغفار کرنے میں ان کا قبول کرنا ہی مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے جواب میں کہا جائیگا۔ فغفرنا۔ یعنی ہم نے مقصود مغفرت کو پورا کر دیا۔ ایسی طرح چونکہ

حضرتؑ کا استغفار کرنا خضوع اور عبادت کے طور پر تھا۔ اور اس سے مقصود قرب الٰہی اور ثواب تھا۔ اس لئے ان کے جواب میں غَفَرْنَا بجائے قَبِلْنَا کہا گیا۔ باوجودیکہ جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ داؤد علیہ السلام سے گناہ صغیرہ سرزد ہوا۔ اس کو بھی لازم ہے کہ قولہ تعالےٰ غَفَرْنَا کو اسقاط عقاب کے ماسوا پر محمول کرے کیونکہ عقاب بلا استغفار اور توبہ کرنے کے ہی وہاں کے ثواب کثیر کے عوض میں ساقط ہو گیا۔

اور جو لوگ حضرت داؤد علیہ السلام سے صغیرہ کا سرزد ہونا تجویز کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت کا استغفار کرنا امور ذیل میں سے ایک امر کے سبب تھا۔

(۱) داؤد علیہ السلام نے اوریا بن حنّان کو اپنے ملک کے کسی حصّے میں بھیجا۔ اور وہ وہاں قتل ہو گیا۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کی بیوی کے حسن و جمال کا حال معلوم تھا۔ اور حضرتؑ چاہتے تھے۔ کہ اس کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کرینگے۔ جب وہ لڑائی میں مارا گیا۔ تو ان کا غم جو اس کی بیوی کے نکاح کی طرف طبیعت کے میلان کے سبب ان کو لاحق تھا۔ اس کے قتل ہونے سے کم ہو گیا۔ پس خدا نے دو فرشتے نازل کر کے اس باب میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس سبب سے کہ ان کو میلان طبعی نے اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ اپنے اصحاب میں سے ایک مومن کے قتل ہونے پر ان کا غم کم ہوا۔

(۲) روایت ہے۔ کہ اوریا ابن حنان نے ایک عورت سے نکاح کی درخواست کی تھی۔ اور حضرتؑ کو جب اس کے حسن و جمال کا حال معلوم ہوا۔ تو آپ نے بھی اس سے نکاح کی درخواست کی۔ اس کے کنبے والوں نے حضرت کی درخواست کو اوریاد غیرہ کی درخواست پر ترجیح دی۔ پس اللہ تعالےٰ نے حضرت داؤدؑ پر عتاب کیا۔ اس لئے کہ انہوں نے دنیا کا لالچ کیا۔ اور جس عورت سے نکاح کرنے کی درخواست اور شخص نے کر رکھی تھی۔ اس سے خود نکاح کرنے کی درخواست کی۔ یہاں تک کہ آپ کی درخواست کو ترجیح دی گئی۔

(۳) روایت ہے۔ کہ ایک مرد اور ایک عورت ایک معاملہ میں جھگڑتے ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور ان سے محاکمہ نہیں چاہا۔ بلکہ ان کو اس امر میں واسطہ بنایا حضرت داؤدؑ نے مرد سے فرمایا۔ اس عورت کو چھوڑ دو۔ اور آپ کا یہ فرمانا بطور حکم کے نہ تھا۔ بلکہ بطور توسط اور خیر خواہی کے تھا۔ جیسا کہ ایک شخص دوسرے

شخص سے کہے جب کہ تو اپنی اس بیوی کو خوش نہیں رکھتا۔ اور اس کا واجب نان نفقہ ادا نہیں کرتا۔ تو تو اس کو ترک کر دے۔ الغرض اس شخص نے سمجھا۔ کہ حضرتؑ یہ بات بطور توسط اور خیر خواہی کے نہیں فرماتے۔ بلکہ حکم دیتے ہیں۔ اس خیال سے وہ اس عورت سے دست بردار ہو گیا۔ اور اس کا نکاح حضرت داؤدؑ سے کر دیا۔ پس خدا کی طرف سے دو فرشتے ان کے پاس اس بات پر ان کو تنبیہ کرنے کے لئے آئے۔ کہ تم نے اپنے منشا کو اس مرد پر ظاہر کرنے میں کوتاہی کی۔ اور اس کو یہ نہ جتلایا۔ کہ میرا یہ قول بطور حکم کے نہیں ہے۔ بلکہ صلاح اور خیر خواہی کے طور پر ہے۔

(۴) ایک روز داؤد علیہ السلام اپنی محراب عبادت میں مشغول عبادت تھے۔ کہ ایک مرد اور ایک عورت ایک جھگڑا لے کر آئے۔ اور فیصلے کے لئے آپ کے سامنے پیش کیا۔ تب حضرتؑ نے شناخت کرنے کی خاطر اس عورت کی طرف غور سے دیکھا۔ تاکہ اس کے موافق یا مخالف حکم دیں۔ اور اس نیت سے آپ کا اس عورت کو دیکھنا جائز تھا۔ مگر جونہی آپ نے اس عورت کو دیکھا۔ تو آپ کا نفس فطری اور خلقی طور پر اس کی طرف مائل ہوا۔ بعد ازاں آپ نے ان کا جھگڑا فیصلہ کر دیا۔ اور پھر عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ مگر اس عورت کے معاملے میں فکر کرنے اور اس کی طرف دل کے متعلق ہونے کے سبب اس روز بعض نوافل کو ادا کرنے سے باز رہے جن کو روزمرہ ورد کیا کرتے تھے۔ اس لئے آپ پر عتاب ہوا۔

(۵) آپ کی خطا یہ تھی۔ کہ آپ نے ثبوت لینے سے پہلے حکم دینے میں جلدی کی۔ حالانکہ آپ پر واجب تھا کہ جب طرفین میں ایک شخص کا دعوے سن چکے تھے۔ تو طرف ثانی سے دریافت کرتے کہ اس معاملے میں وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اور اس سے دریافت کئے بغیر اس کے برخلاف حکم نہ دیتے۔ اور جو شخص اس جواب کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ان دونوں شخصوں کے خلاف عادت مقررہ غیر وقت میں آنے کے سبب آپ کو یہ پریشانی ہو گئی۔ حالانکہ یہ سب صورتیں انبیاء علیہم السلام کے حق میں ناجائز ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض میں معصیت لازم آتی ہے۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ معصیت کرنا انبیاء علیہم السلام کے لئے جائز نہیں۔ اور بعض باعث نفرت ہیں۔ گو معصیت نہیں۔ مثلاً اس عورت سے نکاح کی درخواست کرنا جس

سے نکاح کرنے کے لئے ان کے اصحاب میں سے ایک شخص درخواست کر چکا تھا اور ان کی درخواست کا منظور ہونا اور اس سے نکاح کرنا۔ اور نہ جیسے مرد کو عورت سے علیحدہ ہونے کے لئے کہنا۔ حالانکہ اس سے آپ کا منشا حکم دینا نہ تھا ✤ اور چوتھی صورت جو یہ کہا گیا ہے کہ ترک نوافل کے سبب آپ پر عتاب ہوا۔ تو اس صورت میں آپ پر عتاب کا ہونا جائز نہ تھا۔ کیونکہ ترک نوافل نہ تو داخل معصیت ہے۔ اور نہ باعث تنفیر خلائق ہے ✤ اور جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ داؤد علیہ السلام نے عمداً اوریا کو تابوت کے آگے رہنے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ قتل ہو جائے۔ اس قول کا فساد نہایت واضح اور ظاہر ہے۔ اور اس کے تردید کرنے کی کچھ حاجت نہیں ہے ✤

اور جناب امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ جب کوئی ایسا شخص میرے سامنے آیا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت داؤدؑ نے اوریا کی بیوی سے نکاح کیا تھا۔ تو میں نے اس پر دو حدیں جاری کیں۔ ایک حد تو نبوت کے لئے۔ اور ایک حد اسلام کے لئے۔ (کیونکہ اس نے دو قصور کئے۔ ایک تو نبی پر تہمت لگائی۔ دوسرے ایک مسلمان پر۔ اس لئے کہ نبی ان دو صفتوں یعنی نبوت اور اسلام کا جامع ہے۔ مترجم) ✤

اور ابو مسلم اصفہانی کہتا ہے۔ کہ جو دو شخص حضرت داؤدؑ کے پاس آئے ممکن ہے کہ دونو مدعی مدعا علیہ بنی آدم سے ہوں۔ اور گوسپندوں کا ذکر کنایۃً نہ ہو۔ بلکہ حقیقت پر محمول ہو۔ اور آپ کا ڈرنا محض اس وجہ سے ہو کہ وہ دونو بے اجازت اور غیر مروج طریق پر اندر داخل ہوئے تھے۔ نیز اس کا قول ہے کہ ظاہر تلاوت میں کوئی بات ایسی موجود نہیں ہے۔ جو ان دونو کے فرشتہ ہونے پر دلالت کرے ✤ اور ہم نے جو شروع میں ان دونو کے قول اور ایک کے دعوے اور ذکر گوسپندان کی تاویل کی ہے۔ یہ جواب اس تاویل سے بھی مستغنی کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ✤

ذکر تنزیہ سلیمان علیہ السلام

مسئلہ ۔ اگر کوئی کہے کہ قولہ تعالےٰ وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ

عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ
کے کیا معنی ہیں؟ کیا ان آیات کا ظاہر اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ سلیمانؑ کو گھوڑوں کے مشاہدے اور اس مشغلے نے ذکر الٰہی سے غافل کر دیا؟ یہاں تک کہ مروی ہے کہ حضرتؑ کی نماز فوت ہو گئی تھی۔ اور کہتے ہیں کہ وہ عصر کی نماز تھی۔ پھر حضرتؑ نے گھوڑوں کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ اور غیظ میں آکر ان کی پنڈلیاں اور گردنیں اڑا دیں۔ اور اس تمام فعل کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے فعل قبیح سرزد ہوا۔

جواب۔ ہم کہتے ہیں کہ اس آیت کا ظاہر ہرگز اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ حضرت سلیمانؑ سے فعل قبیح سرزد ہوا۔ اور جو روایت کہ مقتضائے دلائل کے مخالف ہو وہ قابل التفات نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ ظاہر میں صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو روایت ضعیف اور پوچ ہو اس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور جو بات مجملاً ہمارے بیان کی موید ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس آیت کو حضرت سلیمانؑ کی مدح و ثنا اور تعریف سے شروع کیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔ نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ یعنی وہ ہمارا بہت اچھا بندہ ہے۔

وحضرت سلیمانؑ کے متعلق گھوڑوں کی کونچیں کاٹنے کی روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ بلکہ تحقیق علماء یہی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اور ظاہر قرآن تو اس پر دال ہے ہی نہیں۔ اور آیۂ مذکورہ میں تحقیق یہی ہے کہ توارت اور ردوہا کی ضمیریں خیل کی طرف پھرتی ہیں۔ اور ترجمۂ آیت کا یہ ہے کہ خداوند عالم اپنے برگزیدہ پیغمبر حضرت داؤدؑ کا حال یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے۔ اور ہم نے داؤدؑ کو سلیمانؑ جیسا بیٹا عطا کیا۔ جو ہمارا بہت اچھا بندہ ہے۔ اور وہ ہماری طرف بہت متوجہ ہونے والا اور رجوع کرنے والا ہے۔ جب کہ اس پر شام کے وقت عمدہ و نجیب گھوڑے پیش کئے گئے تو کہا میں ان کو دوست رکھتا ہوں اچھا دوست رکھنا خدا کی یاد سے (یعنی یہ میرا دوست رکھنا خدا کی یاد اور اس کے ذکر میں داخل ہے۔ یا یہ میرا دوست رکھنا ذکر و اذکار الٰہی سے بہتر ہے اور وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی میں ان کو راہ خدا میں جہاد کرنے اور اساس دین کے محکم و استوار کرنے اور نماز کی بنیاد قائم کرنے کے واسطے محبوب و دوست رکھتا ہوں۔ اور بلاشبہ اقامۂ دین ذکر و اذکار خدا سے بہتر ہے۔ کیونکہ خیر کثیر بمقابلہ خیر قلیل افضل و اعلےٰ ہے)۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔ (تو پھر آپ نے فرمایا) رُدُّوْهَا عَلَيَّ۔ ان کو میرے پاس لوٹا لاؤ۔ جب گھوڑے پھر آپ کے سامنے آئے۔ تو آپ ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

اس لئے کہ وہ ہماری طرف بہت ہی رجوع کرنے والا ہے۔ اور یہ جائز نہیں ہے۔ کہ پہلے تو ان صفات سے ان کی مدح وثنا کی جائے۔ پھر بلا فاصلہ فعل قبیح کو ان کی طرف نسبت دی جائے۔ اور یہ بیان کیا جائے۔ کہ گھوڑوں کے دیکھنے نے ان کو نماز کے فرض ادا کرنے سے غافل کر دیا۔ اور ان آیات کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ کا گھوڑوں کو دوست رکھنا اور ان پر شیفتہ و فریفتہ ہونا اپنے پروردگار

(بقیہ نوٹ) اور ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ اور روانہ کرتے جاتے تھے۔ اور یہ اس صورت میں ہے جب کہ آیت منزلہ اس صورت میں ہو۔ اور کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہ مانی جائے بہرحال آیت کا ظاہری ترجمہ یہی ہے۔ اور اس میں حضرت سلیمانؑ پر کسی قسم کا الزام لازم نہیں آتا۔ اور نہ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت پر عتاب کیا ہے۔ یا کوئی تنبیہ کی ہے۔ بلکہ آیت حضرت کی تعریف و تمجید میں ہے۔ اور خداوند عالم اس آیت میں حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کا جائزہ لینے اور ان کی گردنوں وغیرہ پر ہاتھ پھیرنے کو ان کی صفات حسنہ اور انکی ان حسنات میں شمار کرتا ہے۔ جس سے حضرت سلیمانؑ کا خدا کی طرف متوجہ ہونا اور خدا ہی کے کام میں مشغول رہنا اور اس کی طرف رجوع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعد ذکر انہ اوّاب لفظ اذا اس پر دلالت کرتا ہے۔ نیز حضرت سلیمانؑ کا گھوڑوں کی اس محبت کو حب الخیر کہنا بھی اس پر دال ہے۔ کہ آپ کا یہ فعل خدا کی بہت بڑی عبادت تھی۔ اور اس کے ذکر و یاد میں داخل۔ اور یہی قول اس پر صریح دلالت کرتا ہے۔ کہ ہرگز سلیمانؑ سے کوئی ایسی عبادت خدا گھوڑوں کے جائزہ لینے میں فوت نہ ہوئی تھی۔ جو موجب عتاب ہو۔ کیونکہ اگر گھوڑوں کی محبت میں طاعت الٰہی فوت ہو جائے۔ تو یہ محبت محبت خیر نہ ہوگی۔ اور اس کو کسی طرح حب الخیر نہ کہ سکینگے۔ اگر ایسا ہو۔ تو یہ محبت محبت شر ہوگی نہ خیر۔ جیسا کہ ہم لوگوں سے اکثر ہوتا ہے۔ کہ امور دنیویہ میں انہماک کی وجہ سے عبادت خدا ترک کر دیتے ہیں۔ انبیاء کی یہ شان نہیں۔ فانہم السابقون الی الخیرات۔ انبیاء اسی کام کی طرف سبقت کرتے ہیں۔ جو خیر ہوتا ہے۔ لہذا بلاشبہ حضرتؑ کا یہ فعل خیر اور عبادت خدا تھا۔ اور مطابق منشاء خدا۔ نہی۔ اسی واسطے خداوند عالم حضرتؑ کی مدح فرماتا ہے۔ اور فطفق مسحا بالسوق والاعناق کا صرف یہی مطلب ہے کہ آپ گھوڑوں کی گردنوں اور ٹانگوں پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ اور یہ فعل ممدوح ہے۔ اور مستحبات میں داخل ہے۔ چنانچہ منقول ہے۔ کہ آنحضرت صلعم علی الصباح اصطبل میں تشریف لے جاتے

کے اذن اور حکم سے تھا۔ اور اُسی نے اس امر پہان کو مامور کیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے ہم کو دشمنوں کے مقابلے کے لئے گھوڑوں کے باندھنے اور تیار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ پس کوئی شخص اس امر کا انکار نہیں کر سکتا۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام کو بھی ایسا ہی حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے حضرت سلیمان ؑ نے فرمایا۔ اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ (کہ میں گھوڑوں کی دوستی کو ذکر پروردگار سے زیادہ دوست رکھتا ہوں) تاکہ

(بقیہ نوٹ) تھے۔ اور گھوڑوں کی پیشانی وغیرہ پر ہاتھ پھیر کر فرماتے تھے۔ الخیل معقود بنواصیہا الخیر الی یوم القیامۃ۔ یعنی گھوڑوں کی پیشانیوں سے قیامت تک خیر وابستہ ہے۔ اور بھی اس قسم کی روایات ہیں۔ جو اسی امر پر دال ہیں۔ کہ گھوڑوں پر ہاتھ پھیرنا وغیرہ افعال ممدوح ہیں۔ اور وہ خیر جو گھوڑوں کی پیشانی سے وابستہ ہے۔ وہ خیر جہاد ہے۔ لہٰذا حضرت سلیمان ؑ کا گھوڑوں کو جہاد کی خاطر دوست رکھنا اور اُن کو جہاد میں بھیجنا بلاشبہ خیر ہے۔ اور معمولی اذکار و اوراد سے افضل ہے *

اگر ردوھا کی ضمیر آفتاب کی طرف راجع کی جائے۔ تو تین خرابیاں لازم آتی ہیں۔ اول یہ کہ آفتاب کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ دوم یہ کہ حضرت سلیمان ؑ کا بلا واسطہ ملائکہ قضا و قدر کو رد آفتاب کا حکم دینا۔ اس کی مثال اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ آنحضرت صلعم نے بھی جناب امیر ؑ کے واسطے ردشمس کی خدا سے دعا کی ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلعم بدرجہ اَولیٰ ملائکہ قضا و قدر کو حکم دینے کے مستحق ہیں۔ گو یہ ممکن ہے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ سوم یہ کہ قول فطفق مسحًا بالسوق والاعناق۔ اسی کو مقتضی ہے کہ ضمیر ردوھا بھی گھوڑوں ہی کی طرف راجع ہو۔ اور یہی زیادہ مناسب ہے۔ ورنہ کلام میں اضطراب پایا جائیگا۔ بظاہر کوئی لفظ نہیں۔ جو غروب آفتاب پر دال ہو۔ البتہ لفظ عشی سے ضرور یہ احتمال ہوتا ہے۔ کیونکہ عشی آخر روز متصل بشب ہے۔ اور ابکار کے مقابل ہے۔ اور ابکار اول صبح کو کہتے ہیں۔ پس وقت عشی قریب بغروب آفتاب ہو۔ اس واسطے غروب آفتاب یہاں سے محتمل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہی اس پر بھی دال ہے۔ کہ حضرت سلیمان ؑ سے نماز واجب ہرگز فوت نہیں ہوئی۔ کیونکہ انبیاء سابقون الی الخیرات ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ نماز کی تاخیر بلا عذر شرعی اچھی نہیں ہے۔ جہاں تک ہو سکے۔ اول ہی وقت میں ادا کرنا بہتر ہے۔ پس حضرت سلیمان ؑ جیسا پیغمبر کس طرح بلا عذر شرعی تاخیر کر سکتا ہے۔ اور عذر ثابت نہیں۔ اگر ثابت ہو۔ تو پھر کوئی قباحت لازم

حاضرین کو معلوم ہو جائے کہ حضرتؑ کا گھوڑوں میں مشغول ہونا اور ان کا جائزہ لینا لہو و لعب کی راہ سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا کی طرف سے اس پہ مامور اور طاعت الٰہی میں مصروف ہیں۔ اور حضرت سلیمانؑ نے جو فرمایا اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ۔ اس کی دو صورتیں ہیں:۔

(۱) یہ کہ حضرت کی مراد یہ ہو۔ اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبًّا یعنی میں دوست رکھتا ہوں۔ جو حق دوستی ہے۔ پھر حُبَّ کو خیر کی طرف مضاف کر دیا۔ (یعنی دوست رکھتا ہوں۔ اچھا دوست رکھنا) ✦

(۲) یہ کہ حضرت کی مراد یہ ہو۔ اَحْبَبْتُ اتِّخَاذَ الْخَیْرِ (میں گھوڑوں کے لینے کو دوست رکھتا ہوں) یہاں اتخاذ الخیر کے عوض حُبَّ الخیر آگیا ✦

اور قول تعالےٰ رُدُّوْهَا عَلَیَّ میں بقول جملہ مفسرین ھا کی ضمیر خیل یعنی گھوڑوں کی طرف پھرتی ہے۔ **اور قول تعالےٰ** حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ میں ابو مسلم محمد بن بحر اصفہانی کا یہ قول ہے۔ کہ اس میں ضمیر خیل کی طرف عاید ہے۔ نہ کہ شمس کی طرف۔ کیونکہ شمس کا ذکر اس قصے میں موجود نہیں ہے۔ اور خیل کا ذکر اس قصے میں آچکا ہے۔ پس اس کی طرف توارت کی ضمیر کا عائد کرنا اولےٰ اور انسب ہے۔ جبکہ اس کے لئے احتمال بھی موجود ہے ✦ اور یہ تاویل حضرت سلیمان علیہ السّلام کو معصیت سے بری کرتی ہے ✦ اور جو لوگ توارت کی ضمیر شمس کی طرف عاید کرتے ہیں۔ ان کے قول کے موافق بھی ظاہر قرآن میں کوئی ایسی بات موجود نہیں ہے۔ جو

(بقیہ ✱ نوٹ) نہیں۔ معذور معفو عنہ ہے۔ ہاں روایات ردِّ شمس ضرور موجود ہیں۔ کہ حضرت سلیمانؑ کے لئے آفتاب لوٹایا گیا۔ اور علامہ مجلسی اعلی اللہ مقامہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ اور ان کا میلان اسی طرف ہے۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے لئے ردِّ شمس ہوا۔ بنا بریں کہا جا سکتا ہے۔ کہ حضرتؑ سے کوئی ذکر مستحب و مندوب جو آخر وقت میں بطور ورد و وظیفہ کیا کرتے تھے۔ وہ فوت ہو گیا ہو۔ اور حضرتؑ پر اس کا فوت ہونا بھی گراں گزرا ہو۔ گو وہ ایک بہتر و اعلےٰ عبادت میں مشغول تھے۔ اور خدا نے ان کی اتنی سی بھی دل شکنی گوارا نہ کی ہو۔ اور آفتاب لوٹا دیا ہو۔ بہر حال یہ محقق ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ سے ہرگز کوئی ایسا فعل قبیح سرزد نہیں ہوا۔ جو موجب مذمت و عتاب ہو۔ اور یہ آیت سراسر حضرت کی مدح پہ مبنی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ✦

اس امر پر دال ہو۔ کہ غروب آفتاب نماز کے فوت ہونے کا باعث ہؤا۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اس میں حضرتؑ کے سامنے گھوڑوں کے پیش کرنے اور ان کے جانچنے لینے کے انتہائی وقت کا ذکر ہو ✦

اور ابو علی جبائی اور دیگر مفسرین کا قول یہ ہے۔ کہ جب آفتاب پردے میں غائب ہؤا۔ اور غروب ہوگیا۔ تو اس سبب سے حضرت سلیمانؑ کی شام کی عبادت فوت ہوگئی۔ اور یہ نماز نافلہ تھی۔ جو آپ اس وقت پڑھا کرتے تھے۔ مگر چونکہ حضرتؑ گھوڑوں میں مشغول تھے۔ اور ان کے پھرانے سے متعجب ہو رہے تھے۔ اس لئے نماز نافلہ کا ادا کرنا فراموش ہوگیا۔ چونکہ طاعت الٰہی فوت ہوگئی تھی۔ اس لئے مغموم ہو کر فرمایا اِنِّیٓ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ✦

اس صورت میں بھی امر قبیح کی نسبت حضرتؑ کی طرف لازم نہیں آتی۔ کیونکہ نافلہ کا ترک کرنا نہ قبیح ہے۔ اور نہ معصیت ✦

اور قولہ تعالےٰ فَطَفِقَ مَسۡحًا بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ کے معنی کئی طرح پر بیان کئے گئے ہیں :-

صورت اول یہ کہ حضرتؑ نے گھوڑوں کی کونچیں کاٹ دیں۔ اور ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کو تلوار سے قطع کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے طاعت الٰہی سے باز رکھا۔ اور حضرت کا یہ فعل عقاب کی رو سے نہ تھا۔ بلکہ اس غرض سے ایسا کیا۔ کہ آئندہ ان میں مشغول ہو کر طاعت الٰہی سے نہ رہ جاؤں۔ اس لئے کہ انسان کو اختیار ہے کہ اپنے گھوڑے کو گوشت کھانے کے لئے ذبح کرے۔ اور جب کہ اس کے ساتھ ایک ایسی وجہ اور شامل ہوگئی۔ جس نے اس کو حسن اور پسندیدہ بنایا۔ تو کیونکر ذبح کرنا قبیح ہوگا۔ اور بعض کا قول یہ ہے۔ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ گھوڑے چونکہ حضرتؑ کو اپنے تمام مال میں زیادہ تر عزیز تھے۔ اس لئے آپ نے چاہا ہو۔ کہ نافلہ میں جو غفلت صادر ہوئی ہے۔ اس کے کفارہ میں ان کو ذبح کروں۔ اور ان کے گوشت کو مساکین پر تصدق کر دوں۔ پس جب حضرت نے گھوڑوں کا حسن اور ان کی خوبصورتی دیکھی۔ اور اس کو دیکھ کر متعجب ہوئے۔ تو چاہا۔ کہ جو چیز مجھ کو متعجب کرتی اور میری نظر میں بھلی لگتی ہے۔ اس کے ذریعے قرب خدا حاصل کروں۔ اور اس قول کے صحیح ہونے پر آیۂ ذیل دلالت کرتی ہے لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا

مِمَّا تُحِبُّونَ یعنی تم نیکی نہیں حاصل کر سکتے جب تک سب سے پیاری چیز کو راہ خدا میں صرف نہ کرو + مگر ابو مسلم اصفہانی اس قول کو ضعیف سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے۔ کہ اس آیت میں سیف یعنی تلوار کا ذکر نہیں ہے۔ جو مسح کو اس کی طرف منسوب کر سکیں۔ اور اہل عرب تلوار کی ضرب اور کاٹ کو لفظ مسح سے نامزد نہیں کرتے + اور اگر کوئی اس کے جواب میں شاعر کے اس شعر کو پیش کرے۔ شعر

مُسَّحُ مِنْهَا یَجْلُو بِاَطْرَافِ النَّدٰی + دَنَسَ الْاَسْوُقِ بِالْعَضْبِ الْاَفَلِ

تو ہم کہینگے۔ کہ اس شاعر کی مراد یہ ہے۔ کہ اس نے مہمانوں کے لئے اونٹوں کو پے کیا۔ اور ان کے کولہوں سے وہ میل صاف کی۔ جو اس کی تلوار میں ان کے پے کرنے سے لگ گیا تھا۔ اور وہ خون تھا۔ جو اس میں لگ گیا تھا۔ اور اس آیت میں کوئی بات ایسی نہیں ہے۔ جو اس امر کو واجب کرے۔ اور یا اس کے قریب ہو + اور جس امر کا ابو مسلم نے انکار کیا ہے۔ وہ قابل انکار نہیں ہے۔ کیونکہ اکثر اہل تاویل نے کہ بعض انہیں سے مشہور اہل لغت بھی ہیں یہ روایت کی ہے۔ کہ مسح اس آیت میں قطع کے معنی میں ہے۔ اور مشہور استعمال میں ہے۔ مسحہ بالسیف یعنی قطعہ و تبرّہ (تلوار سے اسکو کاٹا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا) اور اہل عرب کہتے ہیں مسح علاوتہا یعنی ضربہا +

صورت دوم یہ کہ مَسْحًا کے معنی یہ ہیں۔ کہ حضرتؑ نے جو گھوڑوں کا حسن و جمال دیکھا۔ تو ان کی حفاظت اور ان کے حسن و جمال کے اکرام کے لئے اپنا ہاتھ ان کے اوپر پھیرا کیونکہ یہ دستور ہے۔ کہ جس شخص کو گھوڑے دکھائے جائیں۔ وہ اپنا ہاتھ ان کی یال گردن اور ٹانگوں پر پھیرتا ہے +

صورت سوم یہ کہ مسح کے معنی اس آیت میں غسل کے ہیں۔ کیونکہ عرب غسل کو مسح بھی کہتے ہیں۔ گویا مراد یہ ہے۔ کہ جب حضرتؑ نے گھوڑوں کا حسن ملاحظہ فرمایا۔ تو ان کے اکرام اور حفاظت کی نظر سے ان کی ٹانگیں اور گردنیں دھوئیں۔ اور یہ سب صورتیں بہت واضح ہیں +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالےٰ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمَانَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (اور ہم نے سلیمانؑ کو آزمایا۔ اور جسم کو اس کی کرسی پر ڈالا پھر اس نے رجوع کی) کے کیا معنی ہیں؟ آیا اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت نہیں ہے؟ کہ ایک جن

جس کا نام صخر تھا۔ ان کی صورت بن کر ان کے تخت پر جا بیٹھا۔ اور حضرتؑ کی انگوٹھی جس میں نبوت تھی لیکر دریا میں ڈال دی۔ پس آپ کی نبوت جاتی رہی۔ اور آپ کی قوم نے آپ کو نہ پہچانا۔ یہاں تک کہ وہ انگوٹھی مچھلی کے پیٹ میں سے پھر آپ کے پاس واپس آئی +

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ جاہلوں نے جو اس باب میں روایت کی ہے۔ اس کا بطلان کسی عاقل پر پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اور ایسی باتیں انبیاء علیہم السلام کی نسبت جائز نہیں۔ اور نبوت انگوٹھی میں نہیں ہوا کرتی۔ نیز نبوت نبی سے سلب نہیں ہوا کرتی۔ اور نہ اس سے جدا ہو سکتی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ جنّ کو ایسی قدرت نہیں دیتا۔ کہ وہ نبی کی صورت بن جائے۔ اور نہ اس کے علاوہ اور باتیں جو ان جہال نے حضرت سلیمان پر افترا کی ہیں۔ جائز ہیں۔ اور یہ بحث فقط ظاہر قرآن کے معانی و مطالب پر ہے۔ حالانکہ ظاہر آیت میں زیادہ سے زیادہ یہ مضمون ہے۔ کہ ایک جسم حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر آپ کے فتنہ کے لئے ڈالا گیا۔ اور فتنہ سے مراد اختبار اور امتحان ہے۔ جیسا کہ آیہ ذیل میں ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ؀ (کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ وہ فقط اپنے آپ کو مومن کہنے پر چھوڑ دئے جائینگے۔ اور آزمائے نہ جائینگے۔ حالانکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش کی ہے۔ پس ان کی بھی آزمائش کی جائیگی۔ اور اللہ ضرور سچّے اور جھوٹوں کو معلوم کریگا) + اور بحث صرف جسد میں ہے۔ کہ وہ کیا چیز تھی۔ اور جو بات کہ صحیح روایت سے مستفاد ہوتی ہے۔ اس سے کسی قسم کے امر قبیح کی نسبت حضرت سلیمانؑ کی طرف لازم نہیں آتی۔ اور اس باب میں چند قول ہیں:۔

(۱) یہ کہ ایک روز حضرت سلیمانؑ نے اپنی مجلس میں کہ اس میں بہت لوگ جمع تھے فرمایا۔ آج کی رات میں سَو عورتوں سے مجامعت کرونگا۔ اور ہر عورت سے ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جو تلوار کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کریگا۔ اور مروی ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ کی کنیزیں بہت تھیں + اور آپ کا یہ فرمانا محبّت الٰہی کی راہ سے تھا۔ مگر اللہ تعالےٰ نے

مؤ یہی وجہ جناب علامہ مجلسیؒ بھی پسند فرماتے ہیں اور دیگر وجوہ سے بہتر بھی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب +

حضرتؑ کو اس کلام سے منزّہ اور مبرّا کیا جس کا ظاہر دنیاوی لالچ اور اس کی وابستگی پر دلالت کرتا تھا۔ تاکہ اور لوگ اس امر میں آپ کی پیروی نہ کریں۔ الغرض ایک ہی عورت حاملہ ہوئی۔ اور مردہ لڑکا جنی۔ اور اس مردہ بچہ کو اٹھا کر حضرتؑ کی کرسی پر ڈلوایا گیا۔ تاکہ ان کو اس امر پر متنبہ کرے۔ کہ جو بات ان سے ظاہر ہوئی۔ اس کا اظہار ہونا نہ چاہیئے تھا۔ اس وقت حضرت سلیمانؑ نے اپنے پروردگار سے استغفار کی۔ اور جزع و فزع کے ساتھ نماز اور دعا میں مصروف ہوئے ✤ یہ روایت اگر صحیح ہو۔ تو اس سے کوئی معصیت صغیرہ مفہوم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ بعض اہل تفسیر کا گمان ہے۔ یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت سلیمانؑ کا استغفار اور انابت اسی گناہ صغیرہ کے باعث سے تھا۔ لیکن ان کا یہ گمان غلط ہے۔ کیونکہ مباح طور پر دنیا کی محبت رکھنا گناہ نہیں ہے۔ اگرچہ محبت دنیا کا مباح طور پر بھی نہ رکھنا اس سے بھی بہتر اور انسب ہے ✤ اور اس حالت کے بعد حضرتؑ کا استغفار کرنا کسی گناہ کے کرنے پر دلالت نہیں کرتا۔ نہ اس وقت میں۔ نہ اس سے پیشتر۔ بلکہ وہ (استغفار) اللہ کی طرف رجوع کرنے اور طلب ثواب کی غرض سے تھا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کے حال میں بیان کر چکے ہیں ✤

(۲) بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ حضرتؑ کا گناہ یہ تھا۔ کہ جس وقت انہوں نے فرمایا۔ کہ ہر عورت ایک لڑکا جنیگی۔ اس وقت انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔ اور اس امر کو مشیت الٰہی کے سپرد نہیں کیا تھا۔ مگر ان کا یہ گمان غلط ہے۔ اس لئے کہ گو حضرتؑ نے علی الظاہر انشاء اللہ نہیں فرمایا۔ مگر آپ کے دل اور عقیدے میں یہ خیال ضرور تھا۔ کیونکہ اگر آپ کو مطلق طور پر اپنے قول کا یقین ہو۔ تو آپ اس میں کاذب ٹھیرتے ہیں۔ یا اگر مطلقاً ایسے امر کا یقین ہو جس کا کاذب ہونا ممکن ہے (تو بھی کاذب ٹھیرتے ہیں) اور یہ بات اس شخص کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام پر ارتکاب صغائر کو جائز رکھتا ہے ✤

(۳) بعض کہتے ہیں۔ کہ حضرتؑ پر عتاب الٰہی ہونے اور آپ کے استغفار کرنے کا سبب یہ تھا۔ کہ دو فریق آپ کے پاس مقدمہ لے کر آئے۔ ایک شخص جوارہ زن سلیمان کا رشتہ دار تھا۔ اور آپ اس عورت کو نہایت دوست رکھتے تھے۔ بنابریں حضرتؑ نے

چاہا۔ کہ مقدمہ جوارہ کے رشتہ دار کے حق میں ہو۔ الغرض حضرتؑ نے فریقین کے مابین حق حق فیصلہ کر دیا۔ مگر چونکہ آپ چاہتے تھے۔ کہ جوارہ کے رشتہ دار کے حق میں فیصلہ ہو۔ اس لئے آپ پر عتاب ہوا۔ مگر یہ وجہ بھی بیکار اور پوچ ہے۔ کیونکہ یہ خواہش بھی ایسا گناہ نہیں ہے۔ جو قابل عتاب ہو۔ جبکہ حضرتؑ نے اپنی عورت کے موافق خواہ مخواہ یک طرفہ فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ آپ کی طبیعت کا میلان یہ تھا۔ کہ حق جوارہ کے فریق کے قول کے موافق ہو۔ اور اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے۔ نہ کہ آپ امر واجب سے عدول کر کے اور اس کی رعایت کر کے ایسا کرنا چاہتے تھے۔

(۴) حسن سے روایت ہے۔ کہ جب حضرت سلیمانؑ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ تو لوگوں نے کہا۔ کہ اس سے ہم کو وہی صدمات پہنچینگے۔ جو اس کے باپ سے پہنچے ہیں۔ الغرض جب حضرتؑ کے بیٹا پیدا ہوا۔ تو آپ کو خوف ہوا۔ کہ یہ لوگ اس کو قتل نہ کر ڈالیں۔ اس سبب سے اس کو بادل میں رکھ کر دودھ پلوایا۔ ناگاہ دیکھا۔ کہ اس کو مردہ کر کے آپ کی کرسی پر ڈال دیا گیا۔ تاکہ آپ متنبہ ہو جائیں۔ کہ تقدیر الٰہی کے مقابلے میں حذر و اجتناب کرنا کچھ نفع نہیں دیتا۔

(۵) مفسرین کہتے ہیں۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک بیٹا تھا۔ جو جوان اور نہایت ذکی اور ہشیار تھا۔ اور آپ اس کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے۔ اللہ تعالے نے اس کو بلا کسی قسم کی بیماری اور مرض کے حالت تندرستی میں ہی بستر پر لیٹے ہوئے یکایک مار ڈالا۔ تاکہ حضرتؑ کا امتحان کرے۔ کہ بیٹے کے مرنے میں کیا حال کرتے ہیں۔ اور اس کی جدائی میں کیونکر صبر کرتے ہیں۔ اور اس کی لاش کو ان کی کرسی پر ڈال دیا۔ اور یہ بھی منقول ہے۔ کہ حضرتؑ کرسی پر بیٹھے تھے۔ اور وہ لڑکا آپ کی گود میں تھا۔ اسی حالت میں اس کو موت آگئی۔ حضرتؑ نے اس کو کرسی پر ڈال دیا۔

(۶) ابو مسلم کہتا ہے۔ کہ جائز ہے۔ کہ جسد سے اس آیت میں جسد سلیمانؑ مراد ہو۔ اور یہ کسی مرض کی وجہ سے ہو۔ کہ اس میں امتحاناً حضرتؑ کو مبتلا کیا گیا ہو۔ اور خلاصۂ کلام یہ ہو۔ کہ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا مِنْهُ عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا۔ اور ہم نے سلیمانؑ کو آزمایا۔ اور اس کے جسد کو اس کی کرسی پر ڈال دیا۔ اور ان کے زندہ جسم کو مرض کی وجہ سے نہایت ضعیف ہو جانے کے سبب جسد یعنی بے جان جسم کر دیا۔ اور

عرب ایسے شخص کو جس کا جسم بہت ہی ضعیف ہو کہتے ہیں۔ اِنَّمَا لَحْمٌ عَلٰی وَضَمٍ (وہ محض گوشت ہے جو تختہ پر دھرا ہے)۔ نیز کہتے ہیں۔ اِنَّہٗ جَسَدٌ بِلَا رُوْحٍ (وہ بیجان جسم ہے)۔ اور اس سے بیماری کی شدت اور ضعف کی زیادتی مقصود ہوتی ہے۔

ثُمَّ اَنَابَ یعنی حالتِ صحت کی طرف رجوع کی۔ اور اس آیت میں حذف اور اختصار پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیۂ ذیل میں ہے۔ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ يَرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَا يُؤْمِنُوْا بِهَا حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ اور اگر اس کلام کو شرح کے ساتھ بیان کرتا۔ تو یوں فرماتا۔ یقول الذین کفروا منہم اے من المجادلین۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ . . . . الی قولہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔ اس میں لفظِ منہم بطور شرح ہے۔ اور اعشیٰ کا قول ہے۔ جس میں اختصار اور حذف پایا جاتا ہے۔ شعر

وَکَانَ السُّمُوْطَ عَلَّقَهَا السِّلْکُ ۔ بِعِطْفَیْ جَیْدَاءَ اُمِّ غَزَالٍ

اور اگر وہ شرح سمیت کہتا۔ تو علقہا السلک منہا کہتا۔

اور کعب بن زہیر کہتا ہے۔ شعر

زَالُوْا فَمَا زَالَ اَنْکَاسٌ وَلَا کُشُفٌ ۔ عِنْدَ اللِّقَاءِ وَلَا مِیْلٌ مَعَازِیْلُ

اور شاعر کی مراد یہ ہے۔ فما زال منہم انکاس ولا کشف۔ اس کے سوا اس کے شواہد بیشمار ہیں۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قول سلیمان جو اس آیت میں منقول ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ کیا اس آیت کا ظاہر حضرت سلیمانؑ کے بخل دامساک اور منافست پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لئے کہ حضرتؑ نے صرف بادشاہت کے سوال پہ ہی بس نہیں کی۔ بلکہ اس میں یہ اضافہ کیا ہے۔ کہ میرے سوا اور کسی کو ایسی سلطنت نہ ملے۔

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاء علیہم السلام خدا سے اسی چیز کی درخواست کرتے ہیں جس کے سوال کرنے کی ان کو اجازت

دی گئی ہو۔ خاص کر جب کہ ایسی درخواست ہو جس کو ان کی قوم جانتی پہچانتی ہو ٭ اور یہ ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالٰی نے حضرت سلیمان علیہ السّلام کو یہ معلوم کرا دیا ہو۔ کہ اگر تم مجھ سے ایسی سلطنت کی درخواست کرو جو تمہارے سوا اور کو نصیب نہ ہو۔ تو وہ تمہارے دین اور زیادتی طاعات کے لئے بہتر اور نہایت مناسب ہو گی ٭ اور یہ بھی معلوم کرا دیا ہو۔ کہ اگر تمہارے سوا کوئی اور ایسی درخواست کریگا۔ تو ہم منظور نہ کرینگے۔ اس لئے کہ اس میں اس کے لئے کوئی بہتری کی صورت نہیں ہے ٭ اور اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی دعا میں یہ شرط کرے۔ اور یوں دعا کرے (اے خدا مجھ کو تمام اہل زمانہ سے زیادہ فارغ البال کر دے۔ اور اتنا رزق مجھے عطا فرما کہ کوئی شخص اس میں میری برابری نہ کر سکے۔ اگر تو جانتا ہے۔ کہ اس حالت میں میرے لئے بہتری اور صلاح ہے۔ اور جو کچھ تو مجھ سے چاہتا ہے۔ میری یہ حالت مجھ کو اس کی طرف دعوت کریگی۔) تو اس حالت میں یہ دعا نہایت خوب اور پسندیدہ ہو گی۔ اور اس حالت میں وہ شخص بخل اور کنجوسی سے منسوب نہ کیا جائیگا ٭

اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ پیغمبر بلا اذن الٰہی ایسی دعا کرے۔ جبکہ قوم کے روبرو یہ شرط نہ کرے مگر دل میں اس شرط کا ارادہ ضرور ہو۔ گو زبان سے اس کو بیان نہ کرے۔ اور ابو علی جبائی نے اسی جواب کو معتبر سمجھا ہے ٭

اور ایک صورت اس آیت میں یہ ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ نے یہ درخواست صرف اس لئے کی ہو۔ کہ یہ سلطنت ان کی نبوت کا ایک نشان ہو۔ تاکہ اس نشانی کے سبب اوروں سے متمیز ہو جائیں۔ جو پیغمبر نہیں ہیں۔ اور آپ کے قول لا ینبغی لاحد من بعدی سے آپ کی مراد یہ ہو کہ میری امت میں سے کسی شخص کو ایسی سلطنت سزاوار نہ ہو۔ اور اس سے آپ کی غرض یہ نہ ہو۔ کہ جو پیغمبر قیامت تک ہوں۔ ان میں سے کسی پیغمبر کو ایسی سلطنت نہ ملے ٭ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے تم کسی شخص سے کہو میں تمہاری اطاعت کرتا ہوں۔ اور تمہارے بعد ایسی اطاعت کسی کی نہ کرونگا۔ اس میں لفظ بعد سے تمہاری مراد زمانہ مستقبل نہیں ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے۔ کہ تمہارے سوا اور کسی کی اطاعت نہ کرونگا ٭ اور یہ وجہ قریب الفہم ہے۔ جو اس آیت میں مذکور بھی ہے ٭ اور ایک وجہ جس کا احتمال اس کلام میں موجود ہے۔ گو مذکور نہیں ہے۔ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ نے ملک آخرت اور ثواب جنت کی درخواست کی ہو۔ جس کو مستحق تکلیف کے

ختم ہونے اور محنت کے زائل ہونے کے بعد یعنی مرنے کے بعد پاتا ہے۔ اس صورت میں قولہ **لا ینبغی لاحد من بعدی** کے معنی یہ ہونگے۔ کہ میرے اس سلطنت اور ثواب کو حاصل کرنے کے بعد پھر کوئی اس کا مستحق نہ ہو۔ کیونکہ تکالیف کے ختم ہونے کے بعد ایسا عمل کرنا صحیح نہیں ہو سکتا جس سے اس درجہ کا مستحق ہو سکے۔ اور قولہ رب اغفر لی۔ جو احکام آخرت میں سے ہے۔ ہمارے اس جواب کو قوت دیتا ہے۔ اور کسی شخص کو یہ کہنا مناسب نہیں ہے۔ کہ اس آیت کا ظاہر تمہاری تاویل کا مخالف ہے کیونکہ لفظ **بعدی** سے **بعد وصولی الی الثواب** مفہوم نہیں ہوتا۔ مگر ہم کہتے ہیں۔ کہ ظاہر آیت ہماری اس تاویل کا مانع اور اس کا منافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ لفظ **بعدی** کو حضرت سلیمانؑ کے متعلقہ حالات میں سے کسی حالت سے متعلق کیا جائے۔ اور جب کہ ہم اس کو وصولی الی الملک سے متعلق کریں۔ تو یہ فائدے اور مطابقت کلام میں ایسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ دیگر حالات مذکورہ سے متعلق کرنے میں ✤ دیکھو جب ہم لفظ بعدی کو بعد نبوتی یا بعد مسئلتی یا بعد ملکی پر محمول کرتے ہیں۔ تو ان سب حالتوں میں اس کا فائدہ ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ اس حالت میں جبکہ ہم اس کو بعد وصولی الی الملک پر محمول کریں۔ کیونکہ یہ حالت بھی ایسی ہے۔ جس میں بعدی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کہنے والا کہتا ہے۔ **دخلت الدار بعدی و وصلت الی کذا و کذا بعدی**۔ اور کہنے والے کا منشا بعد دخولی و بعد وصولی ہے۔ اور یہ نہایت واضح اور ظاہر ہے۔ الحمد للہ علی ذلک ✤

تنزیہ یونس علیہ السلام

مسئلہ اگر کوئی کہے کہ قولہ تعالےٰ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ

مو قال الرضا علیہ السلام ذلک یونس بن متا ذھب مغاضبا لقومہ فظن بمعنی استیقن ان لن نقدر علیہ ای لن یضیق علیہ رزقہ ومنہ قولہ تعالےٰ واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ ای ضیق وقتر فنادی فی الظلمات ظلمۃ اللیل وظلمۃ البحر وظلمۃ

مِنَ الظّالِمِین کے کیا معنی ہیں؟ اور حضرت یونس علیہ السّلام کے غضب سے کیا مراد ہے؟ اور آپ کا یہ غضب کس پر تھا؟ اور انہوں نے کیونکر گمان کیا؟ کہ اللہ تعالےٰ ان پر قدرت نہ پاسکیگا۔ اور ایسا گمان کیا نہیں جاسکتا۔ اور حضرت ؑ نے اپنے ظالم ہونے کا اقرار کس طرح سے کرلیا؟ حالانکہ ظلم قبیح ہے +

جواب۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے۔ کہ یونس علیہ السّلام اپنے پروردگار پر غضب ناک ہوکر نکلے تھے۔ کہ اس نے ان کی قوم پر عذاب نازل نہیں کیا۔ وہ انبیا علیہم السّلام پر افترا پردازی اور ان بزرگواروں کی نسبت بدظنی کرنے میں حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ پر وہی شخص غضبناک ہوسکتا ہے۔ جو اس کا دشمن ہو۔ اور اس بات سے بے خبر ہو۔ کہ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا فعل مومنین کو بھی شایاں نہیں ہے۔ جو انبیاء علیہم السّلام کے تابع اور ان کی امت میں داخل ہوتے ہیں۔ چہ جائیکہ انبیاء علیہم السّلام ایسے فعل قبیح کے مرتکب ہوں جن کو اللہ تعالےٰ نے معصوم خلق فرمایا ہے۔ اور ان کو رفعت منازل اور علو مراتب عطا فرمائی ہے۔ اور اس سے بھی بدتر جاہلوں کا یہ گمان کرنا اور حضرت یونس ؑ کی طرف اس بات کو منسوب کرنا ہے۔ کہ معاذ اللہ حضرت ؑ نے یہ گمان کیا کہ میرا پروردگار جو اپنی قدرت کاملہ سے ہر فعل پر قادر ہے۔ مجھ پر قادر نہ ہوسکیگا۔ اور ہمارے نزدیک ایسا شخص جو انبیاء علیہم السّلام کی نسبت ایسا ظن فاسد رکھتا ہو۔ حد تمیز و تکلیف سے خارج ہے (یعنی مجنون ہے)۔ بلکہ حضرت یونس ؑ کا غضب محض اپنی قوم پر تھا۔ اس لئے کہ وہ اس جناب کی تکذیب کرنے پر قایم اور اپنے کفر پر اصرار کرتے تھے۔ اور آپ ان کی طرف سے اپنے کفر کو ترک کرنے اور تائب ہونے سے ناامید

(بقیہ نوٹ) بطن الحوت ان لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین بہتکی مثل ھذہ العبادۃ التی قد فرغنی لھا من بطن الحوت وقال فلولا انہ کان من المسبحین للبث فی بطنہ الی یوم یبعثون (خلاصۂ ترجمہ) امام رضا علیہ السّلام فرماتے ہیں۔ یونس ؑ بن متا اپنی قوم سے غضبناک ہوکر گئے۔ تو ان کو یقین تھا (ظن یہاں یقین کے معنی میں آیا ہے) کہ خدا اُن سے رزق کو تنگ نہ کریگا۔ (یہاں قدر تنگ کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر خدا فرماتا ہے) کہ جب خدا اُس کا امتحان کرتا ہے۔ تو اس کا رزق تنگ کردیتا ہے۔ پس پکارا حضرت یونس ؑ نے رات و دریا اور شکم ماہی کی تاریکی

اور مایوس ہو گئے تھے۔ اس واسطے حضرتؑ ان کے درمیان سے نکل گئے۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ میری موجودگی میں ان پر عذاب الٰہی نازل ہو جائے۔ اور اللہ تعالےٰ جو فرماتا ہے۔ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ۔ سو اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ یونسؑ نے گمان کیا۔ کہ ہم اس پر راہ کو تنگ نہ کرینگے۔ اور محنت اور تکلیف کو اس پر سخت نہ کرینگے۔ اس لئے کہ ایسا گمان کرنا نبی کے لئے جائز ہے۔ اور اس میں شک نہیں ہے۔ کہ قدرتؐ بالتخفیف اور قدّرتؐ بالتشدید میں بولنے والا تضییق کے معنی لیتا ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْہِ رِزْقُہٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰہُ اللّٰہُ۔ نیز فرماتا ہے۔ اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ۔ یعنی یُوَسِّعُ وَیُضَیِّقُ۔ اور فرماتا ہے۔ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ رَبُّہٗ فَقَدَرَ عَلَیْہِ رِزْقَہٗ۔ یعنی ضَیَّقَ۔ اور یونس علیہ السلام پر جو تضییق اور تنگی خدا نے ڈالی تھی۔ وہ محنت اور مشقت شدید تھی۔ جو ان کو مچھلی کے شکم میں جانے اور اس میں رہنے سے لاحق ہوئی۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کو اس محنت و مشقتِ شدید سے نجات دی۔ اور حضرت یونسؑ نے جو یہ فرمایا۔ جس کی نقل قرآن میں یوں وارد ہوئی ہے۔ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (یعنی یونسؑ نے اندھیرے میں پکارا۔ کہ اے خدا تیرے سوا اور کوئی قابل عبادت نہیں ہے۔ اور میں ظالموں میں سے ہوں) سو یہ آپ کا فرمانا خشوع و خضوع اور انکسار اور فروتنی کے طور پر تھا۔ کیونکہ جب آپ نے اس طرح سے دعا کی۔ تو اللہ تعالےٰ نے ان کو اس امتحان کی تکلیف سے نجات بخشی۔ اور جس ظلمات یعنی اندھیرے سے نجات پانے کی حضرتؑ نے درخواست کی تھی۔ وہ دریا اور شکم ماہی اور رات کی ظلمت یعنی اندھیرا تھا۔ اور آپ کا یہ فعل ایسا ہی تھا۔ جیسے خضوع و خشوع کرنیوالا رجوع الی اللہ

(بقیہ نوٹ) میں۔ کہ اے پروردگار بیشک میں نقصان اٹھانیوالوں میں سے تھا بسبب ترک کرنے ایسی عبادت کے جس کی وجہ سے تو نے مجھ کو شکم ماہی سے نجات دی۔ اور کہا (خدا نے) کہ اگر وہ تسبیح کرنیوالوں میں سے نہ ہوتا۔ تو روز قیامت تک شکم ماہی میں رہتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا۔ کہ حضرت یونسؑ اپنے پر ناراض ہوئے تھے۔ نہ معاذ اللہ خدا سے ناراض ہو کر گئے تھے۔ اور ظلم سے مراد یہاں نقصان ہے۔ اور مطلب آپ کا یہ ہے۔ کہ میں نے بڑا نقصان اٹھایا۔ کہ پہلے سے یہ تسبیح نہ پڑھی۔ فافہم۔

اور اپنی تقصیر کا اعتراف و اقرار کیا کرتا ہے۔ اور کوئی شخص یہ نہیں کہ سکتا۔ کہ حضرت یونس ؑ نے اپنے ظالم ہونے کا اقرار کیونکر کیا۔ حالانکہ آپ نے کوئی ظلم نہیں کیا تھا۔ اور اس حالت میں یہ قول کذب محض ہے ۔ اور یہ جائز نہیں ہے۔ کہ نبی خدا حالت خشوع و خضوع میں یا کسی اور حالت میں کذب کا استعمال کرے۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ آپکی مراد انی کنت من الظالمین کہنے سے یہ ہو۔ کہ میں اس جنس سے ہوں۔ جن سے ظلم و قوع پذیر ہوا کرتا ہے۔ اس صورت میں حضرت کا یہ فرمانا بالکل صدق اور درست ہوگا۔ گو آپ کا یہ قول محض خشوع اور خضوع کے طور پر وارد ہوا ہے۔ اس لئے کہ بشر کی جنس سے ظلم کا وقوع میں آنا ممکن ہے ✣

پس اگر کوئی کہے۔ کہ جس حالت میں آپ فی نفسہ ظلم سے بالکل بری ہیں تو آپ کو اپنے تئیں اس جنس سے منسوب کرنے میں کیا فائدہ ہوا؟ جس سے ظلم وقوع میں آیا کرتا ہے ✣

تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔ کہ یونس ؑ کے اس قول میں خدا کے سامنے عجز و انکسار اور خشوع و خضوع کرنے اور اپنے نفس سے تکبر اور تجبر کی نفی کا اظہار ہے۔ اس لئے کہ جو شخص اس بادشاہ قدیر کی طرف رغبت کرنے میں ساعی ہوتا ہے۔ اس کو لازم ہے کہ اس کے حضور میں عجز و انکسار کا اظہار کرے۔ اور اس کی جناب میں خشوع و خضوع کرنے میں ساعی ہو۔ اور سب سے بڑی خشوع و خضوع یہ ہے۔ کہ انسان اپنے نفس کو ایسے گروہ کی طرف منسوب کرے۔ جو خطا و صواب کا فاعل ہو۔ چنانچہ جب کسی شخص کو اپنے عجز و انکسار کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ میں آدمی ہوں۔ فرشتہ نہیں ہوں۔ اور میں اس گروہ میں داخل ہوں۔ جس سے خطا اور صواب دونو سرزد ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت اس قول سے خطا کو اپنے نفس سے منسوب کرنا اس کا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے وہی فائدہ مطلوب ہے۔ جس کا ذکر اوپر گزرا ✣

دوسری صورت اس کے جواب کی یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ہم قصہ آدم ؑ میں آیہ ربنا ظلمنا انفسنا کی تاویل میں بیان کر چکے ہیں۔ کہ اس سے مراد حضرت آدم ؑ و حوا ؑ کی یہ ہے۔ کہ اے خدا ہم نے اپنے نفسوں کو ثواب کی کمی کا نقصان پہنچایا۔ اور اس سے

ان کے حقے کو کم کر دیا۔ اس لئے کہ ظلم کے معنی لغت عرب میں نقص اور ثلم کے ہیں۔ اور جس شخص کو کسی امر مُستحب کا حکم دیا گیا ہو جس کے کرنے پر وہ ثواب کا مستحق ہوتا۔ اور وہ اس کو بجا نہ لائے۔ اور ترک کر دے۔ تو اس شخص کو یہ کہنا جائز ہے۔ کہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ کیونکہ اس نے اپنے نفس کو اس ثواب کے کم ہو جانے اور نہ ملنے کا نقصان پہنچایا۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت یونس علیہ السلام کا اس قول سے یہی مقصود اور منشا ہو۔ اس لئے کہ حضرت ؑ نے بیشک بہت سے مستحبات کو ترک کیا تھا۔ کیونکہ تمام مستحبات کا پورا کرنا نہایت مشکل اور متعذر ہے۔ اور یہ جواب ان لوگوں کے جواب سے نہایت اولےٰ اور انسب ہے۔ جو صغائر کو انبیاء علیہم السلام کے لئے جائز رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت یونس ؑ کا نکلنا خدا کی بلا اجازت تھا۔ اور یہ قبیح اور گناہ صغیرہ تھا۔ حالانکہ ان کے گمان کے موافق بھی یہ بات لازم نہیں آتی۔ کیونکہ ظاہر قرآن اس پر دلالت نہیں کرتا۔ اور اصل یہ ہے۔ کہ قول حضرت یونس علیہ السلام اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ نے ان کو اس شبہ میں ڈالا ہے۔ جس سے انہوں نے یہ گمان کر لیا۔ کہ حضرت یونس ؑ بلا اجازت پروردگار نکل کر قبیح اور گناہ صغیرہ کے مرتکب ہو گئے۔ اور ہم اس آیت کی تفسیر اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے۔ کہ یہ قول معصیت کی بابت خبر دیتا ہے۔ اور مخالف یہ بھی نہیں کہ سکتا۔ کہ نفل کا تارک ظالم کے نام سے کیونکر نامزد ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہم تارک نفل کو لغت میں ظالم کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ اوپر بیان کر چکے ہیں۔ گو عرف میں اطلاق لفظی اس کا مقتضی نہیں ہے۔ نیز اس سائل پر جو یہ کہتا ہے۔ کہ تارک نفل ظالم کیونکر کہلا سکتا ہے۔ ایسا ہی سوال ہو سکتا ہے جب کہ اس سے کہا جائے۔ کہ فاعل معصیت کو ظالم کیوں کہتے ہیں۔ حالانکہ ظلم عرف میں اس خاص ضرر کو کہتے ہیں۔ جو غیر کو پہنچایا جائے۔ پس جب کہ وہ اس کے جواب میں کہے۔ کہ معصیت میں ظلم کے معنی موجود ہیں۔ گو اس میں کسی غیر کو ضرر نہ پہنچایا جائے۔ اس لئے کہ اس کا مرتکب ہونے سے اس کے فاعل کے ثواب میں کمی ہو گئی +

تب ہم کہینگے۔ کہ بعینہٖ یہی معنی مستحبات اور نوافل کی حالت میں بھی متحقق ہیں۔ کیونکہ ترک نوافل کی صورت میں اس ثواب میں کمی ہو جاتی ہے۔ کہ ان کے بجالانیکی

حالت میں جس کا وہ مستحق ہوتا +

بعد ازاں ہم کہتے ہیں کہ ابو علی جبائی اور جو علماء اس باب میں اس کے ہم خیال ہیں۔ کہ احباط میں موازنہ کا ہونا ممتنع اور ناممکن ہے۔ وہ ہمارے اس جواب کا کچھ بھی جواب نہیں دے سکتے۔ باایں ہمہ میں نہیں جانتا۔ کہ معصیت یونس ع کو کس طرح سے ظلم قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں ظلم کے معنی مطلقاً پائے ہی نہیں جاتے +

رہا قول تعالےٰ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ (اپنے پروردگار کے حکم پر صبر کر اور مچھلی والے یعنی حضرت یونس ع کی مانند نہ بن)۔ سو اس سے وہ بات مفہوم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ جہال کا گمان ہے۔ کہ حضرت یونس ع کو اپنی تنگی اخلاق کی وجہ سے بار ہائے نبوت گراں اور بوجھل معلوم ہوتے۔ اس لئے ان کو اپنے کندھے سے پھینک دیا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ خداوند متعال نے جس محنت و تکلیف میں امتحاناً حضرت یونس ع کو مبتلا کیا تھا۔ اور اس کے متحمل ہونے کی صورت میں ثواب ہائے عظیم کا وعدہ فرمایا تھا۔ حضرت ان مصائب کی برداشت نہ کر سکے۔ اور اللہ تعالےٰ سے ان کی شکایت کی۔ اور ان سے نجات اور رہائی پانے کی درخواست کی۔ اور اگر وہ صبر کرتے۔ تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ اور اللہ تعالےٰ اپنے حبیب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سب پیغمبروں سے اعلےٰ اور افضل مرتبہ اور منازل عطا فرمانا چاہتا ہے۔ اس لئے ایسا فرمایا۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ +

بیان تنزیہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں۔ وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (جبکہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ فرمائیگا اے عیسےٰ ابن مریم آیا تو نے ہی ان لوگوں سے کہا تھا۔ کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود مانو۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام جواب میں عرض کرینگے۔ اے خدا تو پاک و پاکیزہ ہے مجھ کو سزاوار نہیں ہے کہ میں وہ بات کہوں

جس کا مجھ کو حق حاصل نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ کہا ہوتا۔ تو تجھ کو معلوم ہوتا۔ اے خدا جو کچھ میرے دل میں ہے۔ اس کا حال تجھ کو معلوم ہے۔ اور مجھ کو تیرے نفس کا حال معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ تو ہی غیبوں کا خوب جاننے والا ہے)۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یا تو حضرت عیسےٰؑ نے ایسا کہا۔ یا وہ اس بات کو کہ سکتے تھے۔

اور یہ بات اس عقیدے کے برخلاف ہے۔ جو انبیاء علیہم السّلام کے باب میں تم شیعہ گروہ رکھتے ہو۔ یا یہ ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت عیسےٰؑ نے یہ بات نہیں کہی۔ اور نہ ان کو اس بات کا کہنا جائز ہی تھا۔ اس صورت میں اللہ تعالےٰ کے حضرت عیسےٰؑ سے اس امر کو دریافت کرنے اور ان کے جواب دینے کے کچھ بھی معنی نہ ہوئے۔ اور یہ مکالمہ محض بے سود اور لغو ٹھیرا۔ پھر یہ بتائیں۔ کہ قولِ حضرت عیسےٰؑ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ کے کیا معنی ہیں۔ حالانکہ ایسا لفظ اللہ کی شان میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ قول تعالےٰ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ حقیقت میں استفہام نہیں ہے۔ گو استفہام کی صورت میں واقع ہوا ہے۔ بلکہ اس قول سے نصاریٰ کو سرزنش کرنا اور دھمکانا اور ان کی تکذیب کرنا مطلوب ہے۔ جو حضرت عیسےٰؑ کی نسبت ایسا دعوےٰ کرتے ہیں۔ اور یہ قول بعینہٖ ایسا ہے۔ جیساکہ ہم میں سے کوئی شخص دوسرے شخص کو کہے۔ اَفَعَلْتَ کَذَا وَکَذَا (آیا تو نے یہ کام کیا ہے۔ حالانکہ اس کہنے والے کو معلوم ہو۔ کہ اس شخص نے ایسا کام نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس قول سے اس شخص کا یہ منشا ہو۔ کہ ان لوگوں کو سرزنش اور ملامت کرے۔ جو اس شخص کی نسبت ایسا کرنے کا دعوےٰ کرتے ہوں۔ اور مدعی علیہ اس کے جواب میں اس کام سے انکار کا اظہار کرکے اپنے مدعی کو نشانہ ملامت و سرزنش بنائے۔

اور دوسری صورت اس کے جواب کی یہ ہوسکتی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کی مراد اس قول سے یہ ہو۔ کہ حضرت عیسےٰؑ کو اس امر سے واقف کردے۔ کہ تمہاری امت کا ایک گروہ تم کو اور تمہاری والدہ کو دو معبود مانتا تھا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ حضرت عیسےٰؑ اس وقت سے پہلے اپنی امت کے اس عقیدے سے واقف نہ ہوئے ہوں۔ اور اس کی نظیر متعارف طور پر یہ ہوسکتی ہے۔ کہ ایک شخص اپنا ایلچی کسی قوم کی طرف بھیجے۔ اور وہ ایلچی اس کے پیغام کو اس قوم کو پہنچادے۔ بعد ازاں وہ ایلچی اس قوم سے الگ

ہو جائے۔ اور وہ قوم اس کی علیحدگی کے بعد اس کے قول کی مخالفت کرے۔ اور اس کے پیغام کو تبدیل کر دے۔ اس صورت میں کہ اس ایلچی کو یہ حال معلوم نہ ہو۔ اور بھیجنے والے کو معلوم ہو جائے۔ پس جبکہ اس شخص کو یہ منظور ہو کہ قوم کی مخالفت سے اپنے ایلچی کو آگاہ کرے۔ تو وہ اس کو اس واقعہ سے خبردار کرنے کی غرض سے اس طرح کہ سکتا ہے۔ ءَ اَنْتَ اَمَرْتَهُمْ بِكَذَا وَكَذَا۔ کیا تو نے ہی ان کو ایسا حکم دیا تھا؟

اور حضرت عیسےٰ نے جو یہ عرض کیا۔ کہ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ سو لفظ نفس لغت میں مختلف معنی کے لئے مستعمل ہوتا ہے:۔

(۱) نفس انسان وجمیع حیوانات جس کے نکلنے سے آدمی اور دیگر حیوانات حالت حیات سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اور مردہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ اس آیت میں نفس سے جان مراد ہے +

(۲) نفس اس شے کی ذات کو کہتے ہیں جس کی نسبت کوئی خبر دی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ فعل ذلك فلانٌ نفسهٗ۔ یعنی فلاں شخص نے بذات خود وہ کام کیا ہے۔ جبکہ خود اس نے وہ کام کیا ہو۔ اور دوسرا اس میں شامل نہ ہو۔ اسی طرح کہتے ہیں۔ اَعْطٰی كَذَا وَكَذَا نفسهٗ یعنی اس شخص نے خود وہ چیز دی ہے +

(۳) نفس بمعنی انفۃ (ننگ وعار) ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ لیس بفلانٍ نفسٌ یعنی فلاں شخص کو شرم نہیں ہے +

(۴) نفس بمعنی ارادہ۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ نفسُ فلانٍ كذا وكذا یعنی فلاں شخص نے ایسا ارادہ کیا ہے۔ اور شاعر کہتا ہے۔ شعر

فنفساي نفسٌ قالت ائت ابن بجدلٍ + تجد فرجا من كل غمّة تهابها
ونفسٌ تقول اجهد نجاءك لا تكن + كخاضبةٍ لم يغن عنها خضابها

اور حکایت ذیل اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ کہ کسی شخص نے حسن بصری سے کہا۔ اے ابوسعید۔ میں نے کبھی حج نہیں کیا۔ میرے دو نفس ہیں۔ ایک تو کہتا ہے۔ کہ تو حج کر۔ دوسرا کہتا ہے۔ کہ نکاح کر۔ حسن بصری نے اس سے کہا کہ نفس تو ایک ہی ہے۔ لیکن ایک ارادہ تجھ کو کہتا ہے۔ کہ حج کر۔ اور دوسرا ارادہ کہتا ہے۔ کہ نکاح کر۔ پھر اس کو حج کرنے کا حکم دیا +

اور ممزق عبدی شاعر کہتا ہے۔ شعر

اَلَا مَن لِعَینٍ قَدْ نَاھَا حَمِیمُھَا ✽ وَ اَرَّقَھَا بَعدَ المَنَامِ ھُمُومُھَا
فَبَاتَتْ لَہٗ نَفْسَانِ شَتَّا ھُمُومُھَا ✽ فَنَفْسٌ تُعَزِّیْھَا وَ نَفْسٌ تَلُوْمُھَا

(۵) نفس بمعنی عین یعنی نظر بد جو انسان کو لگ جاتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ اَصَابَتْ فُلَانًا نَفْسٌ یہاں نفس بمعنی عین ہے ✽

اور روایت ہے۔ کہ جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم جب کسی شخص پر کچھ دم کرتے تھے۔ تو فرماتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ وَ اللّٰہُ یَشْفِیْکَ مِنْ کُلِّ دَاءٍ ھُوَ فِیْکَ مِنْ عَیْنٍ عَائِنٍ وَ نَفْسٍ نَافِسٍ وَ حَسَدِ حَاسِدٍ ✽ اور ابن اعرابی کہتا ہے۔ کہ نفوس وہ عورت ہے۔ جو لوگوں کو آنکھ سے نظر بد لگاتی ہے۔ اور ایک شخص کا ذکر ہے۔ کہ خدا کی قسم وہ حسود یعنی حاسد اور نفوس یعنی نظر لگانے والا اور کذوب یعنی بہت جھوٹا تھا ✽

اور عبد اللہ بن قیس کہتا ہے۔ شعر

الرقیات یتقی اھلُہا النفوس علیہا ✽ فعلی نحوھا الرقی والتمیم

(۶) نفس بمعنی ایک بار چمڑے کا رنگنا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ اعطنی نفسًا من الدباغ یعنی جس قدر کہ ایک بار دباغت دیا گیا ہے مجھ کو دے ✽

(۷) نفس بمعنی غیب یعنی پوشیدگی ✽ چنانچہ کہتے ہیں۔ اِنّی لا اعلم نفس فلان یعنی میں فلاں شخص کے نفس یعنی پوشیدگی سے واقف نہیں ✽ اور حضرت عیسٰے کے قول (تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک) کی بھی یہی تاویل ہے۔ یعنی تعلم غیبی وما عندی ولا اعلم غیبک وعندک (تو میری پوشیدگی اور میرے اسرار سے واقف ہے۔ اور میں تیری پوشیدگی اور تیرے اسرار سے واقف نہیں ہوں) ✽

اور بعض کا قول ہے۔ کہ نفس بمعنی عقوبت بھی آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ اُحَذِّرُکَ نفسی ای عقوبتی یعنی میں تجھ کو اپنی عقوبت سے ڈراتا ہوں ✽ اور بعض مفسرین نے قولہ تعالٰے وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔ اور اس کے معنی یحذرکم اللہ عقوبتہ کئے ہیں ✽ یہ روایت ابن عباس اور حسن بصری سے مروی ہے ✽

اور باقی مفسرین اس آیت کے معنی اس طرح کرتے ہیں۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ اِيَّاهُ (اللہ تم کو اپنے آپ سے ڈراتا ہے)

اگر کوئی کہے۔ کہ غیب کو نفس کے نام سے موسوم کرنے کا کیا باعث ہے؟

تو ہم اس کا جواب یہ دینگے۔ کہ غیب کو نفس کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہو۔ کہ چونکہ نفس انسانی ایسا خفیۃ الموضع ہے۔ کہ انسان اپنے اسرار اس میں امانت رکھتا ہے۔ اس لئے جو چیز ان اسرار کو پوشیدہ رکھتی ہے۔ اور ان کی پوشیدگی میں کوشش کرتی ہے۔ اس کو ان کے قائم مقام کر دیا۔ اور چونکہ غیب میں کتمان اور خفا کی صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لئے اس کو یعنی غیب کو نفس کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ اور جبکہ حضرت عیسٰے کا قول تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ مقدم ہے۔ تو خدا کا قول لا اعلم ما فی نفسك فرمانا جس میں اپنے نبی کی بابت خبر دیتا ہے مستحسن اور پسندیدہ ہے۔ تاکہ کلام میں صنعت ازدواج ہو جائے۔ اسی سبب سے ابتدا سے کلام میں آنا لَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِ اللّٰهِ کہنا خوب نہیں ہے۔ گو صورت اوّل کے ساتھ ابتدا کرنا درست ہے۔ اور اس کی نظیریں کلام خدا میں بہت مشہور و معروف ہیں۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ آیۂ ذیل کے معنی کیا ہیں؟ جس میں اللہ تعالےٰ عیسٰے کی زبانی حکایت فرماتا ہے۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (اگر تو ان کو عذاب دے۔ تو وہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر تو ان کو بخش دے تو تو غالب اور صاحب حکمت ہے)۔ جبکہ حضرت عیسٰے علیہ السّلام کو معلوم تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ کفار کی مغفرت نہیں کرتا ہے۔ تو حضرت کا یہ قول کیونکر جائز ہوا۔

جواب۔ اس کلام سے مراد یہ ہے۔ کہ حضرت عیسٰے علیہ السّلام نے اس امر کو اپنے مالک کے سپرد کیا۔ اور اس مدبر کے حوالے کر دیا۔ جو تمام امور کی تدابیر کرتا ہے۔ اور اپنی قوم کے امور سے اپنا غیر متعلق ہونا اور ان سے بالکل اپنا بری ہونا ظاہر کیا۔ چنانچہ جب کسی شخص کا منشا یہ ہو۔ کہ فلاں امر کی تدبیر سے میں بالکل بری ہوں۔ اور میرا اس سے کچھ تعلق نہیں۔ اور اپنے امر کو کسی اور شخص کے سپرد کر دے۔ تو وہ اس طرح کہا کرتا ہے۔ هٰذَا الْاَمْرُ لَا مَدْخَلَ لِيْ فِيْهِ فَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَفْعَلَهٗ وَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَتْرُكَهٗ (اس کام میں میرا کچھ دخل نہیں ہے۔ خواہ تو اس کام کو کر خواہ نہ کر) اور وہ شخص قطعی اور یقینی طور پر

اس بات کو جانتا ہے۔ کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور اس سے ظہور میں آئیگی*
اور یہ قول حضرت عیسٰےؑ علیہ السلام کا نہایت پسندیدہ اور مستحسن ہے۔ کیونکہ اس میں تفویض اور تسلیم پائی جاتی ہے*

اور حسن بصری سے اس آیت کے معنی اس طرح مروی ہیں۔ اِن تعذبھم فباقامتھم علی کفرھم وان تغفرلھم فبتوبۃ کانت منھم (خواہ توان کے کفر پر قائم رہنے کے سبب سے ان کو عذاب کر۔ خواہ ان کے توبہ کرنے کے سبب ان کو بخش دے) گویا حسن نے توبہ کی شرط لگائی ہے۔ گو آیت میں ظاہرا شرط موجود نہیں ہے*

سوال۔ اگر کوئی اعتراض کرے۔ کہ اس آیت میں وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ کیوں نہ کہا۔ حالانکہ غفور رحیم کا لفظ مناسب مقام اور العزیز الحکیم کی نسبت اس کے معنی زیادہ موزون تھے*

جواب۔ یہ سوال وہ شخص کرسکتا ہے۔ جو آیت کے معنی نہیں جانتا۔ کیونکہ اس آیت میں **مغفرت** کی درخواست نہیں ہے۔ جو لفظ **غفور رحیم** زیادہ تر مناسب ہوتا۔ جیسا کہ سائل کا منشا ہے۔ بلکہ اس قول میں تو محض تفویض اور تسلیم ہے۔ کہ امر کو اس کے مالک کی منشا پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر یہاں پر فَاِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ کہا جاتا۔ تو یہ شبہ پڑتا۔ کہ حضرت عیسٰےؑ نے ان کے لئے مغفرت کی دعا کی ہے۔ حالانکہ اس کلام سے آپ کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں لفظ العزیز الحکیم از روئے معنی کے غفور الرحیم کی نسبت نہایت بلیغ اور کامل طور پر اس مراد کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ **غفران** اور **رحمت** کی بنیاد کبھی حکمت اور صواب پر ہوتی ہے۔ اور کبھی نہیں۔ پس یہ دونوں لفظ (غفران اور رحمت) بالاطلاق حکمت اور حسن پر دلالت نہیں کرتے۔ اور العزیز الحکیم سے موصوف کرنے میں غفران اور رحمت کے معنی بھی موجود ہیں۔ جبکہ ان کا ہونا صواب اور بہتر ہو۔ اور علاوہ ان دونوں معنی کے اور بہت سے معانی پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ عزیز اس منیع (بلند) قادر (صاحب قدرت) کو کہتے ہیں جس کو نہ کوئی ذلیل کرسکے۔ نہ کوئی اس پر ظلم کرسکے۔ اور **غفور رحیم** سے یہ معانی ہرگز مفہوم نہیں ہوسکتے۔ اور حکیم وہ شخص ہے۔ جو اشیاء کو ان کے مناسب مقام میں رکھے۔ اور ان کی اغراض ان کو پہنچائے۔ اور حسن اور جمیل کے سوا کوئی فعل

اس سے ظہور میں نہ آئے۔ پس جب کہ حکمت الٰہی کا مقتضا ہو۔ تو مغفرت اور رحمت دونوں لفظ حکیم میں داخل ہو گئے۔ اور اس لفظ کے معنی کہ وہ اپنے سب افعال میں صاحب حکمت ہے۔ ان دونوں (مغفرت اور رحمت) کے ماسوا ہے۔

اس قسم کے اعتراض انہی لوگوں نے کئے ہیں۔ جو محض ملحد اور کلام الٰہی کے معنی سے بالکل نابلد اور ناآشنا ہیں۔ ورنہ جو الفاظ کہ قرآن شریف میں وارد ہوئے ہیں۔ اور جو الفاظ کہ وہ ذکر کرتے ہیں۔ ان میں بلاغت اور تکمیل معانی اور بہت سے معانی پر مشتمل ہونے کے لحاظ سے نہایت فرق ہے۔

بیان تنزیہ سردار انبیا حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قول تعالٰے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کے کیا معنی ہیں؟ جس میں آنحضرتؐ کی طرف خطاب ہے۔ کہ ہم نے تجھ کو ضال (گمراہ) پایا۔ پس ہدایت کی۔ آیا اس آیت میں ضال سے ضلال فی الدین یعنی دین میں گمراہ ہونا مراد نہیں ہے؟ اور یہ بات یعنی نبی کا گمراہ ہونا تم فرقۂ امامیہ کے نزدیک نہ قبل نبوت جائز ہے۔ نہ بعد نبوت۔

جواب۔ اس آیت کے معنی میں کئی جواب ہیں۔

جواب اوّل۔ یہ کہ اللہ تعالٰے کی مراد وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى سے یہ ہو کہ وجدک ضالا عن النبوۃ فھداک الیھا یعنی اللہ تعالٰے تمکو نبوت سے گمراہ پایا۔ پس اس نے تم کو نبوت کی طرف رہنمائی کی۔ یا یہ کہ آپ اس شریعت اسلام سے نابلد تھے۔ جو آپ پر نازل ہوئی۔ اور خلقت کی طرف اس کے پہنچانے کا حضرتؐ کو حکم ہوا۔ اور جس امر کا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس کی طرف اللہ تعالٰے کا حضرتؐ کو

ل اس آیہ شریفہ کی تفسیر کرنے سے پہلے دو ضروری باتوں کا عرض کرنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ ہر ایک لفظ میں اضافت والنسبت من حیث الوضع ملحوظ و معتبر ہے۔ لذت حاق معنی (وسط) پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہر ایک مضاف الیہ اور منسوب الیہ کے ساتھ معنی بدل جاتے ہیں۔ یعنی مضاف الیہ

رہبری کرنا اللہ تعالےٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور اس آیت میں گویا پروردگار عالم اپنا احسان جتلاتا ہے۔ اور اپنی نعمتوں کو یاد دلاتا ہے۔ اور کوئی شخص یہ اعتراض نہیں کر سکتا۔ کہ ظاہر آیت تو ان معنوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس آیت میں محذوف کا مقدر کرنا ضروری ہے جس کی طرف ضلال کو منسوب کیا جائیگا۔ اس لئے کہ ضلال کے معنی ذھاب (جانا) اور انصراف (پھرنا) ہیں۔ پس اس چیز کا ہونا ضروری ہے۔

(بقیہ نوٹ) اور منسوب الیہ کی حالت و شان کے موافق و مطابق ہوتے ہیں۔ ایک لفظ بھی مشکل سے ایسا ملیگا جو ہر ایک مضاف الیہ کے ساتھ ایک ہی معنی دیتا ہو۔ دیکھو خدا بھی موجود ہے۔ اور دیگر ممکنات بھی موجود ہیں۔ لیکن وجود خدا اصلی و عین ذات واجب و وجود حق ہے۔ اور وجود ممکنات ظلی و عرضی اور محتاج ہے۔ ایسا ہی حیات خدا سے اور مراد ہے۔ اور حیات دیگر ممکنات اور چیز ہے۔ حیات خدا عین ذات۔ ازلی ابدی سرمدی لم یزل ولایزال ہے۔ اور ہماری حیات فانی نہیں۔ بلکہ عین فنا ہے۔ اور حیات پیغمبر اور ہی چیز ہے۔ وھو الباقی ببقائہ۔ قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ انا وجہ اللہ الباقی بعد فناء کل شئ کیونکہ وہ وجود مطلق ہے۔ اور ہمارا وجود وجود مقید اور خدا کا وجود وجود حق۔ اسی طرح علم کو ملاحظہ کیجئے۔ خدا بھی علیم و عالم ہے۔ اور نبی بھی عالم ہوتا ہے۔ اور دیگر انسان بھی عالم کہلاتے ہیں۔ کیا تینوں مقام پر علم کے ایک ہی معنی نہیں؟ ہرگز نہیں علم خدا عین ذات اصلی و حقیقی ہے۔ اور نبی کا علم زائد بر ذات اور ظلی ہے۔ لیکن عین مطابق واقع بلکہ حقیقت واقعیہ۔ کیونکہ وہ بالقاء وحی ہوتا ہے۔ اور علم علماء دیگر محض صور جزئیہ علمیہ ہیں۔ نہ حقایق واقعیہ۔ لفظ صلوٰۃ کو دیکھئے جب خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ تو بنابر شہور رحمت کے معنی دیتا ہے۔ جب ملائکہ کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ استغفار کے معنی میں آتا ہے۔ اور جب انسانوں سے اس کو نسبت دی جاتی ہے۔ تو طلب رحمت و دعائے مخصوص کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس خدا کی صفت سمیع و بصیر و متکلم وغیرہ ہے۔ لیکن اُس کی سماعت بصارت اور کلام کے یہ معنی نہیں جو ہم میں پائے جاتے ہیں۔ وہ سنتا ہے۔ لیکن اُس کے کان نہیں۔ وہ دیکھتا ہے۔ مگر آنکھ سے مبرا ہے۔ وہ کلام کرتا ہے۔ لیکن زبان بے زبانی ہے۔ ایسے ہی انسان اگر اپنے نفس میں غور کرے۔ تو اُس کو ان صفات سے متصف پائیگا۔ دیکھو۔ ہر ایک شخص خواب میں مشاہدہ کرتا ہے۔ کہ وہ چلتا ہے۔ پھرتا ہے۔ بولتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ سُنتا ہے۔ حالانکہ نہ اُس میں کان ہیں۔ نہ ناک۔ اور نہ آنکھ وغیرہ۔ پس اگر ہر ایک مقام پر سماعت بصارت۔ کلام سے ایک ہی معنی

جس سے انصراف وقوع میں آئے۔ اب جو شخص کہ یہ معنی لیتا ہے۔ کہ یہاں ضلال سے ذھاب عن الدین یعنی دین سے نکلنا مراد ہے۔ اس کو لازم ہوگا۔ کہ اس لفظ کو مقدر کرکے محذوف کرے۔ تاکہ لفظ ضلال اس کے متعلق کرے۔ اور وہ اس حالت میں ہمارے مقدر اور محذوف نکالنے سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

(بقیہ نوٹ) مراد لئے جائیں۔ اور ایک ہی جیسی کیفیات و آثار تسلیم کئے جائیں۔ تو ہرگز صحیح نہیں۔ ہر ایک شے کی قوتیں اُسی کی صنف اور اُسی کی سنخ سے ہوتی ہیں۔ نہ کہ ہر ایک میں یکساں و مساوی۔ بہرحال ہر ایک مقام پر اور ہر ایک مضاف الیہ و منسوب الیہ کے ساتھ ایک معنی مراد لینا جہالت و نا واقفیت پر مبنی ہے۔ ہر ایک لفظ کے معنی کرتے ہوئے مضاف الیہ و منسوب الیہ کا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے۔ کہ کس کی طرف یہ منسوب ہے۔ کس کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور کس کی شان میں وارد ہوا ہے۔

دوم۔ لفظ ضلالت و ضلال لغت میں بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً گمراہ ہونا۔ خواہ دین سے گمراہ ہو۔ یا کسی راستے سے۔ اور یہ وہ شخص ہے۔ جو غلط راستے پر چل رہا ہے۔ اور اُسی کو حق سمجھتا ہے۔ اور حق کی خبر ہی نہیں۔ راہ گم کرنا۔ یہ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے۔ جو غلط راستے پر غلطی سے چل رہا ہے۔ اور راہ حق کی تلاش میں ہے۔ اور یہ جانتا ہے۔ کہ میں رستہ بھول گیا ہوں۔ اور غلط راستے پر چل رہا ہوں۔ بدراہ ہونا وہ شخص ہے۔ جو ایسے راستے میں چل رہا ہو۔ جو اُس کو حق پر پہنچا دیگا۔ لیکن اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ کانٹوں۔ درندوں۔ چوروں وغیرہ کا خطرہ ہے۔ اور جو صاف و سیدھا راستہ تھا۔ وہ اس سے چھوٹ گیا ہو۔ دُور ہو جانا۔ چلا جانا۔ بچھڑنا۔ سرگردانی کرنا۔ مرنا۔ ہلاک ہونا۔ گم ہونا۔ خاک ہو جانا۔ چھپ جانا۔ مغلوب ہونا۔ نقصان اٹھانا۔ خسارے میں پڑنا۔ ہلاکت میں پڑنا۔ بیقدر ہونا۔ ناشناختگی۔ غیبت۔ سراسیمگی وغیرہ۔ کلام حمید مجید میں بھی تقریباً اٹھارہ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بغرض آگاہی مومنین ہم چند آیات یہاں ذکر کرتے ہیں۔

فقد ضل ضلالاً بعیدًا (وہ بڑی بھاری گمراہی میں پڑ گیا)۔ فقد ضل سواء السبیل (سیدھے راستے سے منحرف ہو گیا)۔ فقد ضل ضلالاً مبینًا (کھلم کھلا گمراہ ہو گیا)۔ ولقد ضل قبلهم اکثر الاولین (البتہ اُن سے پہلے بہت سے گمراہ ہوئے)۔ وضل عنهم ما کانوا یفترون (کھو گیا جو کچھ وہ افترا کرتے تھے)۔ ضل سعیهم فی الحیٰوة الدنیا (اُن کی تمام اپنی زندگی دنیویہ ہی میں ضایع

جواب دوم یہ کہ اس آیت میں ضلال سے ضلال عن المعیشۃ وطریق الکسب مراد ہو (یعنی حضرتؐ معیشت اور کسب معاش کے طریق سے آگاہ نہ تھے)۔ اور اس شخص کو جو طریق کسب اور وجہ معاش سے نابلد ہو۔ اس کے حق میں کہا جاتا ہے۔ ھو ضالٌ لا یدری ما یصنع ولا این یذھبُ یعنی وہ بالکل بے خبر ہے۔ اور نہیں جانتا۔ کہ کیا کرے۔ اور نہ اس کو پتہ معلوم ہے۔ کہ کہاں جائے۔ پس اللہ تعالے نے اس آیت میں اپنے حبیب صلعم پر

(بقیہ نوٹ) ہوئی)۔ وضل عنکم ما کنتم تزعمون (باطل ہوگیا جو کچھ تم گمان کرتے تھے یعنی تمہارا گمان باطل نکلا)۔ وضل عنہم ما کانوا یدعون من قبل (اور گم ہوگیا وہ جس کو پہلے پکارتے تھے اور بلاتے تھے)۔ واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ (اور جب تم کو دریا میں تکلیف پہنچی۔ تو گم ہوگیا وہ جس کو تم بلاتے تھے۔ مگر خدا یعنی مصیبت کے وقت وہی کام آیا)۔ وما دعاء الکافرین الا فی ضلال (نہیں ہے کافروں کی دعا مگر بیکار و بیفائدہ)۔ وما کید الکافرین الا فی ضلال (اور نہیں ہے کافروں کا مکر مگر بیفائدہ و بیکار)۔ وقال نسوۃ فی المدینۃ امرءۃ العزیز تراود فتاہ عن نفسہ قد شغفہا حبًا انا لنراھا فی ضلال مبین (اور شہر کی عورتوں نے کہا۔ عزیز مصر کی بی بی اپنے جوان کو بہلاتی ہے۔ اور اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ اور اس پر اس کی محبت غالب ہوگئی ہے بیشک ہم اس کو ظاہر بظاہر غلطی میں پاتے ہیں۔ یہاں ضلال سے مراد دین سے گمراہی نہیں۔ کیونکہ مصر کی عورتیں زلیخا کو اپنے نزدیک بیدین نہیں جانتی تھیں)۔ ان ابانا لفی ضلال مبین (قول برادران یوسف۔ بیشک ہمارا باپ یوسفؑ کی محبت میں مغلوب ہے)۔ وقالوا تاللہ انک لفی ضلالک القدیم (انہوں نے (برادران یوسفؑ) کہا۔ خدا کی قسم تم بیشک اپنے اسی غلبہ محبت میں مبتلا ہو۔ اور اسی میں غرق و محو ہو رہے ہو)۔ لکن الظالمون الیوم فی ضلال مبین (لیکن ظالم گنہگار آج کے دن (قیامت) ظاہر بظاہر ٹوٹے اور نقصان میں ہیں)۔ ان المجرمین فی ضلال وسعر (بیشک مجرم لوگ ہلاکت و عذاب میں ہیں)۔ ذالک ھو الضلال البعید (سورۂ ابراہیمؑ۔ یہی بہت بڑا نقصان ہے)۔ ولا تزد الظالمین الا ضلالًا (قول حضرت نوحؑ۔ اور نہ زیادہ کر ظالموں کیلئے مگر عذاب)۔ فلما راوھا قالوا انا لضالون (جب انہوں نے اس (باغ) کو دیکھا۔ تو کہا ہم البتہ بھول گئے ہیں)۔ قال فعلتہا اذًا وانا من الضالین۔ قول حضرت موسےٰؑ (میں نے یہ کام جب کیا کہ میں راستے سے الگ ہوگیا تھا)۔ لا یضل ربی ولا ینسی (میرے خدا سے بھول چوک نہیں ہوتی)۔ یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ویضل اللہ الظالمین

اپنا احسان جتلاتا ہے۔ کہ ہم نے تجھ کو رزق دیا۔ اور غنی کردیا۔ اور غیر کی احتیاج سے کفایت کی +

جواب سوم یہ کہ ضلال سے مراد یہ ہو۔ کہ اللہ تعالٰے نے وقت ہجرت تم کو مکّہ اور مدینہ کے مابین گمراہ پایا۔ پس تم کو راہ مقصود کی طرف ہدایت کی۔ اور دشمنوں سے تم کو سلامت رکھا + یہ تاویل نہایت ہی قریب الفہم تھی۔ اگر یہ سورت مکیّہ نہ ہوتی۔

(بقیہ نوٹ)۔ (قائم رکھتا ہے خدا مومنین کو قول ثابت پر دنیا اور آخرت میں۔ اور ہلاک کرتا ہے گنہگاروں کو)۔ الذین کفروا وصدّوا عن سبیل اللہ اضل اعمالھم (جن لوگوں نے کفر کیا اور خدا کی راہ سے پھر گئے۔ خدا نے اُن کے اعمال کو ضایع کردیا)۔ یضل من یشاء و یھدی من یشاء (جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ اور گمراہی کی سزا دیتا ہے)۔ وقالوا اذا ضللنا فی الارض ائنا لفی خلق جدید۔ قول منکرین قیامت۔ (کیا جب ہم زمین میں مل کر خاک اور نیست و نابود ہو جائینگے۔ تو پھر ہم نئے سرے سے زندہ کئے جائینگے)۔ قالوا این ماکنتم تدعون من دون اللہ قالوا ضلّوا عنا (کہا انھوں نے (ملائکہ) کہاں گئے وہ جن کو تم پکارتے تھے۔ اور خدا کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے تھے۔ تو وہ جواب میں کہینگے۔ وہ آج ہم سے غائب و پوشیدہ ہو گئے) +

یہ چند آیتیں ہم نے بطور نمونہ لکھی ہیں۔ جن میں لفظ ضلالت و ضلال تقریبًا چودہ پندرہ مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ باقی آیات انشاء اللہ اصل کتاب میں عنقریب لکھینگے جس میں ہر ایک آیت کی پوری تفسیر اور اُس کے معنی و مطلب اور ہر ایک معنی کا تفصیلی فرق بھی دکھلایا جائیگا۔ یہ آیات ضلالت کے معنی سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔ ان آیات کو سمجھنے کے بعد ہم امید کرتے ہیں۔ کہ ناظرین ضلالت سے ہر ایک مقام پر گمراہی و بددینی ہی مراد نہ لینگے۔ اب ہم آیۂ ووجدک ضالًّا فھدٰی کے معنی عرض کرتے ہیں۔ میں عرض کرچکا ہوں۔ کہ ہر ایک لفظ کے معنی میں مضاف الیہ و منسوب الیہ کا لحاظ ضروری ہے۔ پس یہ دیکھنا چاہئے۔ کہ آیہ شریفہ میں ضال کس ذات اقدس کی طرف منسوب ہے۔ اُس کی شان کے موافق و حسب قرائن معنی کرنے چاہئیں۔ پس جو معنی ذات قدسی صفات فاتحۂ کتاب التکوین و خاتمۂ کتاب التدوین سید المرسلین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ الطاہرین کے شایاں ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کہ ضلال سے مراد ناشناختگی ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ پیغمبرِ خدا جامع کمالات ظاہریہ و باطنیہ بدر صداقت و آفتاب آسمان نبوت و رسالت

حالانکہ وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے مقدم ہے۔ ہاں اگر قولہ تعالےٰ وجدک کو سیجدک کے معنی میں لیا جائے۔ جیسا کہ اہل عرب ماضی کو مستقبل کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ تو بیشک اس تاویل کی صحت کی صورت ہو سکتی ہے۔

جواب چہارم یہ کہ قولہ تعالےٰ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى سے یہ مراد ہو۔ کہ وَجَدَكَ مضلولاً عنك فی قوم لا یعرفون حقك فهدا نهم الی معرفتك۔

(بقیہ نوٹ) اُس جاہل قوم میں چالیس سال تک باعتبار اپنے کمالات کے پنہاں رہا۔ اور لوگ ان سے ناآشنا ہے۔ پس جب خداوند عالم کی مصلحت حکمت مقتضی ہوئی۔ تو لوگوں کو آنحضرتؐ کی طرف راہ نمائی کی۔ اور اُن کو اُن کے فضائل و کمالات سے آگاہی بخشی۔ اس انعام اکرام عظیم کو اس آیۂ مبارکہ میں اظہار فرماتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ ووجدک ضالاً فھدی۔ یعنی خدا نے تجھ کو تیری قوم میں باعتبار کمالات و فضائل پنہاں پایا۔ پس تیری طرف لوگوں کو راہ نمائی کی۔ معاذ اللہ یہ معنی ہرگز نہیں۔ کہ آنحضرتؐ چالیس سال تک مثل اپنی قوم کے گمراہ و بیدین تھے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ وہ عین دین و حقیقت اسلام ہے۔ اُس کو بیدینی سے کیا تعلق۔ وہ اُس وقت سے دیندار و مسلمان ہے۔ جب کہ دنیا کا کہیں نام نہ تھا۔ فقال عج قل انی امرت ان اکون اول من اسلم۔ و امرت لان اکون اول المسلمین۔ مسلم کا لفظ سب سے پہلے اسی ذات اقدس پر اطلاق ہوا ہے۔ اور جو شخص اول المسلمین ہو۔ وہ کیسے گمراہ اور بیدین ہو سکتا ہے۔

یہی معنی آیۂ شریفہ کے امام علیہ السلام نے بیان کئے ہیں۔ قال الرضا علیہ السلام قال اللہ عزوجل لنبیہ محمدؐ الم یجدک یتیماً فاوی یقول الم یجدک وحیدا فاوی الیک الناس ووجدک ضالاً یعنی عند قومک فھدی ای ھدٰھم الی معرفتک ووجدک عائلاً فاغنیٰ یقول اغناک بان جعل دعائک مستجاباً۔ (ترجمہ)۔ اللہ جل شانہ نے اپنے پیغمبر محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔ کہ کیا خدا نے تجھ کو یتیم نہیں پایا۔ پس پناہ دی یعنی تجھ کو تنہا و یکتا پایا۔ پس لوگوں کو تیری طرف رجوع کیا۔ اور تیرے پاس جگہ دی۔ اور تجھ کو تیری قوم میں پنہاں و ناشناختہ پایا۔ پس اُن کو تیری معرفت کی ہدایت کی۔ اور تجھ کو صاحب عیال و حاجتمند پایا پس تجھ کو غنی کر دیا یعنی تیری دعا کو مستجاب کیا۔ انتہی۔ اس بیان کے بعد کیا کوئی مسلمان ہے۔ جو حضرتؐ کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کرے۔ اور اُن کی عصمت میں کسی قسم کا شبہ کر سکے۔ الا من فی قلوبہم زیغ۔ فافہم وتدبر ولا تکن من الجاھلین۔

ارشد ھم الی فضلات یعنی اے محمدؐ تمہارے پروردگار نے تم کو اس حالت میں پایا۔ کہ قوم میں گمنام ہو۔ کہ وہ قوم تمہارے حق کو نہیں شناخت کرتی۔ اور تمہارے فضائل و مراتب سے ذرا آشنا نہیں ہے۔ پس اللہ تعالےٰ نے اس قوم کو تمہاری معرفت کی طرف ہدایت کی۔ اور تمہارے فضل و مراتب کی طرف ان کو رہنمائی فرمائی ۔ اور اس تاویل کی نظیر بھی استعمال اہل زبان میں موجود ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ فلانٌ ضالٌ فی قومہ و بین اھلہ۔ جب کہ کوئی شخص مضلولا عنہ یعنی اس حالت میں ہو۔ کہ اس کے اہل قوم یا اہل عشیرہ اس کی قدر و منزلت سے ناواقف ہوں۔ اس وقت یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے ۔

جواب پنجم یہ ہے۔ کہ اس آیت کی قرأت میں لفظ یتیم و ضال پر رفع مروی ہے۔ الم تجدک یتیمٌ فاوٰی ووجدک ضالٌ فھدیٰ۔ اس حالت میں یتیم اور ضال فاعل ہونگے۔ اور معترض جو لفظ **ضال** کو حضرتؐ کی طرف منسوب ہونے کے سبب اعتراض کرتا ہے۔ اس حالت میں اس اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ مگر یہ جواب ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ قرأت غیر معروف ہے۔ نیز اس لئے کہ اس صورت میں یہ کلام ناموزون اور بھدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اکثر معانی فاسد ہو جاتے ہیں ۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ آیہ ذیل کے معنی کیا ہیں؟ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ کیا اس آیت کے باب میں یہ مروی نہیں ہے؟ کہ جب جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دیکھا کہ میری قوم نے میری طرف سے روگردانی اختیار کر لی ہے۔ تو ان کی یہ مباعدت اور منافرت آپ پر گراں گزری۔ اور اپنے دل میں یہ تمنا کی۔ کہ کاش اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی ایسا امر نازل ہو جائے۔ جو مجھ میں اور ان میں مقاربت اور میل جول پیدا کرے۔

مؤ یہ روایت جس کی بنا پر آنحضرتؐ پر نہایت ہی جاہلانہ اعتراض کیا ہے۔ بعید از عقل ہے۔ اس روایت کے الفاظ ہی خود بتلاتے ہیں۔ کہ یہ روایت دروغ بیفروغ افترا محض اور کذب صریح ہے۔ اول تو شیطان کو یہ قدرت ہی نہیں۔ کہ جبرًا کسی سے کوئی کام کرا سکے۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ معاذ اللہ حضرتؐ کی زبان اقدس پر بلا اختیار ایسے کفر و شرک کے کلمے جاری کرادے۔ اگر خدا نخواستہ شیطان کو یہ قدرت ہوتی۔ تو وہ کبھی بھی حضرتؐ کی زبان پر کلمہ حق جاری

اور یہ خواہش آپ کے دل میں پختہ ہو گئی۔ الغرض جب اللہ تعالیٰ نے حضرتؐ پر والنجم اذا ھوی نازل فرمائی۔ اور حضرتؐ نے اس سورت کو اپنی قوم کے روبرو تلاوت فرمایا۔ چونکہ کفار کی مقاربت کی خواہش آپ کے دل میں جمی ہوئی تھی۔ اس لئے شیطان نے حضرتؐ کی زبان پر تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترجی (یہ بت بزرگ مرتبہ ہیں۔ اور ان کی شفاعت کی امید ہے) جاری کر دیا جب اہل قریش نے اپنے بتوں کی یہ تعریف

(بقیہ نوٹ) نہ ہوتے ویتا۔ اگر یہ روایت صحیح ہو۔ تو آیہ مبارکہ ان عبادی لیس لک علیہم من سلطان ولاغوینہم اجمعین الا عبادک منہم المخلصین کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خدا کے خاص مخلص بندے انبیاء ہی ہیں۔ اور جب اُن پر بھی شیطان کو ایسی قدرت ہو گئی۔ کہ بلا اختیار اُن کی زبان سے کفر و شرک کے الفاظ جاری کر دیتا ہے۔ تو پھر خدا کے خاص اور مخلص بندے اور کون ہیں۔ جن پر شیطان کو قدرت و سلطنت نہیں۔ نبی تو نبی کسی مومن سے بھی شیطان ایسا نہیں کرا سکتا۔ چہ جائیکہ خاتم النبیینؐ و افضل المرسلینؐ سے۔ العیاذ باللہ۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں ایسے خطورے ڈالتا ہے۔ اور اُن سے ایسا کراتا ہے۔ وہ وہی لوگ ہیں۔ جو شیطان کو دل و جان سے دوست رکھتے ہیں۔ اور خدا کے منکر ہیں۔ جیسا کہ خود خداوند عالم فرماتا ہے۔ ان الشیاطین لیوحون الی اولیائہم بیشک شیاطین وحی کرتے ہیں اپنے دوستوں کو۔ و انما سلطانہ علی الذین یتولونہ اور سوائے اس کے نہیں ہے کہ شیطان کو انہی لوگوں پر قدرت حاصل ہے جو اس کو دوست رکھتے ہیں۔ کیا کوئی مسلمان نبی کی نسبت بھی ایسا خیال کر سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ معترض اور اس حدیث کا ناقل بے دین۔ مشرک۔ منکر خدا و رسولؐ خدا بلکہ دشمن خدا و رسولؐ ہے۔ مسلمان کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ "قوم معترض یہ بیان کرتا ہے۔ کہ جب آنحضرتؐ پر اپنی قوم کی مباعدت و منافرت گراں گزری۔ تو اپنے دل میں یہ تمنا کی کہ کاش اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا امر نازل ہو جائے۔ جو مجھ میں اور ان میں مقاربت اور میل جول پیدا کر دے۔ اور یہ خواہش آپ کے دل میں پختہ ہو گئی" ہم دریافت کرتے ہیں۔ کہ حضرتؐ نے اپنی قوم کے اپنی طرف مائل ہونے اور اُن کی مقاربت کے لئے جس امر کی خواہش کی۔ وہ امر حق تھا۔ (یعنی آپ نے یہ خواہش کی کہ اے خدا کوئی ایسی آیت و نشانی عطا فرما۔ کہ جس کو دیکھ کر یہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اور مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ اور میری اذیت سے باز آئیں) یا امر ناحق اور باطل۔ (کہ معاذ اللہ یہ چاہا ہو کہ مجھ کو کچھ ایسے کفر و شرک کے کلمے تعلیم کر دے۔ جیسے یہ لوگ کہتے ہیں۔ العیاذ باللہ) پہلی صورت میں

حضرتؐ کی زبان سے سنی۔ تو نہایت مسرور ہوئے۔ اور اپنے معبودوں کی پاکیزگی سن کر کمال متعجب ہوئے۔ یہاں تک کہ جب آپ سجدہ پر پہنچے۔ تمام مسلمانوں نے سجدہ کیا۔ اور مشرکوں نے چونکہ اپنے معبودوں کی تعجب انگیز پاکیزگی کا بیان حضرتؐ کی زبانی سن لیا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے ساتھ ہی سجدہ کیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں اور کافروں میں کوئی ایسا نہ رہا۔ جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ سوائے ولید بن مغیرہ کے کہ وہ کبیر السنؑ اور

(بقیہ نوٹ) آپ کی خواہش نہایت ہی محمود ہے۔ اور بیشک وہ حضرت ہمیشہ اپنی قوم کی ہدایت کی دعا کرتے۔ اور یہی چاہتے تھے۔ کہ یہ ایمان لائیں۔ اور عذاب الٰہی سے نجات پائیں۔ اور یہ دعا قابل استجابت تھی۔ اور ضرور خدا حسب مصلحت و حکمت ایسی نشانیاں دکھاتا تھا۔ کہ جن کو دیکھ کر لوگ اسلام لاتے تھے۔ اور حضرتؐ کے فدائی ہو جاتے تھے۔ ایسی مبارک و محمود دعا کا یہ اثر کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کے جواب میں خدا (معاذ اللہ) شیطان لعین کو حضرتؐ پر مسلط فرمائے اور دعا حضرتؐ کو علے العکس قبول فرمائے۔ تعالی اللہ تعالیٰ عن ذلک علواً کبیراً۔ کیا خدا اس پر قادر نہیں تھا۔ کہ ایسے امور ظاہر فرمائے۔ جس سے وہ لوگ ایمان لائیں۔ اور نبیؐ سے محبت اور الفت اسلامی پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ اور مومنین میں پیدا کی۔ والف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً۔ دوسری صورت بالکل باطل ہے۔ پیغمبرؐ برحق ہرگز ایسی خواہش نہیں کر سکتا۔ جو شخص ایسی خواہش کرے۔ وہ مومن بھی نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ نبیؐ۔ نبی کی نسبت ایسا وہی شخص کہہ سکتا ہے۔ جو اُن کی نبوت کا یقیناً منکر ہے۔ پھر یہ راوی بیان کرتا ہے۔ کہ جب شیطان نے یہ الفاظ حضرتؐ کی زبان پر جاری کرائے۔ تو حضرت جبرئیلؑ حاضر خدمت ہوئے۔ اور اس امر کی بابت عتاب الٰہی کا اظہار کیا (لعنۃ اللہ علی الکاذبین)۔ اور یہ سن کر حضرتؐ کو ملال ہوا۔ تو خدا نے یہ آیت نازل کی الخ۔ سبحان اللہ۔ خدا بھی عجیب عادل ہے۔ کہ عتاب حضرت خاتم النبیینؐ پر ہو۔ اور تمام انبیاء پر الزام قائم کیا جائے۔ کہ سب نبی ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ استغفر اللہ۔ خدا کی شان اس سے ارفع و اعلے ہے۔ خدا ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ اور نہ اُس نے ایسا کیا۔ ان ھذا الا اختلاق۔ ثالثاً آیت خود مضمون حدیث کی نفی کرتی ہے۔ کیونکہ آیت کا ظاہر مضمون یہ ہے۔ کہ خدا نبیؐ سے القاء شیطانی کو دھکاتا ہے۔ اور آیات محکمات کو ثابت و قایم کرتا ہے۔ لہذا یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ کہ شیطان جو آنحضرتؐ کو القا کرے۔ اُس کو منسوخ نہ فرمائے۔ اور بخلاف اس کے حضرتؐ پر عتاب فرمائے۔

نہایت ہی پیر ضعیف تھا۔ اور سجدہ نہ کر سکتا تھا۔ سو اس نے ایک مٹھی سنگریزوں کی بھر لی۔ اور اس پر سجدہ کیا۔ بعد ازاں سب لوگ مسجد سے چلے گئے۔ اور قریش اس تعریف کے سننے سے نہایت خوش تھے۔ اور جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلعم کی طرف نازل ہوئے۔ اور اس امر کی بابت عتاب الٰہی کا اظہار کیا۔ حضرتؐ کو یہ سن کر سخت حزن و ملال لاحق ہوا۔ اس وقت اللہ تعالےٰ نے آپکی تسلی خاطر کیلئے یہ آیت

(بقیہ نوٹ) لہٰذا یہ حدیث اس طرح ہر گز صحیح نہیں ہے۔ اور ایسی مہمل روایتوں کی بنا پر خاتم النبیین پر اعتراض کرنا خلاف دینداری ہے۔ اب رہا آیت کا مطلب۔ پس اگر تمنیٰ اور اُمنیۃ کے معنی آرزو لئے جائیں۔ تو ظاہر مطلب آیت کا یہ ہوگا۔ کہ رسول شیطان کے مکائد کا تصور کرتا ہے۔ کہ اس طرح اور اس طریق سے وہ (شیطان) گمراہ کرتا ہے۔ پس یہ خطورات تمام وساوس شیطانی ہیں۔ جو شیطان کے مکائد کے دفع کرنے کے لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب تک انسان اُس کے مکروں اور کیدوں کو نہ جانے۔ کہ کس طرح وہ گمراہ کرتا ہے۔ اور فریب دیتا ہے۔ اُس وقت تک اُس کے مکائد کو دفع بھی نہیں کر سکتا۔ مثلاً جو شخص یہ نہ جانتا ہو کہ کس کس طریقے سے چور چوری کیا کرتے ہیں۔ وہ اپنے مکان کی حفاظت کا پورا بندوبست نہیں کر سکتا۔ اسی طرح پر جب تک نبی کو مکائد شیطان معلوم نہ ہوں۔ اور اُن کا تصور نہ ہو۔ وہ ان مکائد کو دفع نہیں کر سکتا۔ لہٰذا انبیاءؑ کے دل میں وہ تصورات گزرتے ہیں۔ پس خداوند عالم اُن وساوس شیطان کو دفع کرتا ہے۔ اور قوت ملکوتی کو غالب فرماتا ہے۔ اور آیات محکمات کو قلب رسول میں راسخ فرماتا ہے۔ اور دفع مکائد شیطان کی تدابیر تعلیم فرماتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ بُری چیز کا تصور قبیح نہیں۔ بلکہ اُس کا ارتکاب قبیح ہے خصوصاً جبکہ تصور بھی بغرض دفع ہو۔ نہ کہ بقصد ارتکاب۔ ایضاً اگر انبیاء علیہم السلام میں بالکل کسی قسم کی خواہشات نہ ہوں۔ اور نہ کسی قبیح کا تصور کر سکتے ہوں۔ تو وہ مجبور اور مجبول کہلائینگے۔ اور معصوم ہونے میں کسی مدح وثنا اور ثواب کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ بنا بریں اگر اُن کو کبھی خطور شیطانی ہوں۔ تو منافی عصمت و نبوت نہیں۔ کیونکہ کمال مدح یہی ہے۔ کہ سب کچھ خواہشات اُن میں ہوں۔ اور اُن پر قدرت بھی رکھتے ہوں۔ اور پھر قبیح کے مرتکب نہ ہوں۔ اور کبھی کوئی فعل موافق خواہش نفسانی صادر نہ ہو۔ ہر وقت جذبۂ ملکوتی غالب رہے۔ اور روح قدس ہونی تمام قوی اعضاء و جوارح پر حاکم و متصرف رہے۔ کہ کسی وقت میں سبھی حد اعتدال

نازل فرمائی۔ وما ارسلنا من قبلک الخ ٭

جواب - ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس آیت کا ظاہر تمہارے اس بیہودہ اور پرخرافت قصے پر دلالت نہیں کرتا۔ اور اس سے دو امروں میں سے کوئی ایک امر مراد ہو سکتا ہے۔ **یا** تو اس آیت میں تمنیٰ کا لفظ تلاوت کے معنی میں ہے۔ چنانچہ حسان بن ثابت کا قول ہے۔ شعر

تمنیٰ کتاب اللہ اوّل لیلۃ ٭ واٰخرہٗ لاقی حمام المقادر

یا تمنا سے تمنیٰ قلب یعنی دلی خواہش مراد ہے ٭

(بقیہ نوٹ) سے نہ بڑھنے دے۔ کہ کسی شبہ کا ظہور ہو۔ یہی امر عصمت ہے۔ قال عز من قائلہ ادفع بالتی ھی احسن السیئۃ۔ دفع کر سیئہ (بدی۔ برائی) کو اس چیز سے جو احسن ہے۔ پس نبی سیئۃ (بدی۔ برائی) کو اپنے سے دفع کرتا ہے۔ اور حسنہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ نہیں نہیں بلکہ احسن کو بجا لاتا ہے۔ یعنی جو چیز بہت ہی اچھی ہو۔ انھم السابقون الی الخیرات۔ اور یہ اثر ہے روح قدس نبوتی کا۔ کہ اس کی وجہ سے احسن کو بجا لاتا ہے۔ اور سیئہ کو ہمیشہ دفع کرتا ہے۔ کبھی پاس نہیں آنے دیتا۔ یہی آیہ مبارکہ بالتصریح دال ہے۔ کہ پیغمبر ہر ایک گناہ سے معصوم رہتا ہے۔ خواہ وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو۔ اور اسی بنا پر کہ وساوس شیطانی قلب نبی پر خطور کرتے ہیں (خواہ کسی غرض سے ہوں) جو لوگ منافق ہیں۔ اور دل میں رسولؐ کو دشمن رکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ نبی کوئی خدا کا بھیجا ہوا خاص بندہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم جیسا ہی ایک شخص ہے۔ ہم میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ (جیسا کہ آج کل بھی بعض علما سمجھتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض مترجم نے قرآنوں کے حاشیے پر اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے)۔ پس اس خیال سے ان کا نفاق بڑھتا ہے۔ اور زیادہ عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور یہ ان کا امتحان ہے۔ اور جو لوگ صاحب علم ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ وہ خدا کا برحق پیغمبر ہے۔ اور وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان کے دل اس کے لئے نرم ہوتے ہیں۔ اور عاجزی کرتے ہیں۔ چنانچہ سیاق آیہ اس پر دال ہے۔ پڑھو آیت۔ وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ اٰیاتہ واللہ علیم حکیم لیجعل ما یلقی الشیطان فتنۃ للذین فی قلوبھم مرض والقاسیۃ قلوبھم ولیعلم الذین اوتوا العلم انہ الحق من ربک فیومنوا بہ

اگر تلاوت مراد ہو۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ جو پیغمبر تجھ سے پہلے بھیجے گئے۔ اُن میں سے جب کوئی پیغمبر اپنی قوم کے سامنے احکام الٰہی کی تلاوت کرتا تھا۔ تو وہ لوگ اس حکم الٰہی میں تحریف کر دیتے۔ اور اس قول کو کم یا زیادہ کر دیتے تھے۔ جیسا کہ یہودیوں نے اپنے نبی پر افترا کرنے کے باب میں کیا۔ پس امت کا یہ فعل شیطان کی طرف منسوب کیا گیا۔ کیونکہ اس کے وسوسہ ڈالنے اور وسوسہ کا دہی سے ایسا وقوع میں آیا کرتا ہے۔ بعد ازاں بیان فرما دیا۔ کہ اللہ تعالےٰ اپنی حجت ساطعہ و دلیل باہرہ سے اس وسوسہ شیطانی کو زائل اور منسوخ کرتا ہے۔ اور اس شبہ و شک کے مادہ کو قطع کر دیتا ہے۔ اور یہ آیت اللہ کی طرف سے آنحضرتؐ کو تسلی اور تشفی کے طور پر ہے۔ جبکہ مشرکانِ مکہ نے حضرتؐ پر بہتان باندھا۔ اور یہ امر آپ کی طرف منسوب کیا۔ کہ محمدؐ ہمارے بتوں کی مدح کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔

اور اگر لفظ تمنی سے تمناے قلبی مراد لی جائے۔ تو یہ معنی ہونگے۔ کہ جب آنحضرتؐ اپنے دل میں بعض امور کی تمنا کرتے۔ تو شیطان امور باطلہ کے وسوسے ان کے دل میں ڈالتا۔ اور گناہوں کی طرف برانگیختہ کرتا۔ اور ان کو ان کی ترغیب دیتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ اس کے وسوسوں کو منسوخ اور باطل کر دیتا ہے۔ اس طریق سے کہ آنحضرتؐ کو اپنی طرف

(بقیہ نوٹ) فتخبت لہ قلوبہم وان اللہ لہاد الذین اٰمنوا الےٰ صراط مستقیم۔ اور جب تمنے و امنیۃ کے معنی تلاوت لئے جائیں۔ جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے۔ تو مطلب یہ ہے۔ کہ جب نبی کچھ تلاوت کرتا ہے۔ تو شیطان ملعون اُس تلاوت میں کچھ القاء کر دیتا اور اپنی طرف سے کچھ باتیں مشہور کر دیتا ہے۔ اور خدا اُس القاء شیطانی کو نسخ فرما دیتا ہے۔ اور اپنی آیات کو محکم رکھتا ہے۔ تاکہ اس القاء شیطانی کو منافقین و کافرین کی آزمائش کا سبب قرار دے۔ کہ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ نبی ہی کی طرف سے ہے۔ اور جو اہل علم ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ جو کچھ نبی تلاوت کرتا ہے۔ وہ سب پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔ اور وہی برحق ہے۔

بہرحال اس آیت مبارک سے نبوت و عصمت پر کسی قسم کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ اور نہ اس آیت سے پیغمبرؐ پر کسی قسم کا عتاب پایا جاتا ہے بلکہ امتنان ہے کہ [illegible] ہے فافہم فانہ دقیق۔

رہنمائی کرتا ایسے امور کے ساتھ جن میں شیطان کی مخالفت اور نا فرمانی اور اس کی دھوکا دہی کی ناشنوائی منصور ہو +

اب رہیں وہ حدیثیں جو اس باب میں مروی ہیں۔ سو وہ نا قابل التفات ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ امور پائے جاتے ہیں۔ جن سے عقول انسانی پیغمبران علیہم السلام کو منزّہ اور مبترا تجویز کرتی ہیں۔ گو وہ احادیث اصحاب حدیث کے نزدیک مطعون اور ضعیف نہ بھی ہوں۔ اور آنحضرت صلعم کے حق میں وہ شخص کیونکر ایسی بات تجویز کر سکتا ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کے ان اقوال کو سمع قبول سے سنتا ہے۔ کہ خدا فرماتا ہے۔ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (تاکہ ہم اس قرآن کے ساتھ اے محمدؐ تیرے دل کو قائم اور استوار کریں) نیز فرماتا ہے۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ○ (اور اگر وہ یعنی پیغمبرؐ ہم پر بعض جھوٹی باتیں افترا کرتا۔ تو ہم اس کو دائیں سے پکڑتے۔ پھر اس کی رگ گردن قطع کر دیتے)۔ اور فرماتا ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى (قریب ہے۔ کہ ہم قرآن تجھ پر پڑھیں۔ پس تو اس کو فراموش نہ کریگا) حالانکہ جو شخص انبیاء علیہم السلام کے حق میں سہو کو جائز رکھتا ہے۔ اس پر بھی واجب ہے۔ کہ ایسے بیہودہ امور کو ان حضرات کے حق میں تجویز نہ کرے۔ جو کہ اس روایت منکرہ میں مذکور ہیں۔ کیونکہ یہ امور آنحضرت صلعم سے نہایت نفرت دلانے کا باعث ہیں۔ نیز اس وجہ سے کہ اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلعم کو ان امور مکروہ سے بھی جو باب معاصی سے خارج ہیں۔ پاک و پاکیزہ کیا ہے۔ جیسا کہ درشتی اور سخت دلی۔ اور شعر گوئی وغیرہ اخلاق ناقصہ جو کہ غیر خدا دیگر معبودوں کی مدح کرنے سے بہت ہی کم درجہ ہیں +

اور بالفرض محال اگر حضرتؐ نے بتوں کی مدح بھی کی ہو۔ جیسا کہ مروی ہے۔ تو یا تو عمداً کی ہوگی۔ یا سہواً۔ اب ہم کو اس امر کے تردید کرنے کی تو کچھ ضرورت ہی نہیں۔ کہ معاذ اللہ آپ نے عمداً اور قصداً ایسا کیا۔ رہی حالتِ سہو۔ سو یہ بھی قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ حالت سہو میں نا ممکن ہے۔ کہ ایسے الفاظ جن کا وزن سورہ کے وزن اور اس کے طریق کے مطابق اور ان کے معنی کلام ماقبل کے موافق ہوں۔ وقوع میں آئیں۔ اس لئے کہ یہ امر بدیہی ہے کہ اگر سہو کنندہ کوئی قصیدہ پڑھے۔ تو ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ بھول کر ایسی بیت بنا دے۔ جو اسی قصیدے کی ہموزن اور بیت ماقبل کی ہم معنی

اور ہم خیال ہو۔ بایں ہمہ وہ شخص یہ بھی گمان کرے۔ کہ یہ بیت اسی قصیدے کی ہے جس کو وہ پڑھ رہا ہے۔ اور ہمارا یہ بیان اس جھوٹے دعوے کی تکذیب کے لئے جو آنحضرتؐ پر افترا کیا گیا ہے۔ بہت کافی اور نہایت واضح اور ظاہر ہے ٭

مگر تاہم بعض اہل علم کہتے ہیں۔ کہ ممکن ہے۔ کہ آنحضرت صلعم کی نسبت ایسا شک ہونے کی یہ وجہ ہو۔ کہ رسول خدا صلعم نے بھری مجلس میں جس کے حاضرین اکثر مشرکین قریش ہوں۔ اس سورہ کی تلاوت فرمائی ہو۔ اور جب آپ آیۂ افرءیتم اللات والعزیٰ پر پہنچے ہوں۔ اور قریش میں سے جو شخص آپ کے قریب بیٹھا ہو۔ اس نے سمجھ لیا ہو۔ کہ حضرتؐ اس کے بعد ایسی بات کہینگے۔ جو ہم کو رنج دیگی۔ تو اس نے حضرتؐ کے معارضے اور رد کرنے کے طور پر یوں کہا ہو۔ تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتہن لترتجیٰ (یہ معبود بلند رتبہ ہیں۔ اور ان کی شفاعت کرنے کی امید ہے)۔ پس اکثر حاضرین نے یہ گمان کیا ہو کہ یہ آنحضرتؐ ہی کا قول ہے۔ اور مشتبہ ہونے کی وجہ یہ ہو کہ قریش کا دستور تھا۔ کہ جب آنحضرتؐ قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ تو وہ بہت شور و غل مچاتے۔ اور بکواس کرتے۔ بیہودہ بکتے۔ تاکہ حضرتؐ غلطی میں پڑ جائیں۔ اور آپ کی قرأت کسی کو سنائی نہ دے ٭ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ حالت نماز میں ایسا ہوا ہو۔ کیونکہ جب حضرتؐ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھتے تھے۔ تو کفار آپ کے قریب آ جاتے۔ اور آپ کی قرأت سنتے اور بکواس کرتے تھے ٭

بعض یوں بھی کہتے ہیں۔ کہ حضرتؐ کا دستور تھا۔ کہ جب کفار قریش کو قرآن سناتے تھے۔ تو آیات کے فصول پر ٹھہر جاتے۔ اور کلام حجت آمیز ان سے فرمایا کرتے تھے۔ پس جب حضرتؐ نے آیۂ افرءیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ پڑھی ہو۔ تو حسب دستور توقف فرما کر بطور انکار کے تلک الغرانیق العلیٰ منہا الشفاعۃ ترتجیٰ فرمایا ہو۔ اور یہ امر ان کے گمان کے برخلاف ہے ٭ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ حالت نماز میں ایسا ہوا ہو۔ کیونکہ اس وقت نماز میں کلام کرنا جائز تھا۔ اور بعد ازاں منسوخ ہو گیا ٭

اور بعض کا قول ہے۔ کہ غرانیق سے مراد ملائکہ ہے۔ اور بعض احادیث میں ایسا وارد ہوا ہے۔ کہ جب مشرکین نے اس کلام کو سنا۔ تو خیال کیا۔ کہ اس سے

ہمارے معبود مراد ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ دراصل یہ آیت تھی۔ جو وصف ملائکہ میں قرآن میں نازل ہوئی تھی۔ پس حضرتؐ نے اس کو تلاوت فرمایا۔ جب مشرکوں نے گمان کیا۔ کہ اس سے ہمارے معبود مراد ہیں۔ تو اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی۔ اور یہ سب قول اس بیان کے مطابق ہیں۔ جو ہم نے آیۂ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیۡۤ اُمْنِیَّتِہٖ کی تاویل میں ذکر کئے ہیں۔ کیونکہ شیطان کے وسوسہ ڈالنے اور دھوکا دہی سے حضرتؐ کی تلاوت کی طرف وہ باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ جو حضرتؐ کا مقصود نہ تھیں۔ اور یہ سب واضح اور ظاہر ہیں۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالےٰ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیۡۤ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیۡہِ اَمْسِکْ عَلَیۡکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَ تُخْفِیۡ فِیۡ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیۡہِ وَ تَخْشَی النَّاسَ ۚ وَ اللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ کی کیا تاویل ہے؟ کیا اس آیت میں حضرت صلعم پر اس باب میں جناب باری تعالےٰ کی طرف سے عتاب نہیں ہے؟ کہ حضرتؐ نے اس امر کو دل میں پوشیدہ رکھا جس کا اظہار مناسب تھا۔ اور جس امر کا لحاظ کرنا ضروری نہ تھا۔ اس کو آپ نے ملحوظ رکھا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ اس آیت کی وجہ ظاہر اور نہایت مشہور و معروف ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جب اللہ تعالےٰ نے چاہا۔ کہ ایام جاہلیت میں جو (دعی) متبنےٰ یعنی لے پالک بیٹے کی زوجہ کو اپنے اوپر حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس رسم کو منسوخ کرے (اور دعی اس شخص کو کہتے ہیں۔ جس کو قبل از اسلام ایک شخص لیکر پال لیتا اور اس کو اپنا بیٹا بنا لیتا تھا۔ اور اہل جاہلیت میں یہ رسم تھی۔ کہ اپنے لے پالک کی زوجہ سے نکاح کرنا حرام جانتے تھے)۔ پس اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلعم پر وحی بھیجی۔ کہ زید بن حارثہ (جو حضرتؐ کا لے پالک بیٹا تھا) ابھی زوجہ کو طلاق دینے کی غرض سے تمہارے پاس آتا ہے۔ جب زید طلاق دے کر اپنی بیوی سے الگ ہو جائے۔ تو تم اس سے نکاح کر لو۔ تاکہ رسم جاہلیت (جس کا ذکر اوپر گزرا) منسوخ ہو جائے۔ جب زید حاضر خدمت ہوا۔ اور وہ اپنی زوجہ سے جھگڑ رہا تھا۔ اور اس کو طلاق دینے کی دل میں ٹھانے ہوئے تھا۔ تو حضرتؐ کو یہ خوف لاحق ہوا۔ کہ اگر میں اس کو نصیحت کرنے

اور سمجھانے سے باز رہونگا۔ خاص کر اس صورت میں جبکہ آپ اس کے امر اور تدبیر پر متصرف تھے۔ تو جب کہ میں اس کی زوجہ سے نکاح کر لونگا۔ تو منافق لوگ اس باب میں مجھ کو ملزم کرینگے۔ اور وہ تہمت مجھ پر لگائینگے جس سے خدا نے مجھ کو منزّہ اور مبرّا کیا ہے۔ یہ سوچ کر اس سے فرمایا۔ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (اپنی عورت کو اپنے قبضے میں رکھو) تاکہ آپ اس الزام سے محفوظ رہیں۔ اور یہ ارادہ آپ کے دل میں تھا۔ کہ جب زید اس کو طلاق دے دیگا۔ تو میں اس سے نکاح کر لونگا۔ تاکہ حکم الٰہی کی تعمیل ہو جائے۔ اور اس تاویل کی صحت پر آیۂ ذیل شاہد ہے۔ فلمّا قضٰی زید منہا وَطَرًا زوّجنا کہا لکیلا یکونَ علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائہم اذا قضوا منہنّ وَطَرًا وَکَانَ اَمْرُ اللہ مفعولا (جب زید نے اپنی حاجت اس سے (اپنی زوجہ سے) پوری کر لی۔ تو ہم نے اس (مطلقۂ زید) کو تیرے نکاح میں دے دیا۔ تاکہ مومنین کو ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے باب میں تنگی نہ ہو۔ جبکہ وہ اپنی حاجتیں ان سے پوری کر چکیں۔ اور امر خدا ہو چکا تھا) ❊

اس سے معلوم ہوا کہ زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے کے حکم دینے کا باعث یہ تھا۔ کہ سنت جاہلیت منسوخ ہو جائے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ❊

اگر کوئی کہے کہ عتاب تو ہر حال میں باقی رہا۔ اس لئے کہ حضرتؐ کو مناسب تھا۔ کہ اپنی دلی بات کو ظاہر کر دیں۔ اور اللہ تعالےٰ سے خوف کریں۔ اور لوگوں سے نہ ڈریں ❊

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اگر ہم اس سوال کو تسلیم کر لیں۔ تو زیادہ سے زیادہ اس آیت سے یہ مفہوم ہو سکتا ہے۔ کہ حضرتؐ نے ترکِ اَولےٰ کیا۔ اور ترک اولے سے آپ عاصی نہیں ہوئے۔ اور اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے۔ کہ آپ کا منافقین کے الزام دینے اور اپنی باتوں سے آپ کو رسوا کرنے پر صبر کرنا آپ کے لئے نہایت افضل اور اس سے بڑھ کر ثواب کا باعث ہو۔ پس اپنے دلی منشاء کا اظہار اس کے چھپانے سے بہتر نہ ہوگا۔ حالانکہ ظاہر آیت سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوتی۔ جو عتاب پر دلالت کرے۔ اور نہ ترکِ اولےٰ اس سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور یہ جو آیت میں خبر دی گئی ہے۔ کہ حضرتؐ نے اس بات کو چھپایا جس کو اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔

سو اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض خبر ہے۔ رہی آیہ تخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ۔ اس میں خفیف سا شبہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے۔ کہ حضرتؐ آدمیوں سے ڈرتے ہیں۔ اور اللہ سے ڈرنا زیادہ تر سزاوار ہے۔ اور اس میں یہ خبر نہیں دی گئی۔ کہ تم نے احق کو ترک کیا۔ اور ادون کو اختیار کیا۔ اور اگر ظاہر آیہ میں کچھ شبہ ہوتا بھی۔ تو ہم پر واجب تھا۔ کہ دلائل قطعی کے سبب اس کو ترک کر دیں۔ اور اس سے عدول کریں ؞

اور یہ بھی منقول ہے۔ کہ جب زید بن حارثہ نے اپنی بیوی زینب بنت جحش سے جو حضرتؐ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں جھگڑا کیا۔ اور وہ اس کے طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ تو حضرتؐ نے دل میں ارادہ کر لیا تھا۔ کہ اگر زید اس کو طلاق دیدیگا۔ تو میں اس سے نکاح کر لونگا۔ اور آپ چاہتے تھے۔ کہ اس کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ جیسا کہ عام دستور ہے۔ کہ ہم میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے۔ کہ اپنے قرابت داروں کو اپنے شامل حال کر لیں۔ تاکہ ان کو کسی قسم کا صدمہ اور ضرر نہ پہنچنے پائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ اور سب لوگوں کو اس امر سے آگاہ کر دیا۔ کہ حضرتؐ اس کو یعنی زینب کو اپنے نفس کے شامل حال کرنا زیادہ تر پسند کرتے ہیں۔ اور دل میں اس راز کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ تاکہ انبیاء کا ظاہر اور باطن یکساں رہے۔ یہی باعث تھا۔ جو فتح مکہ کے روز حضرتؐ نے انصار سے فرمایا تھا۔ جبکہ عثمان عبداللہ بن ابی سرح کو ساتھ لیکر حاضر خدمت ہوا تھا۔ اور حضرتؐ سے درخواست کی تھی۔ کہ آپ اس سے رضامند ہو جائیں۔ حالانکہ رسول خداؐ نے اس سے پہلے اس کا خون ہدر کر دیا تھا۔ اور اس کے قتل کا حکم دیا تھا۔ جب حضرتؐ نے عثمان کو اس کا سفارشی دیکھا۔ تو آپ کو اس کا سوال رد کرنے میں حیا دامنگیر ہوئی۔ اور اس انتظار میں دیر تک خاموش رہے۔ کہ مومنین میں سے کوئی شخص اس کو قتل کر دے۔ مگر مومنین نے اس انتظار کی وجہ سے کہ دیکھئے رسولؐ خدا اس کے باب میں اب کیا حکم فرماتے ہیں۔ اس کے قتل کی جرأت نہ کی۔ تب حضرتؐ نے انصار سے فرمایا۔ آیا تم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے۔ جو اس کو قتل کرے۔ عباد بن بشر نے عرض کی۔ یا رسول اللہؐ میں برابر حضرتؐ کی طرف دیکھتا رہا۔ کہ اگر آپ مجھے اشارہ فرمائیں۔ تو میں اسے قتل کروں۔ حضرتؐ نے اس سے فرمایا۔ کہ

انبیاء علیہم السلام میں خیانت چشم (اشارۂ چشم) کی عادت نہیں ہوتی۔ اور یہ وجہ معناً وجہ اول کے قریب ہے ✤

اب اگر کوئی کہے۔ کہ اس روایت کی تردید کیا ہے۔ جو وارد ہوا ہے۔ کہ رسول خدا صلعم نے کسی وقت زینب بنت جحش کو دیکھا تھا۔ اور اس کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ جب زید اس کے طلاق دینے کے ارادہ سے حاضر خدمت ہوا۔ تو اس کے بعد اس سے اپنے نکاح کرنے کے ارادے اور اس کے عشق کو دل میں پوشیدہ رکھا۔ آیا شہوت جو بعض وقت عشق سے مبدل ہو جاتی ہے۔ تمہارے نزدیک فعل خدا نہیں ہے۔ اور بندے اس پر قادر نہیں ہیں۔ اور اپنے مذہب کی رُو سے تم اس سوال کے مضمون کا انکار نہیں کر سکتے ✤

ہم اس کا جواب یہ دینگے۔ کہ ہم اس خبیث روایت کے اس مضمون کا اس رُو سے انکار نہیں کرتے۔ کہ شہوت بندوں کے فعل سے متعلق ہے۔ اور وہ بڑی معصیت ہے۔ بلکہ اس جہت سے اس کے منکر ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام کا ان عورتوں سے عشق کرنا جوان پر حلال نہیں ہیں۔ ان سے نفرت دلانے والا اور ان کے رتبہ کو پست کرنے والا ہے۔ اور اس میں کچھ شبہ بھی نہیں ہے۔ اور یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام جن افعال سے بچتے ہیں۔ وہ سب ان کے افعال اختیاریہ ہی ہوں۔ دیکھو۔ اللہ تعالےٰ نے ان کو سخت دلی اور درشتی اور شتاب زدگی سے پاک کیا ہے۔ اور یہ سب ان حضرات کے فعل نہیں ہیں۔ اور ہم اس امر کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ بزرگوار قابل نفرت امراض اور معیوب خلقوں سے بھی محفوظ رہیں جیسا کہ جذام۔ برص کا لاحق ہونا۔ اور صورت کا متفاوت اور غیر متناسب ہونا۔ اور یہ سب باتیں ان کے اختیار اور قدرت میں نہیں ہیں۔ اور نہ ان کا فعل ہیں۔ اور کیونکہ کوئی عاقل اس امر کا قائل نہ ہوگا۔ کہ کسی مرد کا غیر کی زوجہ سے عشق رکھنا اس سے باعث نفرت اور اس کے دیگر عیوب اور نقائص میں شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم کو معلوم ہے۔ کہ اگر کسی امین یا شاہد کی نسبت اس امر کا پتہ لگ جائے۔ تو یہ بات اس کی عدالت کی قادح ہوگی۔ اور اس کے رتبہ کو گھٹا دیگی۔ اور جو بات ہم میں سے کسی شخص کے مرتبے میں اثر کرتی ہے۔ وہ معصومین علیہم السلام کے مراتب و منازل میں جن کو اللہ تعالےٰ نے

مطہر اور معصوم اور اکمل اور افضل بنایا ہے۔ بدرجہ اولےٰ موثر ہوگی ✦ اور یہ بات صاحب فہم و ادراک پر مخفی نہیں ہے ✦

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے کہ قولہ تعالےٰ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۔ لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ کے کیا معنی ہیں؟ آیا اس آیت میں قیدیوں کے زندہ رکھنے اور ان کے قتل کے عوض مال دنیا حاصل کرنے پر عتاب نہیں ہے؟

جواب۔ اس کے جواب میں ہم کہینگے کہ اس آیت کا ظاہر اس امر پر دال نہیں ہے کہ قیدیوں کی بابت آنحضرتؐ پر عتاب کیا گیا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ظاہر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم حضرتؐ کے سوا اور لوگوں کی طرف متوجہ ہے۔ تو نہایت اولےٰ اور مناسب تر ہوگا۔ اس لئے کہ قولہ تعالےٰ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ اور قولہ لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ بے شک رسول خدا صلعم کے سوا اور لوگوں کے حق میں ہیں۔ پس واجب ہوگا کہ اس آیت میں اور لوگوں پر عتاب کیا گیا ہے نہ کہ آنحضرت صلعم پر ✦ اور یہ قصہ معروف و مشہور ہے۔ اور روایت اس باب میں نہایت ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی صلعم کو حکم دیا تھا کہ اپنے صحابہ سے کہیں کہ اپنے دشمنوں کے قتل میں مبالغہ کریں۔ چنانچہ آیہ ذیل اس پر شاہد ہے۔ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ✦

اور حضرت صلعم نے خدا کا یہ فرمان اپنے اصحاب کو پہنچا دیا تھا۔ مگر انہوں نے اس حکم کی مخالفت کی۔ اور معرکہ بدر کے دن جزیہ لینے کی طمع میں مشرکوں کی ایک جماعت کو اسیر کر لیا۔ پس اللہ تعالےٰ نے ان کے اس فعل کو ناپسند کیا۔ اور ظاہر کر دیا کہ جو حکم ہم نے دیا تھا وہ اس کے سوا کچھ اور تھا ✦

اب اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب بقول تمہارے آنحضرت صلعم اس عتاب میں شامل نہیں ہیں۔ تو پھر قولہ تعالےٰ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ کے کیا معنی ہیں؟

سوم ہم اس کا یہ جواب دینگے۔ کہ اس کی وجہ تو نہایت ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اصحاب نے ان مشرکوں کو صرف اسی وجہ سے قید کیا تھا۔ کہ آنحضرت صلعم کے قبضے میں رہینگے۔ پس اس لحاظ سے وہ در اصل آنحضرت صلعم کے قیدی ہوئے۔ اور آپ ہی کی طرف منسوب کئے گئے۔ گو آپ نے ان کے قید کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ بلکہ آپ کا حکم اس کے برخلاف تھا +

اب اگر کوئی یہ کہے۔ کہ جب اصحاب نے مشرکوں کو قید کیا۔ تو کیا حضرت صلعم نے یہ حال مشاہدہ نہیں فرمایا تھا۔ پھر کیوں ان کو منع نہ فرمایا +

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ کچھ ضروری اور لازمی نہیں ہے۔ کہ حضرت صلعم اپنے اصحاب کو انہیں قید کرتے ہوئے دیکھتے ہوں۔ اس لئے کہ حسب روایت آپ روز بدر عریش میں تشریف رکھتے تھے۔ جبکہ اصحاب حضرت صلعم سے فاصلے پر تھے۔ تب انہوں نے مشرکوں کو قید کیا۔ اور آپ کو ان کی اس حرکت سے آگاہی نہ ہوئی +

اب اگر کوئی یہ اعتراض کرے۔ کہ جب وہ قیدی حضرت صلعم کے سامنے آئے۔ تو حضرت صلعم نے ان کے قتل کرنے کا حکم کیوں نہ دیا۔ جبکہ ان کا قتل کرنا معصیت اور موجب عتاب نہ تھا۔ کیا یہ منقول نہیں ہے؟ کہ جب حضرت صلعم نے اپنے اصحاب سے اس باب میں مشورہ لیا۔ تو ابو بکر نے تو ان کے زندہ رکھنے کی صلاح دی۔ اور عمر نے ان کے قتل کا مشورہ دیا۔ مگر حضرت صلعم نے ابوبکر کی رائے کو منظور فرمایا۔ یہانتک کہ روایت میں ہے۔ کہ اسی وجہ سے عتاب الٰہی وارد ہوا +

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے جو ان قیدیوں کو قتل نہ کیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ حالت جنگ میں ان کا قتل کرنا مصلحت ہو۔ اور قتل قید سے بہتر ہو۔ مگر جب وہ قید ہو گئے۔ تو مصلحت بھی متغیر ہو گئی ہو۔ اور اس وقت ان کا زندہ رکھنا ہی اولے اور انسب ہو + اور آنحضرت صلعم نے ابوبکر کی رائے پر عمل نہیں کیا۔ مگر جب اُس کی رائے نزول وحی کے مطابق پائی گئی + اور جبکہ قرآن اس باب میں نہ ظاہراً نہ معناً آنحضرت صلعم سے صدور معصیت پر دلالت نہیں کرتا۔ تو روایات شاذہ اور نادرہ جو اس باب میں وارد ہیں۔ قابل التفات و اعتماد نہیں ہو سکتیں +

نیز ہم نہیں سمجھتے۔ کہ کس وجہ سے اس باب میں آنحضرت صلعم کی طرف معصیت کو
منسوب کیا گیا۔ کیونکہ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ یا تو حضرتؐ پر یہ وحی نازل ہوئی ہوگی۔ کہ اسیروں
کو قتل کردیں۔ یا اس باب میں کوئی وحی آئی ہی نہ ہو۔ اور اس امر کو حضرتؐ کی رائے اور
اصحاب کی صلاح پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ اب اگر وحی نازل ہوئی ہو۔ تو یہ جائز نہیں ہے۔
کہ حضرتؐ نے وحی الٰہی کی مخالفت کی ہو۔ اور نہ کوئی شخص اس امر کا قائل ہی ہے۔ کہ
حضرتؐ نے اسیروں کے باب میں وحی کی مخالفت کی ہے۔ بلکہ صرف یہ دعوے کیا جاتا
ہے۔ کہ حضرتؐ نے اس باب میں مصلحت وصوابدید الٰہی کے برخلاف کیا۔ اور ان مشرکوں
کا قتل کرنا قید کے بعد منصوص علیہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ جبکہ آپ اس باب میں اپنے اصحاب
سے مشورہ کرتے تھے۔ اور مختلف اقوال سنتے تھے۔

اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ جب کہ زندہ رکھنے کا نص حضرتؐ کے پاس موجود
تھا۔ اور حضرتؐ کو قیدیوں کے قتل کرنے اور زندہ رکھنے کے باب میں مشورہ کرنا
جائز تھا۔ تو جب قتل کا نص حضرتؐ کے پاس موجود تھا۔ تو اس وقت مشورہ کرنا کیوں
جائز نہ تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ممکن ہے۔ نص کے وارد ہونے سے پہلے آپ کو
قتل کرنے اور زندہ رکھنے کے باب میں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہو۔ پھر ایک قسم کے
مشورہ کے موافق عمل کرنے کا آپ کو حکم دیا گیا ہو۔ اور آپ نے اس کی متابعت کی ہو۔
اور مخالف کو ایسی بات کہنی ممکن نہیں ہے۔ اور اگر اسیروں کے باب میں کوئی وحی حضرتؐ
پر نازل نہ ہوئی ہو۔ اور اس کام کو آپ کی رائے اور اصحاب کے مشورہ پر چھوڑ دیا ہو۔ تو پھر
آپ پر عتاب ہونا کیا معنی؟ کیونکہ اس حالت میں آپ نے اپنی رائے اور اصحاب کے
مشورہ پر عمل کیا۔ اور جو شخص امر واجب کو بجا لائے۔ اور اس کی حد سے باہر نہ ہو۔ ملامت
کا سزاوار کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس بیان سے واضح ہو گیا۔ کہ جو لوگ معصیت کو حضرتؐ کی
طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ گمراہ اور جادۂ حق وصواب سے منحرف ہیں۔

مسئلہ ۲۲ ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ جب ایک قوم نے جہاد میں جانے سے
عذر کیا۔ اور اپنے گھروں میں رہنے کے لئے حضرتؐ سے اجازت طلب کی۔ اور حضرتؐ نے
ان کو اجازت دیدی۔ تو کیا سبب ہے؟ کہ اللہ تعالےٰ اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے
خطاب کر کے یوں فرماتا ہے۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ

صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِيْنَ (اللہ تعالےٰ نے تجھ کو معاف کر دیا۔ تم نے ان کو اجازت کیوں دی۔ یہاں تک کہ سچے اور جھوٹوں میں تمیز نہ کر لی)۔

کیا معافی گناہ کے لئے نہیں ہوتی؟ اور قول تعالےٰ لِمَ اَذِنْتَ سے آپ کا مورد عتاب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کلمہ عتاب کے لئے زیادہ تر مخصوص ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ قول تعالےٰ عَفَی اللّٰہُ عَنْکَ نہ تو وقوع معصیت پر دلالت کرتا ہے۔ نہ عفو عقاب و عذاب پر۔ اور ممکن ہے۔ کہ اس کلمہ کے ساتھ خطاب کرنے سے یہ مقصود ہو۔ کہ حضرتؐ سے نہایت تعظیم اور ملاطفت سے خطاب کیا جائے۔

مو یہی وجہ وجیہ ہے۔ اور اسی کو اکثر علماء نے اختیار کیا ہے۔ اور ظاہر بھی یہی ہے۔ کہ قول عَفَی اللّٰہُ عَنْکَ بطور دعا ہے۔ اور یہ عادت عرب میں جاری و ساری ہے۔ کہ تعظیماً و تکریماً ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ بولتے ہیں۔ اس آیہ مبارکہ سے کسی طرح ثابت نہیں۔ کہ معاذ اللہ حضرتؐ سے کوئی معصیت وقوع میں آئی۔ اور ظاہر مقصود آیہ یہی ہے۔ کہ خداوند عالم فرماتا ہے۔ کہ جب تک تم پر سچے اور جھوٹوں کا حال نہ کھل جاتا۔ اُس وقت تک اجازت نہ دینا مناسب تھا۔ کہ ان کا نفاق ظاہر ہو جاتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ مقصود یہ ہو۔ کہ تم نے اجازت کیوں دی۔ یعنی کس لیے دی۔ اگر تم اجازت نہ دیتے۔ اور یہ تمہارے ساتھ جہاد کو جاتے۔ تو ان کا نفاق ظاہر ہو جاتا۔ اور سچا و جھوٹا صاف ممیز ہو جاتا۔ کیونکہ یہ لوگ منافق ہیں۔ ضرور جہاد سے بھاگتے اور اُن کی منافقیت سب پر ظاہر ہو جاتی۔ اور بالفعل وقوع میں آ جاتی۔ اس لئے کہ جہاد ہی مومن و منافق کی شناخت کی کسوٹی ہے۔

اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرتؐ منافقین کا حال نہ جانتے تھے۔ بلکہ ممکن ہے کہ حضرتؐ ان کے منافقیت کے حالات سے واقف ہوں۔ اور یہ کلام ایسا ہی ہے۔ جس طرح دوسرے مقام پر خداوند عالم فرماتا ہے۔ ولنبلونکم حتی نعلم المجاھدین منکم والصابرین۔ البتہ ہم تمہارا امتحان کریں گے۔ یہاں تک کہ ہم جان لیں۔ کہ کوئی تم میں سے جہاد کرے۔ اور حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین اس آیۂ شریفہ کا وہی مطلب ہے۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین۔ کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ صرف اس کہنے پر چھوڑ دئے جائیں گے۔ کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور ان کا امتحان نہ کیا جائیگا۔

اس لئے کہ بعض اوقات ہم میں سے بعض اشخاص اپنے مخاطب سے کہتے ہیں۔ ارئیتَ سرحمك الله وغفر الله لك (کیا تو نے دیکھا۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔ اور خدا تیرے گناہ معاف کرے) حالانکہ متکلم کا مقصود ان کلمات سے یہ نہیں ہوتا کہ اس کے لئے اس کے گناہوں کے عذاب کی معافی چاہے۔ بلکہ بعض وقت تو متکلم کے دل میں خیال تک بھی نہیں آتا۔ کہ اس کے ذمے کوئی گناہ ہے۔ بلکہ اس کی غرض یہ ہوتی ہے۔ کہ خطاب میں عمدگی اور خوبصورتی پیدا ہو۔ اور ان کلمات کا استعمال کرے۔ جو مخاطب کی تعظیم اور توقیر کے لئے عام طور پر معروف و مشہور ہیں۔ اور قولہ تعالےٰ لِمَ اَذِنْتَ لَہم ظاہر میں جملۂ استفہامی ہے۔ مگر اس سے تقریر اور حضرتؐ کے اذن کی علت کے ذکر کا استخراج مقصود ہے۔ اور اس آیت کو عتاب پر محمول کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم میں سے بعض وقت ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے۔ لِمَ فَعَلْتَ کَذَا وَکَذَا (تو نے ایسا کیوں کیا) کبھی تو عتاب سے کہتا ہے۔ کبھی استفہام مقصود ہوتا ہے۔ اور کبھی تقریر مطلوب ہوتی ہے۔ پس یہ لفظ عتاب اور انکار کے لئے خاص نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس آیت کا مفہوم اس پر دلالت کر سکتا ہے۔ کہ حضرتؐ سے ترک اولےٰ سرزد ہوا۔ اور پیشتر ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ ترک اولےٰ گناہ میں داخل نہیں ہے۔ اگرچہ اس حالت میں ثواب کم رہ جاتا ہے۔ اور یہ ہو سکتا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام سے بہت سے نوافل ترک ہو جائیں۔ اور بعض وقت ہم میں سے ایک شخص کسی اور سے جبکہ اس نے کسی امر مستحب کو ترک کیا ہو۔ کہتا ہے۔

(بقیہ نوٹ) حالانکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کا امتحان کیا۔ پس اللہ ضرور جان لیگا سچوں اور جھوٹوں کو۔ الیضاً۔ ولیعلمن اللہ الذین اٰمنوا ولیعلمن المنافقین۔

یہ تو ظاہر ہی ہے۔ کہ خدا ہر ایک کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے۔ پھر اس کا اس لئے امتحان لینا۔ کہ جھوٹا ہے صابر کہ جان لے کیا معنی رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ امتحان حصول علم کے واسطے نہیں۔ بلکہ غرض ظہور وقوع ہے کہ جو کچھ خدا جانتا ہے۔ وہ وقوع میں آجائے۔ اور ان لوگوں کی منافقت کا حال روشن ہو جائے۔ اور اور سچے وجھوٹے ممیز ہو جائیں۔ اور حجت خدا تمام ہو۔ بنابریں یہی مطلب آیہ اولےٰ سے بھی لے سکتے ہیں۔ کہ پیغمبرؐ کے حال منافقین جان لینے سے بھی یہی مقصود ہو۔ کہ ان کا حال روشن ہو جائے اور منافقین بظاہر وقوع میں آجائیں۔ فافہم۔

لِمَ ترکت الافضل وَلِمَ عدلت عن الاولے (تونے افضل کام کو کیوں ترک کر دیا)
اس کلام کا منشا یہ نہیں ہے۔کہ تم سے امر منکر اور فعل قبیح سرزد ہوا +

مسئلہ۔اگر کوئی کہے۔کہ آیہ ذیل کے کیا معنی ہیں۔اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ (کیا ہم نے تیرے سینہ کو نہیں کھولا۔اور تیرے بوجھ کو جس نے تیری پیٹھ کو توڑ دیا ہے تجھ سے الگ نہیں کر دیا ہے) آیا اس آیت سے صریح طور پر حضرت کا مرتکب معاصی ہونا ظاہر نہیں ہے؟

جواب۔ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں۔کہ وِزر کے معنی لغت میں دراصل بوجھ کے ہیں اور گناہوں کو اوزار (جمع وزر) اس لئے کہتے ہیں۔کہ ان کا مرتکب ان کے سبب بوجھل ہو جاتا ہے۔جبکہ وزر کے معنی بوجھ کے ہیں۔جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔تو جو چیز انسان کو بوجھل و گرانبار کرے۔اور اس کو غموم و ہموم اور تکلیف اور مشقت میں مبتلا کرے۔اُس کو بھی وزر کہنا جائز ہوگا۔اس لئے کہ وہ وزر سے جو ثقل حقیقی ہے۔مشابہ ہیں۔اور ہو سکتا ہے۔کہ وزر سے اس آیت میں حضرت کا غم و ہم مراد ہو۔جو کہ آنحضرت کو اپنی قوم کے شرک میں مبتلا ہونے سے لاحق ہوا تھا۔اور وہ جناب خود اور آپ کے اصحاب ان کے درمیان نہایت حقیر و ضعیف اور ذلیل و خوار رہتے تھے۔اور طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں جھیلتے تھے۔اور یہ سب باتیں ایسی ہیں۔جن سے انسان کا نفس نہایت تکلیف اور تعب میں گرفتار رہتا ہے۔پس جب اللہ تعالے نے حضرت کا بول بالا کیا۔اور آپ کی دعوت ملکوں میں پھیل گئی۔اور آپ کا اقتدار بڑھ گیا۔اس وقت اللہ تعالے نے آپ کو اس خطاب سے مخاطب کیا۔الم نشرح ..... تاکہ حضرت کو اپنی نعمتوں کے مقامات یاد دلائے۔اور وہ حضرت ان نعمتہائے الٰہی کا شکریہ ادا کریں۔اور حمد و ثنائے الٰہی بجا لائیں۔اور اس تاویل کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے۔وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ۔فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔اور عُسر شدائد اور غموم سے نہایت مشابہ ہے۔اور یُسر سختی کے دور ہونے اور ہموم و غموم کے زائل ہونے سے زیادہ تر مشابہت رکھتا ہے +

اگر کوئی اعتراض کرے۔کہ تمہاری اس تاویل کو یہ بات باطل کرتی ہے۔کہ یہ سورہ

الم نشرح مکیہ ہے۔ جو کہ آنحضرتؐ پر اس وقت نازل ہوا تھا۔ جبکہ آپ اس حال میں تھے جس نے حضرتؐ کو بقول تمہارے ضعف کلمہ اور دشمنان دین کی شدت خوف کے غموم وہموم میں دبا رکھا تھا۔ اور خدا نے مسلمانوں کو مشرکوں پر غلبہ نہ دیا تھا۔ پس اس صورت میں تمہاری یہ تاویل درست نہیں ہو سکتی +

ہم اس سوال کا جواب دو طرح سے دینگے :۔

جواب اوّل یہ کہ جب اللہ تعالےٰ نے آنحضرتؐ کو یہ بشارت دی۔ کہ ہم تیرے دین کو سب دینوں پر غالب کرینگے۔ اور اس اعلائے کلمہ اور غلبہ دین سے تمہارے اور مومنین کے غیظ کو دشمنوں کی طرف سے ساکن کر دینگے۔ اس بشارت سے حضرتؐ کے غم کا بھاری بوجھ جو قوم کی طرف سے آپ کو لاحق ہو رہا تھا۔ دل پر سے اتر گیا تھا۔ اور آپ اپنے نفس کو خوش رکھتے تھے۔ اور اپنی تنگی کو آسانی اور راحت سے مبدل کر دیا تھا۔ اس لئے کہ آپ کو پورا اعتماد تھا۔ کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔ اور اس میں خلاف نہ ہوگا۔ پس اللہ تعالےٰ نے اپنی نعمت سابقہ کے سبب آنحضرتؐ پر احسان جتلایا ہے +

جواب دوم یہ کہ لفظ گو بظاہر ماضی ہے۔ مگر اس سے مراد مستقبل ہے۔ اور اس کی نظیریں قرآن اور استعمال عام میں بہت ہیں۔ چنانچہ آیہ وَنَادٰی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّۃِ اور آیہ وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ وغیرہ نہایت مشہور و معروف ہیں۔ اور بیان کی حاجت نہیں ہے +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ قولہ تعالےٰ لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کے کیا معنی ہیں۔ آیا اس سے صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ آپ کے ذمے بہت سے گناہ تھے۔ اگرچہ وہ معاف کئے گئے +

جو لوگ زبان عربی سے واقف اور اس پر حاوی ہیں۔ وہ بخوبی جانتے ہیں۔ کہ کوئی زبان مثل عربی وسیع و جامع نہیں۔ اس کے الفاظ کا صحیح ترجمہ کرنے کے واسطے الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہاں دو معنوں میں خفیف سا بھی فرق ہوتا ہے۔ عربی میں ان کے واسطے جدا جدا الفاظ موضوع ہیں۔ مگر جو ان کی حقیقت اصلیت سے واقف نہیں۔ وہ ان کو مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ علاوہ عربی کی جامعیت وسعت کے کلام حمید مجید

جواب - ہم اس کے جواب میں کہینگے - کہ جو لوگ آنحضرت صلعم سے گناہانِ صغیرہ وکبیرہ کو نفی کرتے ہیں - ان کے نزدیک اس آیت کے کئی جواب ہیں - جن کو ہم ذکر کرتے ہیں - اور ان میں سے صحیح اور غلط کو جدا جدا کر دیتے ہیں +

اول یہ کہ اس آیت میں جو حضرتؐ کی طرف ذنب کو منسوب کیا ہے - اس سے ذنبِ آدم علیہ السّلام مراد ہے - اور یہ اضافتِ ذنب اس وجہ سے بھلی معلوم ہوتی

(بقیہ نوٹ) علیحدہ اسلوب طرز رکھتا ہے - ہر ایک لفظ یہاں حقیقت واقعیہ رکھتا ہے - اگر وہ لفظ بظاہر مترادف بھی معلوم ہوتے ہوں - لیکن وہ بھی اپنی خصوصیات کے ساتھ جدا جدا معنی میں استعمال ہونگے - اس کلام اعجاز النیام میں ہر ایک لفظ اور ہر ایک حرف کسی خاص غرض اور مخصوص معنی کے واسطے استعمال ہوتا ہے - یہ نہیں - کہ مثل کلام عوام کہیں زاید آجائے یا معتدبہ امتیاز معنوی نہ رکھتا ہو - لیکن افسوس ہے - کہ بے بصیرت حضرات اس کے معنی اور ترجمے کرتے وقت ان امور کا لحاظ بالکل نہیں رکھتے - اور عام کلام کی طرح اس کا اُلٹا سیدھا ترجمہ کر ڈالتے ہیں - بطور مثال لے لیجئے - کلام عرب میں بہت الفاظ ہیں - مثلاً ذنب - ذلل - معصیۃ - سیئۃ خطیئۃ - اثم - کبیرۃ - فاحشۃ - جرام وغیرہ - جو قرآن مجید میں اپنے اپنے مواقع پر استعمال ہوتے ہیں - اور ہر ایک کی حقیقت جدا جدا ہے - لیکن افسوس ہے - کہ اردو فارسی میں جب ترجمہ کیا جاتا ہے - تو سب کو گناہ ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے - جس کی وجہ سے سخت غلطی واقع ہوتی ہے اور ان کے معنی میں کوئی فرق ظاہر نہیں رہتا - حالانکہ ہر ایک کا محل جدا اور ہر ایک کی حقیقت علیحدہ ہے - پوری تفصیل تو اصل کتاب میں آئیگی - (انشاء اللہ) یہاں ہم صرف چند آیتیں نقل کرتے ہیں - جو ناظرین کی بصیرت کے لئے کافی ہونگی - (ذنب) اَنّ اللہ یغفر الذنوب جمیعًا - ربّنا اغفر لنا ذنوبنا - فاغفر لنا ذنوبنا - ویغفر لکم ذنوبکم - (جہاں ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے - اُس کے ساتھ غفران بھی ہے بخلاف دیگر الفاظ مذکورہ کے) - (ذلل) فانْ زللتم من بعد ما جاءتکم البیّنات - فازلّھما الشیطان الآیہ - (سیئۃ) ولیست التوبۃ للذین یعملون السیّئات الآیۃ - ویعفو عن السیّئات - نکفّر عنکم سیئاتکم - وکفّر عنّا سیئاتنا - لاکفّرنّ عنکم سیئاتکم - (خطیئۃ) نغفر لکم خطیٰتکم - ومن یکسب خطیئۃ او اثمًا ثم یرم بہ بریئًا فقد احتمل بہتانًا و اثمًا مبینًا - بلیٰ من کسب سیئۃ واحاطت بہ خطیئتہ فاولٰئک اصحاب النار ھم فیہا خالدون - (اثم) ان الذین یکسبون الاثم الآیۃ -

ہے۔ کہ اس جناب صلعم کو حضرت آدمؑ سے اتصال قربی حاصل ہے اور حضرت آدمؑ نے اپنے ذنب کی معافی کے لئے اللہ تعالٰے کو آنحضرتؐ کی قسم دی تھی اور اللہ تعالٰے نے ان کی قسم کو قبول کر لیا۔ یہ تو ذنب متقدم ہے۔ اور ذنب متاخر سے آپ کی امت اور آپ کے بھائی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے شیعوں کا گناہ مراد ہے۔

(بقیہ نوٹ) والذین یجتنبون کبائر الاثم۔ تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ فقد افتریٰ اثما مبینا۔ (کبیرہ) کل صغیر وکبیر مستطر مال ھذا الکتب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا (فاحشۃ) انہ کان فاحشۃ ومقتا وساء سبیلا۔ والتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم فاستشھدوا علیھن اربعۃ منکم۔ ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا۔ (جرم) ولا یرد باسہ عن القوم المجرمین۔ انہ لا یفلح المجرمون۔ کذالک نجزی المجرمین۔ فانظر کیف کان عاقبۃ المجرمین۔ ولا یرد باسنا عن القوم المجرمین۔ ان المجرمین فی عذاب جھنم خالدون۔ فتری المجرمین مشفقین مما فیہ۔ ویوم تقوم الساعۃ یبلس المجرمون۔ انا من المجرمین منتقمون۔

ذنب مشتق ہے ذَنَبْ سے جس کے معنی (دُم) ہیں۔ اور ذنب کے اصل معنی پس افتادگی (پیچھے رہ جانا۔ گھٹے رہنا) ہیں۔ جب انسان دو کام کر سکتا ہو۔ ایک بہت اعلےٰ اور دوسرا اس سے کم درجے کا۔ پس اگر یہ شخص اس کم درجے کے کام کو کرے۔ اور اعلےٰ کو نہ کرے (خواہ کسی مانع دعائق کی وجہ سے خواہ اپنی تقصیر سے) تو یہ فعل اس کے لئے ذنب ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ یہ صرف غفر و غفران کو چاہتا ہے۔ غفر کے معنی چھپانا۔ پوشیدہ کرنا۔ کسی سوراخ۔ گڑھے وغیرہ کو بھر دینا۔ دبرابر کر دینا۔ پس مطلب یہ ہوا۔ کہ خداوند عالم غفار الذنوب وستار العیوب اپنے لطف وکرم سے ان کمیوں کو پورا کر دیتا ہے۔ اور ان نقائص کو برابر کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن شریف میں ذنب کے ساتھ غفران موجود ہے۔ زَلَل لغزش کھانا۔ عَثرۃ ٹھوکر کھانا۔ گر پڑنا۔ یہ معمولی لغزشیں ہیں۔ جو انسان سے سرزد ہوتی ہیں۔ ان پر عقاب وعتاب مرتب نہیں ہوتا۔ ان میں بھی صرف مقیل العثرات کے لطف وکرم کی ضرورت ہے۔ جو ہر وقت انسان کے شامل حال رہتا ہے۔ ہاں اگر وہ نہ سنبھالے۔ اور نہ اٹھائے۔ اور مدد نہ فرمائے۔ تو یہ کبھی نہیں سنبھل سکتا۔ بہر حال ذنب غفران چاہتا ہے۔ اور زلل و عثرۃ اقالہ (سنبھالنا۔ اٹھانا۔ مدد کرنا۔ درگزر کرنا) ان تینوں کے بعد سیئۃ کا درجہ ہے۔ یہ غفر کے علاوہ کفارہ بھی چاہتا ہے۔ اور

اس جواب پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ مجیب نے ایک نبیؐ سے تو ذنب کو نفی کیا۔ اور دوسرے نبی کی طرف منسوب کیا۔ اس صورت میں یہ سوال بدستور باقی رہا۔ ہاں آنحضرتؐ سے ہٹ کر حضرت آدمؑ کی نسبت قائم ہو گیا۔ اور کچھ فرق نہیں +
اگر ہم اس جواب کی تائید کرنا چاہیں۔ تو یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہم ذنب متقدم و متاخر سب کو آپ کی امت مرحومہ کے گناہ قرار دیں۔ تقدم اور تاخر کے ذکر سے زمانہ کا تقدم

(بقیہ نوٹ) بعض اعمال حسنہ و تصدقات و تبرعات۔ سیئات کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ ان الحسنات یذھبن السیئات۔ دیکھو سیئہ کے ساتھ تکفیر ہی اکثر استعمال ہوا ہے۔ نکفر عنکم سیئاتکم وکفر عنا سیئاتنا۔ اگر انسان کبائر سے پرہیز کرتا ہے۔ تو خداوند عالم سیئات کا خود کفارہ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔ ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم الآیہ۔ یعنی اگر تم اُن کبائر سے پرہیز کرو گے۔ جن سے نہی کی گئی ہے۔ تو خدا تمہارے سیئات (برائیوں) کو دور فرمائیگا۔ اور اُن کا کفارہ کر دیگا۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ کبائر کے لئے صرف کفارہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کفارہ و توبہ دونو کی ضرورت ہے۔ خطیئۃ کا بھی کفارہ نہیں۔ اس پر وعدہ جہنم ہے۔ بلا توبہ کے نہیں بچ سکتا۔ جیسا کہ آیہ شریفہ بلیٰ من کسب سیئۃ واحاطت بہ خطیئتہ فاولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون دلالت کرتی ہے۔ اگر خطیئہ احاطہ کرے۔ تو آدمی جہنمی ہو جاتا ہے۔ جب تک توبہ قبول نہ ہو۔ فاحشۃ میں توبہ و کفارہ کافی نہیں۔ بلکہ یہاں ظاہری سزا بھی ضرور دی جائیگی۔ یعنی حد جاری ہوگی۔ جیسے زنا۔ لواط وغیرہ کی۔ وھو التواب الرحیم سب سے آخر درجہ جرم ہے۔ اور اس کا اطلاق اُن لوگوں پر ہوتا ہے۔ جو ہر ایک جہت سے مستحق جہنم ہو چکے۔ اور اُن کا جہنم میں جانا ضروری ہے۔ گویا یہ وہ درجہ ہے۔ جہاں فرد جرم لگا دی جائے۔ اور ضمانت و سفارش قبول نہ ہو۔ چنانچہ آیات شریفہ لا یرد باسنا عن القوم المجرمین (ہمارا عذاب مجرموں سے رد نہ ہوگا) فلا یرد باسہ عن القوم المجرمین (اس کا عذاب قوم مجرم سے رد نہ کیا جائیگا)۔ ان المجرمین فی عذاب جھنم خالدون (بیشک مجرمین عذاب جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہینگے) اس پر دلالت کرتی ہیں +
الغرض یہ تمام الفاظ علیحدہ علیحدہ حقیقت پر دال ہیں۔ ہر ایک سے ایک ہی معنی مراد لینا اور اس کی بنا پر مقدس و مطہر نفوس پر تخطیہ کرنا بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ اور خلاف مسلک عقلاء چہ جائیکہ متدین و متشرع ایسا کرے۔ یہ بطور اجمال لکھا گیا ہے۔ تفصیل انشاءاللہ اپنے محل پر

اور تاخر مراد لیا جائے۔ جیسا کہ کوئی کہنے والا بطور تاکید کے کہتا ہے۔ قَدْ غَفَرْتُ لَكَ مَا قَدَّمْتَ وَمَا اَخَّرْتَ وَصَفَحْتُ عَنِ السَّالِفِ وَالْاٰنِفِ مِنْ ذُنُوْبِكَ (مَیں نے تیرے اگلے اور پچھلے سب قصور بخش دئے۔ اور سابق اور حال کے سب گناہ معاف کر دئے)۔ رہا امت کے گناہوں کو حضرتؐ کی طرف منسوب کرنا سو اس کی وجہ نہایت مشہور اور روزمرہ اہلِ زبان کے استعمال میں ہے۔ چنانچہ بعض وقت کوئی کہنے والا نبی تمیم

(بقیہ نوٹ) آئیگی۔ البتہ ذنب کی تشریح کچھ اور بھی ضروری ہے۔ تاکہ آیہ مبحوث عنہا کا مطلب بخوبی سمجھ میں آجائے +

ذَنْب کے لغوی معنی مذکور ہو چکے ہیں۔ لیکن چونکہ اضافت و نسبت بھی من حیث الوضع ملحوظ ہے جیسا کہ میں سابقًا عرض کر چکا ہوں۔ لہٰذا اس کے معنی میں بھی مضاف الیہ و منسوب الیہ کے حال اور اُس کی شان کو ملحوظ رکھنا ضروری و واجب ہے۔ کہ لفظ کس کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اور کس سے نسبت دیا گیا ہے۔ اور جب ہم عرض کر چکے ہیں۔ کہ اصل لغوی معنی کے اعتبار سے بھی ذَنْب موجب عتاب و عقاب نہیں۔ تو جب ایک نفس قدسی کی طرف منسوب ہو جس کی عصمت ابتدا سے بدلائل عقلیہ و نقلیہ ثابت ہے۔ تو پھر کیونکر وہ صرف لفظ کی نسبت دئے جانے سے مورد عتاب و عقاب ہو سکتا ہے۔ اور کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اُس سے بہت سے گناہ سرزد ہوئے۔ اگرچہ معاف کئے گئے۔ العیاذ باللہ۔ حاشا و کلا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ حقیقت دین و عین کمال سے کوئی گناہ سرزد ہو۔ اور رحمۃ اللعالمین ایسے افعال کا مرتکب ہو۔ جو موجب نقمت و عذاب و عقاب ہوں۔ تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرًا بزرگ و برتر ہے وہ ذات۔ جس نے نازل کیا قرآن اپنے بندے پر۔ تاکہ وہ تمام عالمین پر نذیر ہو۔ ممکن نہیں کہ سید المرسلین و افضل النبیین۔ فاتحہ کتاب التکوین و خاتمہ کتاب التدوین رسول برحق و نبی مطلق مرتکب گناہ ہو۔ جن و انس و ملائکہ و جملہ عوالم پر آپ حجۃ و نذیر ہیں۔ اور ملائکہ کی عصمت بالاتفاق ثابت ہے۔ پس اگر قائل ہوں۔ کہ نعوذ باللہ آنحضرتؐ سے گناہ سرزد ہوا۔ تو تفضیل مفضول بر فاضل لازم آتی ہے۔ اور یہ قطعًا محال ہے۔ تعالی اللہ عن ذلک علوًا کبیرًا۔ آیہ شریفہ آنحضرتؐ کی عصمت مطلقہ پر دال ہے۔ کسی مسلمان کو شبہے کا موقع نہیں ہو سکتا۔ اب رہا حضرتؐ کا ذَنْب۔ کہ وہ کیا تھا۔ جس کا خدا ذکر فرماتا ہے۔ پس مَیں عرض کرتا ہوں۔ کہ ذَنْب کے اصلی معنی کی طرف رجوع کرو۔ یعنی پس افتادگی۔ مَیں سابقًا

یا کسی اور قبیلے کے لوگوں سے جو اس کے سامنے موجود ہوں۔ مخاطب ہو کر کہتا ہے۔
اَنْتُمْ فَعَلْتُمْ کَذَا وَکَذَا وَقَتَلْتُمْ فُلَانًا (تم نے فلاں فلاں حرکتیں کیں۔ اور فلاں شخص کو
قتل کر دیا)۔ حالانکہ حاضرین میں سے کوئی شخص اس معاملہ میں موجود نہ تھا۔ اور ان کو
اس حال کی خبر تک بھی نہیں۔ اور انہوں نے خود ایسا نہیں کیا۔ اور ان حاضرین
سے اس خطا کو منسوب کرنا قومی اور نسبی اتصال کی وجہ سے نہایت درست اور حسن

(بقیہ نوٹ) عرض کر چکا ہوں کہ جب دو کام اچھے جمع ہوں۔ ایک اعلےٰ درجہ کا۔ دوسرا کم درجے
کا۔ پس اگر کوئی شخص وہ کم درجے کا کام کرے۔ اور اُس اعلےٰ کے کرنے سے قاصر رہے۔ تو یہ اس
کا ذنب ہے کہ حصول معالی و تحصیل کمالات کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اور گھاٹا رہا۔ پس آنحضرتؐ
مثلاً ایک وقت نماز پڑھتے ہیں۔ ایک وقت اصحاب کو وعظ سناتے ہیں۔ ایک وقت اصحاب
کے ساتھ کچھ اخلاق کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک وقت راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ اور تلواروں
کی چھاؤں میں نماز ادا کرتے ہیں۔ اور اس طرح بنیاد دین و اساس اسلام قائم کرتے ہیں۔
اور ایک وقت بیت اللہ کو بتوں سے پاک و صاف کر کے نعرہ اللہ اکبر فرماتے ہیں۔ اور آزادی
سے خانہ کعبہ میں ارکان دین ادا فرماتے ہیں۔ وطہر بیتی للطائفین والعاکفین والرکع
السجود کے سچے اور صحیح مصداق بنتے ہیں۔ اور علم اسلام بہ کمال جاہ و حشم مکہ معظمہ میں نصب
کرتے ہیں۔ پس گو یہ تمام کام حسن ہیں۔ اور سب پر مستحق ثواب ہیں۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ اور
تلواروں کی چھاؤں میں نماز پڑھنا اور اساس دین قائم کرنا بمقابلہ اصحاب سے عام اخلاق کی گفتگو
کرنے کے کہیں افضل و اعلےٰ ہے۔ اور ایسے ہی بیت اللہ کو بتوں سے پاک کرنا اور آزادی سے
خانہ کعبہ میں ارکان دین بجا لانا۔ اور اُس میں اساس دین قائم کرنا اور بھی افضل و اعلےٰ ہے۔
پس جس زمانے میں بوجہ مغلوبیت اسلام و غلبہ کفار و مشرکین مکہ معظمہ اس فوز عظیم سے
قاصر رہے ہیں۔ یہ آپ کا ذنب (پس افتادگی) ہے کہ تحصیل معالی عظیمہ میں پیچھے رہے۔ اور چونکہ جنابؐ
ہر وقت و ہر حالت میں اعلےٰ درجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور اس وجہ سے یہ پس افتادگی آپ
پہ گراں تھی۔ پس بعد فتح مکہ۔ وہ موانع و عوائق اٹھ گئے۔ اور علم اسلام جنابؐ نے خانہ کعبہ میں نصب
کر دیا۔ اور وہاں اساس دین کو قائم کر دیا۔ اور وہ دشمن جو ہمیشہ آپ کے لئے تحصیل معالی سے
مانع تھے مغلوب ہوئے۔ تو خداوند عالم نے اس فتح کے انعام و صلہ میں اپنے پیغمبر کی اُن تمام
پس افتادگیوں (ذنوب) کو برابر کر دیا۔ جو آپ سے قبل فتح مکہ اعلاء کلمہ حق و اقامہ دین مبین میں

ہے۔ اور امت اور آنحضرت صلعم کے درمیان جو واسطہ ہے۔ کوئی سبب اور واسطہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ پس مجازی طور پر امت کے گناہوں کو کبھی آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کرنا جائز نہ ہوگا۔

دوم یہ کہ ترک مستحبات کو ذنب سے موسوم کیا گیا ہو۔ اور یہ اس سبب سے پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلعم وہ بزرگوار ہیں۔ جن سے کبھی اوامر الٰہی کی مخالفت سوائے امور مندوبہ و مستحبہ کے ظہور میں نہیں آئی۔ اور آپ کی علو شان وعظمت مرتبہ کی وجہ سے ایسی خلاف ورزی کو ذنب سے نامزد کرنا جائز ہے۔ جس کو اور شخصوں کی حالت میں ذنب نہیں کہا جاتا۔ اس جواب میں جو امر مندوب کے ترک کو ذنب کہا گیا ہے۔ یہ بہت بعید اور نامناسب ہے۔ اور اس کے بُعد اور عدم مناسبت کو یہ بات اور بڑھا دیتی ہے۔ کہ خدا کے قول لِیَغْفِرَ ذَنْبَکَ کے کچھ معنی نہیں بنتے۔ اور نہ معنی غفران میں کوئی وجہ ایسی ہے۔ جو عدول مندوب کے شایاں ہو۔

سوم تیسری صورت اس کے جواب کی یہ ہوسکتی ہے۔ کہ یہ قول خداوندی بطور تعظیم کے واقع ہوا ہے۔ اور پسندیدہ خطاب ہے۔ جیسا کہ ہم نے آیہ عفی اللہ عنک لم اذنت لھم کی تاویل میں بیان کیا ہے۔ مگر یہ جواب کچھ معقولیت اور مقبولیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ عرف میں یہ عادت جاری ہے۔ کہ ایسے تعظیمی کلمات دعائیہ طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے غفر اللہ لک اور لیغفر اللہ لک وغیرہ۔ اور آیت کا

(بقیہ نوٹ) وقوع پذیر ہوتی تھیں۔ اور اُن کا ویسا ہی ثواب عطا کیا۔ جو خانہ کعبہ کو بتوں سے صاف کرکے وہاں اقامۂ دین داواتے ارکان اسلام کا عطا فرمایا۔ اور نیز آئندہ کی بھی کمیوں اور پس افتادگیوں کو فضل وزیادتی سے بدل دیا۔ اور یہ خاص رحمت و فضل خداوند عالم ہے اپنے حبیب پر۔ اور یہ آیت حضرتؐ کی افضلیت پر دال ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ایسی عظیم الشان فتح کا یہی انعام ملنا چاہئے۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

تعجب ہے کہ اس آیت سے جو حضرت کی خاص فضیلت اور لطف خداوندی پر دال ہے۔ حضرتؐ کا (معاذ اللہ) گنہگار ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔ استغفر اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ واقعی خاتم النبیینؐ کی شان میں ایسی گستاخی وہی کرسکتا ہے۔ جو آپ کی شان سے ناواقف ہے۔ اور آپ کی ذات اقدس کی معرفت نہیں رکھتا۔ یا آپ کی نبوت کا منکر ہے۔ مومنین کو ہرگز

لفظ اس کے خلاف ہے یعنی بطور دعا کے نہیں ہے۔ اس لئے کہ فتح کے عوض اور جزا کے مقام میں واقع ہے۔ اور ہم نے اس آیت میں ایک تاویل اختیار کی ہے جو کہ تاویلات مذکورہ کی نسبت ظاہر آیت سے بہت مشابہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قولہ تعالےٰ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ سے مراد الذنوب الیک ہے۔ اس لئے کہ ذنب مصدر ہے۔ اور مصدر کو فاعل اور مفعول دونوں کی طرف مضاف کرنا جائز ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ اعجبنی ضربُ زیدٍ عمرًا اس میں مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کیا گیا۔ اعجبنی ضربُ زیدٍ عمرٌو اس میں مصدر زید کی طرف مضاف ہے۔ جو مفعول ہے۔ اور مغفرت کے معنی بنا بر اس تاویل کے یہ ہیں۔ آنحضرت صلعم کے دشمنوں یعنی مشرکوں کے احکام کا حضرتؐ پر سے زائل اور منسوخ اور فسخ کرنا اور ان ملاعنہ کے گناہوں کا دور ہونا جو اس جناب کی طرف سے تھے۔ (مثلاً کفار کا حضرتؐ کو مکہ سے نکالنا اور مسجد حرام میں سے جانے سے روکنا) اور یہ تاویل ظاہر کلام کے مطابق ہے۔ تاکہ مغفرتِ فتح کی غرض اور اس کی وجہ قرار پائے۔ ورنہ جب مغفرتِ ذنوب مراد لی جائے۔ تو آیہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کے معنی معقول اور مناسب نہ ہو سکینگے کیونکہ مغفرتِ ذنوب کو فتح مکہ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور وہ مقصود اور غرض فتح نہیں ہے۔ اور قولہ تعالےٰ ما تقدم من ذنبك وما تاخر سے کفار کا تمہارے اور تمہاری قوم کے ساتھ زمانہ گذشتہ اور زمانہ آئندہ میں بدسلوکیاں کرنا مراد ہو سکتا ہے۔

اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ سورہ فتح آنحضرت صلعم پر مکہ اور مدینہ کے مابین نازل ہوئی ہے جب کہ آپ حدیبیہ سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ اور بعض مفسروں کا قول ہے۔ کہ فتح سے مراد فتح خیبر ہے۔ کیونکہ وہ نزول سورہ کے بعد فوراً ہی وقوع میں آئی ہے۔

(بقیہ نوٹ) ایسے توہمات کی طرف نہ جانا چاہیئے۔ تمام ایرادات و اعتراضات اسی قسم کے ہیں۔ اور محض تہمت و افترا ہے۔ اور اس باب میں جس قدر احادیث ہیں۔ وہ ہرگز احادیث نبوی نہیں۔ بلکہ کل موضوع و مجعول ہیں۔ خیال رکھنا چاہیئے۔ اشارہ کافی ہے۔ بطور نمونہ بغرض ازدیاد بصیرت لکھا گیا۔ اسی سے اور اعتراضات پر قیاس کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ فتدبر واللہ عالم بالصواب والیہ المرجع والمآب

وهذا ما الهمنی ربی حررہ احقر الداریں محمد سبطین صانہ اللہ عن الشین والمین

اور بعض کہتے ہیں۔ کہ انا فتحنا لك فتحا مبینا سے مراد اِنّا قَضَیْنَا لَكَ فِی الحدیبیہ قضاءً حَسَنًا (ہم نے تمہارے لئے حدیبیہ میں بہت اچھا فیصلہ کر دیا ہے)۔ پھر تم ایسی بات کیونکر کہہ سکتے ہو۔ جس کا کوئی مفسر بھی قائل نہیں ہے۔ یعنی کہ فتح سے اس آیت میں فتح مکہ مراد ہے۔ حالانکہ یہ سورہ فتح مکہ سے بہت عرصہ پہلے نازل ہوا ہے +

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ سورہ گو اسی وقت نازل ہوا ہے۔ جس کے تمام مفسرین قائل ہیں۔ یعنی قبل فتح مکہ۔ لیکن ناممکن نہیں ہے۔ کہ آیۂ انا فتحنا .... میں فتح سے فتح مکہ مراد ہو۔ اور اس سورہ میں فتح مکہ کی بشارت اور یہ حکم ہو۔ کہ تم عنقریب مکہ میں داخل ہوگے۔ اور اللہ تعالٰے تم کو وہاں کے باشندوں پر مظفر و منصور فرمائیگا۔ اور اس کی نظائر قرآن اور کلام الٰہی میں بہت ہیں + اور اس قول کی کہ یہ سورہ فتح مکہ کے باب میں نازل ہوا ہے۔ اس آیت سے تائید ہوتی ہے۔ کہ خدا سورۂ فتح میں فرماتا ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُؤُسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا۔ پس فَتْحًا قَرِیْبًا سے مراد فتح خیبر ہے +

لیکن لفظ کو قضائے حدیبیہ پر محمول کرنا ظاہر قرآن اور مفہوم آیہ کے برخلاف ہے۔ اس لئے کہ فتح علی الاطلاق سے ظفر اور نصرت ظاہر ہوتی ہے۔ اور ہمارے اس قول کی تائید آیۂ وینصرك الله نصرًا عزیزًا سے ہوتی ہے +

اگر کوئی یہ کہے۔ کہ عرفاً مصدر کو مفعول کی طرف اسی وقت مضاف کیا جاتا ہے۔ جب کہ مصدر متعدی بنفسہ ہو۔ مثلاً اعجبنی ضربُ زیدٍ عمرواً اور غیر متعدی مصدر کا مضاف کرنا غیر معروف اور خلاف عرف ہے +

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ قائل کا یہ قول زبان اور اہل زبان پر تحکم اور سینہ زوری کرنا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے تمام کتب عربیہ میں مطلقاً یہ بیان کیا ہے۔ کہ مصدر فاعل اور مفعول دونو کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ اور متعدی اور غیر متعدی میں فرق نہیں کیا۔ اور اگر ان میں کچھ تمیز ہوتی۔ تو ضرور بیان کرتے۔ اور فرق ظاہر کردیتے۔ جیساکہ اور مقامات میں کیا گیا ہے۔ اور قلتِ استعمال اس باب میں معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ کلام کے لئے جب کوئی قاعدہ عربیت میں ہو۔ تو وہ اس کے موافق استعمال کیا جائیگا۔ گو قلیل الاستعمال ہو۔ اور اس تاویل میں ذنبهم الیہ سے صدّهم لہ عن

المسجد الحرام ومنعهم ایّاہ عن دخولہ یعنی مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنا اور منع کرنا مراد لی گئی ہے۔ پس ذنب کے معنی متعدی ہیں۔ اور جب کہ مصدر کے معنی متعدی ہوں۔ تو جائز ہے۔ کہ اس کے لفظ کو معنی متعدی کا قائمقام کیا جائے۔ کیونکہ اہل عرب کی عادت ہے۔ کہ کلام کو کبھی اس کے معنی پر محمول کرتے ہیں۔ اور کبھی اس کے لفظ پر۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ شعر

جِئْتُمْ بِمِثْلِ بَنِی بَدْرٍ لِقَوْمِهِمْ * اَوْ مِثْلَ اُخْوَةِ مَنْظُوْرِ ابْنِ سَيَّارٍ

اس شعر میں کلام معنی پر محمول کیا گیا ہے۔ نہ کہ لفظ پر۔ اگر لفظ پر محمول ہوتا۔ تو مثل بالجر کہتا۔ لیکن چونکہ معنی احضر قومًا مثلھم ہیں۔ اس لئے اَوْ مِثْلَ بالفتح پڑھنا مناسب اور پسندیدہ ہے۔ اور شاعر کا قول ہے۔ شعر

دَرَسَتْ وَغَيَّرَ اٰيَهُنَّ مَعَ الْبِلٰى * اِلَّا رَوَاكِدَ جَمْرُهُنَّ هَبَاءٌ
وَمُشَجَّجٌ اَمَّا سَوَاءُ قَذَالِهٖ * فَبَدَا وَغَيَّبَ سَارَهُ الْمَعْزَاءُ

اس میں مشجج کو معنی کا لحاظ کر کے مرفوع لایا ہے۔ نہیں تو وہ رَوَاکِدَ پر عطف ہے۔ اگر لفظ کی رعایت ہوتی۔ تو مثل معطوف (رَوَاكِدَ) مشجج بھی جو معطوف علیہ ہے منصوب ہوتا۔ اس کی نظائر کلام عرب میں بیشمار ہیں۔ مگر یہاں اسی قدر کافی ہے۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا آیہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلعم پر عتاب نہیں ہے؟ کہ جب ابن مکتوم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ نے اس سے اعراض کیا۔ اور دوسروں کی طرف مخاطب ہو گئے۔ اس آیت سے کم از کم صغیرہ کا سرزد ہونا تو ضرور ثابت ہوتا ہے۔

جواب۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ اس آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت نہیں کرتا۔ کہ وہ آیت آنحضرتؐ کی طرف متوجہ ہے۔ اور نہ اس میں کوئی ایسا لفظ موجود ہے۔ جس سے معلوم ہو۔ کہ وہ آنحضرت صلعم کی طرف خطاب ہے۔ بلکہ وہ محض ایک خبر ہے۔ جس میں مخبر عنہ کی تصریح نہیں کی گئی۔ مگر ہاں ذرا تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں آنحضرت صلعم کے سوا کوئی اور شخص مراد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس کو عبوس (ترش رو) کہا ہے۔ اور عبوست (ترش روئی) سے موصوف کیا ہے۔ اور حضرتؐ کا

عبوست اور ترش رُوئی کی صفت سے موصوف ہونا قرآن اور حدیث میں کہیں اعدائے دین کے مقابلہ میں بھی مذکور نہیں ہے۔ مومنین کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بعدازاں اس آیت میں اس شخص کا یہ وصف بیان کیا ہے۔ کہ وہ اغنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور فقرا و مساکین سے بے پروائی اور غفلت کرتا ہے۔ سو ایسی صفات کو ایسا شخص تو کبھی آنحضرت صلعم کی طرف منسوب نہیں کرسکتا۔ جس کو اس جناب صلعم کی معرفت حاصل ہے۔ یہ باتیں آنحضرت صلعم کے اخلاق واسعہ اور اپنی قوم پر لطف و مہربانی کرنے سے ذرا بھی مشابہ نہیں ہیں۔ اور کیونکر اس جناب صلعم کے حق میں پروردگار عالم یہ فرما سکتا تھا۔ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى۔ حالانکہ وہ جناب صلعم محض دعوت اور تنبیہ کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اور یہ بات کیونکر آنحضرت صلعم کے حق میں ضرر رساں نہیں ہے؟ حالانکہ یہ قول اس بات پر آمادہ کرتا ہے۔ کہ اپنی قوم کے ایمان لانے کی نسبت حرص کو ترک کرنا چاہیئے۔

کہتے ہیں۔ کہ یہ سورہ آنحضرت صلعم کے ایک صحابی کی شان میں نازل ہوا ہے۔ جس سے یہ افعال مندرجہ سورۂ مذکور سرزد ہوئے تھے۔ اگر ہم کو اس شخص کے تعین کرنے میں شک ہو جس کی بابت یہ سورہ نازل ہوا ہے۔ تو بلا سے ہو۔ مگر اس بات میں شک کرنا مناسب نہیں ہے۔ کہ اس سے آنحضرت صلعم مراد نہیں ہیں۔ یعنی یہ یقین کر لینا ضروری ہے۔ کہ یہ سورہ آنحضرت صلعم کی شان مبارک میں نازل نہیں ہوا۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ پیغمبر کا مومنین کے روبرو ترش رو ہونا اور ان سے غفلت اور لاپروائی کرنا اور اغنیائے کفار کی طرف رخ کرنا اور ان سے متوجہ ہونا کس قدر باعث تنفیر ہے۔ کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی وجہ تنفیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس جناب علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام کو ان اسباب تنفیر سے بھی جو درجہ میں اس سے بدرجہا کم ہیں۔ مبرّا و منزّہ فرما دیا ہے۔ چہ جائے کہ یہ۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ آیۂ ذیل کے کیا معنی ہیں؟ جس میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلعم کی طرف مخاطب ہو کر فرماتا ہے۔ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (اگر تو شرک کریگا۔ تو تیرے عمل ضرور حبط ہو جائینگے۔ اور تو ضرور خسارہ اٹھائیگا)۔ اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعم اس شخص سے جس سے شرک اور معاصی کا ہونا ذرہ بھر بھی جائز نہیں ہے۔ ان الفاظ سے خطاب کرے۔

جواب - ہم اس کے جواب میں کہینگے - کہ اس آیہ میں گو خطاب آنحضرت صلعم سے ہے - مگر مراد اس خطاب سے آپ کی امت ہے - ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے - کہ قرآن اِیّاكِ اَعْنِیْ وَاسْمَعِیْ یَا جَارَۃُ کے ساتھ نازل ہوا ہے - (یہ ایک ضرب المثل ہے - جو ایسے مقام پر بولی جاتی ہے - کہ جہاں کلام میں ظاہری خطاب تو اور شخص کی طرف ہو - اور مراد دوسرا شخص ہو - اس ضرب المثل کے لفظی معنی یہ ہیں - اے میری پڑوسن - سُن میں تجھ ہی سے کہتی ہُوں - مترجم) - اور اس کی مثال آیۂ یا ایّہا النبیّ اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدّتہنّ (اے پیغمبر جب تم (بصیغۂ جمع) اپنی عورتوں کو طلاق دو - پس ان کو ان کی عدّت کے وقت میں طلاق دو - خلاصۃ المنہج) ہے - پس قول فطلقوھن اس امر پر دلالت کرتا ہے - کہ یہاں خطاب آنحضرتؐ کے سوا اور لوگوں سے ہے *

جواب دیگر - دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے - کہ یہ خبر ہے - جس میں عذابِ الٰہی کا وعدہ دیا گیا ہے - اور یہ ممکن ہے - کہ اللہ تعالےٰ عام طور پر وعدۂ عذاب نازل فرماتا ہے - اور خاص طور پر بھی جن کی بابت اس کو معلوم ہے - کہ ان سے وہ امور سرزد نہ ہونگے - جو باعث عذاب ہوں - مگر یہ ضروری ہے - کہ ان امور کا سرزد ہونا صحیح طور پر نہ کہ شکیہ طور پر ان سے جائز اور ان کے مقدور اور طاقت میں ہو - اسی وجہ سے قرآن میں تمام وعدہ ہائے عذاب عام ہیں - ان اشخاص کے لئے بھی جن سے وہ امور سرزد ہونگے - جو باعث عذاب ہیں - اور ان اشخاص کے لئے بھی جن کی نسبت اس کے علم میں گزر چکا ہے - کہ ان سے امور قابل عذاب سرزد نہ ہونگے - اور قولہ تعالےٰ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ تقدیر اور شرط میں قولہ تعالےٰ لَوْ کَانَ فِیْہِمَا اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا سے بڑھ کر نہیں ہے - اس لئے کہ جب اللہ تعالےٰ کے ساتھ وجود ثانی کی موجودگی کا محال ہونا اس کی تقدیر اور اس کے حکم کے بیان کا مانع نہیں ہے - تو شرک جو بشر کے مقدور اور امکان میں ہے - اس کے وقوع کی تقدیر اور اس کے حکم کے بیان کا درست ہونا بدرجہ اولےٰ صحیح اور درست ہوگا - اور فرقہ شیعہ کا جواب اس آیت کی نسبت سب سے علیحدہ اور انہی سے خاص ہے - اور وہ یہ ہے - کہ جب جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ابتدائے نبوت میں جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السّلام کی امامت پر نص کیا - تو قریش کی ایک جماعت حاضر خدمت

ہوئی۔ اور عرض کی۔ یا رسول اللہ۔ لوگ ابھی تازہ تازہ مسلمان ہوئے ہیں۔ اور وہ اس بات پر رضامند نہیں ہیں۔ کہ تم پیغمبر ہو۔ اور تمہارے چچا کا بیٹا امام ہو۔ اگر آپ امامت کو کسی اور کے حوالے فرمائیں۔ تو نہایت مناسب ہے۔ حضرتؐ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ کہ میں نے یہ کام اپنی رائے اور اختیار سے نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ نے مجھ کو اس پر مامور فرمایا تھا۔ اور ایسا کرنا مجھ پر فرض کیا گیا تھا۔ انہوں نے عرض کی۔ کہ جب آپ اپنے پروردگار کے خلاف ورزی کے خوف سے ایسا نہیں کرتے۔ تو قریش میں سے ایک شخص کو خلافت میں اس کا شریک کر دیجئے۔ جس سے لوگ مطمئن ہوں۔ تاکہ آپ کا یہ معاملہ کامل ہو جائے۔ اور لوگ آپ کی خلاف ورزی نہ کریں۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ لئن اشرکت . . . . . اور اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اے ہمارے پیغمبر۔ اگر تم نے خلافت میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا۔ تو تمہارے اعمال باطل ہو جائینگے۔

مگر اس تاویل کے موافق بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالےٰ کو معلوم تھا۔ کہ آنحضرتؐ ایسا نہیں کرینگے۔ اور معصوم ہونے کی وجہ سے میرے حکم کی مخالفت نہ کرینگے۔ پھر وعدۂ عذاب کی کیا وجہ ہے؟ پس ہماری تاویل مذکورۂ بالا کی طرف رجوع کرنا لازم اور ضروری ہوا۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اللہ تعالےٰ آنحضرت صلعم سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے۔ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ کیا اس خطاب کا ظاہر مشتمل بہ عتاب نہیں ہے۔ اور عتاب گناہ کبیرہ یا صغیرہ کے صادر ہوئے بغیر ہو نہیں سکتا۔

جواب۔ ظاہر آیت میں کوئی بات ایسی موجود نہیں ہے۔ جو مشتمل بہ عقاب و عتاب ہو۔ اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ ایسی بات پر عتاب کرے۔ جو داخل گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ مرد کا اپنی کسی بیوی کو کسی سبب سے یا بلا سبب اپنے نفس پر حرام کرنا قبیح اور داخل گناہ نہیں ہے۔ اور اکثر کے نزدیک مباح ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ آیہ لم تحرم ما احل اللہ . . . حضرتؐ کی دردمندی کے اظہار کے طور پر نازل ہوئی ہو۔ اس لئے کہ حضرتؐ نے اپنی ازواج کی خوشنودی کے لئے نہایت مشقت اور تکلیف

سہی تھی۔ اور آپ کا یہ فعل قبیح نہ تھا۔ اگر کوئی شخص ہم میں سے اپنی ایک بیوی کی خوشنودی کے لئے دوسری بیوی کو طلاق دیدے۔ یا اس کو اپنے نفس پر حرام کرلے۔ تو اس کی نسبت یہ کہنا موزوں اور پسندیدہ ہوگا۔ لِمَ فَعَلْتَ ذٰلِکَ وَتَحَمَّلْتَ الْمَشَقَّۃَ فِیْہِ (تونے یہ کیوں کیا۔ اور کیوں تکلیف سہی)۔ گو اس نے کوئی قبیح فعل نہیں کیا۔ اور جب ہم اس بات کو تسلیم کرلیں۔ کہ اس قول کا ظاہر مشتمل برعتاب ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے۔ کہ تحریم کا ترک کرنا اس کو عمل میں لانے سے بہتر ہے۔ پس گویا اس شخص نے تحریم کو عمل میں لاکر ترک اولیٰ کیا۔ اور جو شخص سنتی امر سے عدول کرے۔ اس کو یہی کہنا مناسب ہے۔ کہ تم نے یہ کام (امر سنتی) کیوں نہ کیا۔ اور اس کو ترک کیوں کردیا۔ اور جب کسی ظاہر کلام میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ تو کبھی دلیل کے ذریعہ اس سے عدول کیا جاسکتا ہے۔ اگر آیت مذکورہ کا ظاہر مشتمل برعتاب ہوتا۔ تو ہم دلیل کے ذریعہ ثابت کرتے۔ کہ آنحضرت صلعم کوئی گناہ نہیں کرتے۔ نیز اس قصہ میں جس کی نسبت یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ کوئی امر ایسا نہیں پایا جاتا جس کے مفہوم کو کسی حالت میں گناہ سے تعلق ہو۔

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کیا وجہ ہے؟ کہ روایت مشہورہ میں مروی ہے۔ کہ جب شب معراج آنحضرت صلعم کو فرض نماز جتلائی گئی۔ تو حضرت ص نے اس باب میں کئی بار جناب احدیت میں اوقات نماز کی کمی کی بابت ردوبدل کی۔ یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔ نیز روایت میں ہے۔ کہ موسےٰ علیہ السلام نے حضرت ص کو جتلایا تھا۔ کہ آپکی امت اتنی نمازوں کی متحمل نہ ہوسکیگی۔ پس حضرت صلعم سے ایسی فروگذاشت کیوں ہوئی۔ جو حضرت موسےٰ نے آپ کو متنبہ کیا۔ اور آپ کو جب کہ یہ معلوم تھا۔ کہ عبادت مصلحت الٰہی کے تابع ہے۔ تو پھر آپ نے اس باب میں ردوبدل کیوں فرمائی۔ اور آپ کا یہ فعل کیونکر جائز تھا؟ اور آپ کی یہ درخواست کیونکر قبول ہوئی؟ حالانکہ مصلحت الٰہی اس کے خلاف تھی۔

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ یہ روایت بطریق احاد وارد ہوئی ہے۔ اور ایسی روایت مفید علم نہیں ہوا کرتی (یعنی یقین کا فائدہ نہیں دیتی)۔ اور باوجود اس کے اس روایت کی تضعیف بھی کی گئی ہے۔ اور اگر صحیح بھی ہو۔ تو یہ ہوسکتا ہے۔ کہ مصلحت الٰہی پہلے پچاس نمازوں کی مقتضی ہو۔ اور جب ردوبدل وقوع میں آئی۔

تو مصلحت بھی بدل گئی۔ اور اس سے کمتر کی مقتضی ہوئی۔ یہاں تک کہ اس عدد معینہ پر پہنچی + اور آنحضرتؐ کو یہ امر معلوم کرا دیا گیا ہو۔ اس لئے آپ نے درگاہ باری تعالےٰ میں پھر مراجعت کی۔ اور درخواست کی۔ کہ آپ کی امت پر عبادت میں تخفیف اور سہولت کی جائے + اور ہمارے اس بیان کی (کہ مراجعت سے مصلحت الٰہی میں تبدیلی ہو گئی) نظیر یہ ہوسکتی ہے۔ کہ امر مستحبی کا بجالانا واجب نہیں ہے۔ لیکن جب کوئی شخص کسی امر مستحبی کے بجالانے کی نذر مان لے۔ تو اس وقت اس کا بجالانا واجب اور تمام واجبی عبادتوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فروختنی شے کا مشتری کے حوالے کرنا واجب نہیں ہے۔ اور نہ عبادات میں شامل ہے۔ مگر جب عقد بیع قایم ہو جائے۔ پھر اس کا مشتری کے حوالے کرنا واجب ہو جائیگا۔ اور یہی مصلحت ہو گی + اور ایسی نظیریں شریعت میں بیشمار ہیں + اور حضرت موسےٰؑ نے جو آنحضرتؐ سے عرض کی۔ کہ آپ کی امت اس قدر نمازوں کی متحمل نہ ہو سکیگی۔ جائیے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ سو اُن کا یہ قول تنبیہ کے طور پر نہیں ہے + اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ حضرت صلعم نے خود ایسی درخواست کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ گو حضرت موسےٰؑ نے ان سے نہ کہا ہو۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ آنحضرتؐ کی اس مراجعت میں جو ان کے لئے مباح کی گئی تھی۔ جو اسباب و مقتضیات تھے۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے کہنے سے انکو قوت ہو گئی ہو + اور بعض لوگ اس امر کو اس وجہ سے دور از قیاس خیال کرتے ہیں۔ کہ یہ روایت اس حالت میں صحیح ہو سکتی تھی۔ کہ موسےٰؑ اس وقت زندہ ہوتے۔ حالانکہ وہ بہت عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے۔ لیکن یہ امر کچھ بعید نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے خبر دی ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام اور اس کے صالح و نیکوکار بندے جنت میں رزق پاتے ہیں۔ اس صورت میں کیونکر ممتنع ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ ہمارے پیغمبرؐ کو حضرت موسےٰؑ سے ملاقی کرے +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا وجہ ہے؟ جو روایت میں ہے۔ کہ جب اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبر صلعم کو حکم دیا تھا۔ کہ قرآن کو حرف واحد (قرأت واحد) پر پڑھیں۔ مگر جبرئیلؑ نے حضرت صلعم کی خدمت میں عرض کی۔ کہ یا رسول اللہؐ زیادتی کی درخواست کرو۔ پس آنحضرتؐ نے اللہ تعالےٰ سے درخواست کی۔ اور اللہ تعالےٰ نے آپ کو سات قرأتوں پر پڑھنے کی

اجازت دی +

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ اس کا جواب بعینہ وہی ہے۔ جو روایت بالا میں فرض صلوٰۃ کے وقت مراجعۃ کرنے کے باب میں ہم نے لکھا ہے۔ اور یہ ناممکن نہیں ہے۔ کہ مراجعہ اور سوال کرنے سے مصلحت میں اختلاف ہو جائے۔ اور اس روایت سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ آپ نے زیادتی حروف کی درخواست صرف اس وجہ سے کی تھی۔ کہ پڑھنے میں سہولت اور آسانی ہو جائے۔ کیونکہ بعض لوگ تو تفخیم کو آسانی سے ادا کر سکتے ہیں۔ اور بعض آسانی سے ادا نہیں کر سکتے۔ بلکہ امالہ ان کے نزدیک سہل ہے۔ اور یہی حال ہمزہ کے ادا کرنے اور اس کے ترک کرنے میں ہے + الغرض اگر یہ روایت صحیح ہو۔ تو مراجعہ محض طلب تخفیف اور رفع مشقت کی وجہ سے کیا گیا ہوگا +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے حضرت عباس رضؓ کے سوال کو ان کے قول **الّا الاذخر** میں قبول کیا۔ اور ان کی استثنا کو جاری فرمایا۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔ کہ تحریم اور تحلیل میں محض مصلحت کی پیروی کی جاتی ہے۔ اور جب کہ استثنا کرنیکا ارادہ نہ تھا۔ تو عباس رضؓ کے کہنے سے کیوں استثنا عمل میں آئی؟

جواب۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ اس سوال کے دو جواب ہیں:۔

جواب اوّل۔ یہ کہ حضرتؐ کا ارادہ تھا۔ کہ اذخر کو مستثنےٰ کریں۔ جس کا ذکر عباس رضؓ نے کیا۔ گو ابھی تک عباس رضؓ نے حضرتؐ سے اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ اور ہم اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک کلام کو شروع کرتے ہیں۔ اور نیت یہ ہوتی ہے۔ کہ فلاں خاص کلام سے اس کو وصل کرینگے۔ مگر حاضرین میں سے کوئی شخص اسی خاص کلام کا اس سے پہلے ہی ذکر کر دیتا ہے۔ اور اس سے گمان کر لیا جاتا ہے۔ کہ اس نے اپنے کلام اول کو اس شخص حاضر کی یاد دلانے کے سبب کلام ثانی سے وصل کر دیا۔ حالانکہ دراصل ایسا نہیں ہوتا +

جواب دوم۔ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے **اذخر** کے باب میں اپنے پیغمبرؐ کو اختیار دیدیا تھا۔ جب عباس رضؓ نے اس کی بابت آپ سے درخواست کی۔ تو حضرتؐ نے ان دو امروں میں سے جن کی بابت آپ کو اختیار دیا گیا۔ ایک امر کو اختیار فرمایا۔ اور یہ دونوں باتیں جو ہم نے لکھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ہونا ممکن ہے +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ تم اس حدیث کی بابت کیا کہتے ہو۔ جس کو محمد بن جریر طبری نے اپنی اسناد کے ساتھ ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ اِنَّ النَّارَ لَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ اِذَا اُلْقِيَ اَهْلُهَا فِيْهَا حَتّٰى يَضَعَ الرَّبُّ قَدَمَهٗ فِيْهَا فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ اَنْجَيْتَنِيْ تَمْتَلِئُ وَيَنْزَوِيْ بَعْضُهَا اِلٰى بَعْضٍ۔ کہ جب دوزخی دوزخ میں ڈال دئے جائینگے۔ تو وہ پکاریگا۔ کہ اور کچھ زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ پروردگار عالم (معاذ اللہ) اپنا قدم اس میں رکھ دیگا۔ تب وہ کہیگا بس بس۔ پس اس وقت وہ پُر ہوجائیگا۔ اور ہر حصہ دوسرے حصہ سے مل جائیگا۔ اور ایسی ہی روایت انس بن مالک سے بھی مروی ہے۔

جواب۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ اس کل حدیث کا مفہوم ایسا ہے۔ جس کو دلائل عقلیہ ذرا تسلیم نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ وہ باطل اور مردود ہے۔ مگر ہاں اگر اس کی تاویل آسانی سے ہوسکے۔ تو وہ صحیح اور اس کے معنی دلائل عقلیہ کے مطابق ہوسکتے ہیں۔ اور دلائل عقلیہ اور آیات محکمات قرآنیہ اور سنت صحیحہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰی صاحب اعضا نہیں ہے۔ اور وہ مخلوقات میں سے کسی چیز کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا۔ اور یہ کل روایت ہمارے ان مسلّمات مذکورہ کی نفی کرتی ہے تو لازم ہؤا۔ کہ یا تو یہ روایت مردود اور مطرود ہے۔ یا اس کی ایسی تاویل ہوسکتی ہے۔ جو دلائل مذکورہ کی مطابقت پر محمول ہوسکے۔ اور حدیث قدم کا ظاہر تشبیہ محض کا مقتضی ہے۔ پھر کیونکر مقبول ہوسکتی ہے۔ اور ایک جماعت کا قول ہے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ ذکر قدم سے وہ قوم مراد ہو۔ جن کو اس نے اس کے لئے تیار کیا ہے۔ اور اللہ تعالٰی نے ان کے اعمال کے سبب مستحق جہنم ہونے کی وجہ سے خبر دی ہے۔ کہ وہ اس میں داخل ہونگے۔

اور دوزخ کے قول هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ کی نسبت بعض کا قول یہ ہے۔ کہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اس کی حالت ایسی ہوگئی ہو۔ کہ اب اس میں اوروں کے لئے جگہ باقی نہ رہے۔ گویا اگر وہ خود بولنے والا ہوتا۔ تو یوں کہتا۔ کہ میں بھر گیا ہوں۔ اور مجھ میں اور زیادہ جگہ باقی نہیں رہی۔ اور بولنا اس کی طرف مجازی طور پر منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ شاعر نے حوض کی طرف قول کو منسوب کیا ہے۔ شعر

امتلاءُ الحوضُ وقال قَطنی ✤ مہلاً و رویداً قد ملأت بطنی

اور ابو علی جبائی کا قول ہے۔ کہ ھل من مزید خازنان دوزخ کا قول ہے جیساکہ کہتے ہیں۔ قالت البلدۃُ الفلانیۃُ کذا (فلاں شہر نے یہ کہا)۔ اور مراد اس سے یہ ہوتی ہے۔ کہ فلاں شہر کے باشندوں نے یہ کہا۔ اور جیساکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (اور تیرے پروردگار کی سطوت و جلالت ظاہر ہو۔ اور فرشتے صف بصف آئیں)۔ اور یہ بھی جائز ہے ✤

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اس حدیث کے کیا معنی ہیں؟ جس میں مروی ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَاءِ الْحَیِّ عَلَیْہِ (زندوں کے میت پر رونے سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے)۔ اور دوسری روایت میں ہے۔ اِنَّ المیّتَ یعذّب فی قبرہٖ بالنیاحۃ علیہ (جب میت پر نوحہ کیا جاتا ہے۔ تو اس کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے)۔ اور مغیرہ بن شعبہ نے آنحضرت صلعم سے روایت کی ہے۔ کہ حضرتؐ نے فرمایا ہے۔ مَنْ نِیحَ علیہ فانّہٗ یعذب بما نیح علیہ (جس مردے پر نوحہ کیا جائے۔ اس کو اس نوحے کے عوض عذاب دیا جاتا ہے) ✤

جواب۔ ہم کہینگے۔ کہ یہ حدیث بظاہر منکر ہے۔ اور قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ اس کا مضمون اللہ تعالےٰ کی طرف ظلم کو منسوب کرتا ہے۔ حالانکہ دلائل عقلیہ جن میں احتمال اور اشتراع اور مجاز کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ذات باری تعالےٰ کو ہر ظلم اور قبیح سے منزّہ و مبرّا ثابت کرتی ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ نے اپنے قول محکم قرآنی کے ساتھ اپنے نفس کا اس سے منزّہ ہونا فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا)۔ پس ضروری ہوا۔ کہ اگر ہم تاویل کر کے اس حدیث کے ظاہر کو جو دلائل عقلیہ کا مخالف ہے۔ ان کے مطابق کر سکیں تو تاویل کریں۔ ورنہ اس کو رد کر دیں۔ اور باطل قرار دیں۔ اور ابن عباس سے اس قدر نہیں مروی ہے۔ کہ ابن عمر سے اس روایت میں سہو ہو گیا ہے۔ بات فقط یہ ہے۔ کہ رسول اللہ صلعم کا ایک یہودی کی قبر پر گزر ہوا۔ جس کے اہل و عیال اس پر رو پیٹ رہے تھے۔ اس وقت آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ انھم لیبکون علیہ و انہ لیعذب یہ لوگ تو اس پر گریہ و زاری کر رہے ہیں۔ اور اس کو عذاب ہو رہا ہے ✤ اور عایشہ بی بی کا اس روایت

سے انکار کرنا بھی مروی ہے۔ کہ وہ کہتی ہیں۔ کہ مجھ کو اس روایت کی خبر نہیں ہے۔ ابوعبدالرحمٰن (یعنی عبداللہ ابن عمرؓ) کو اس روایت میں سہو ہو گیا ہے۔ جیسا کہ جنگ بدر میں اس کو سہو ہو گیا تھا۔ بات صرف یہ ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ اِنَّ اَھْلَ الْبَیْتِ لَیَبْکُوْنَ وَاِنَّہٗ لَیُعَذَّبُ بِجُرْمِہٖ (گھر والے تو اس پر رو رہے ہیں۔ اور وہ اپنے گناہوں کے سبب عذاب میں پڑا ہوا ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث مردود اور مطعون ہے۔ جیسا کہ تم نے دیکھا۔ اور ابن عباسؓ اور عائشہ کے اقوال میں وَھَلَ کے معنی ذَھَبَ وَھْمُہٗ اِلٰی غَیْرِ الصَّوَابِ ہیں۔ یعنی اس کا وہم نا راستی اور خطا کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ چنانچہ بول چال میں آتا ہے۔ وَھَلْتُ اِلَی الشَّیْءِ وَاَنَا وَاھِلٌ وَھْلًا۔ جب کہ تیرا وہم اس کی طرف جائے۔ وَھَلْتُ عَنْہُ اوھل وھلًا۔ جب کہ تو اس بات کو بھول جائے۔ اور اس میں غلطی کر جائے۔ اور وھل الرجل یوھل وھلًا۔ جبکہ کوئی بیقرار اور مضطرب ہو۔ اور وھل فزع کے معنی میں ہے۔

اور جنگ بدر کے ذکر میں اس کے وھل کا مقام یوں مروی ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے چاہ بدر پر توقف کیا۔ اور فرمایا۔ ھَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ رَبُّکُمْ حَقًّا (آیا تم نے اپنے پروردگار کے وعدہ کو سچا پایا)۔ بعد ازاں فرمایا۔ اِنَّھُمْ لَیَسْمَعُوْنَ مَا اَقُوْلُ (وہ میرے قول کو ضرور سنتے ہیں)۔ پس ابن عمر نے آپ کے اس قول کا انکار کیا۔ اور بعض یوں کہتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلعم نے صرف یہ فرمایا تھا۔ اِنَّھُمُ الْاٰنَ لَیَعْلَمُوْنَ اِنَّ الَّذِیْ کُنْتُ اَقُوْلُ لَھُمْ ھُوَ الْحَقُّ (اب یہ لوگ ضرور جانتے ہیں۔ کہ جو کچھ میں نے ان سے کہا تھا۔ وہ حق ہے)۔ اور آیہ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (اے پیغمبر تو مردوں کو نہیں سنا سکتا) کو اپنے قول کی شہادت میں پیش کیا۔ (یعنی ابن عمر نے آیہ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی کو پیش کر کے حضرتؐ کے قول سے انکار کر دیا)۔

اگر یہ روایت صحیح ہو۔ تو اس کی تاویل کئی طرح پر ہو سکتی ہے:-

صورت اول۔ یہ کہ اگر کوئی میت اپنے پس ماندوں کو وصیت کرے۔ کہ میرے مرنے پر نوحہ و زاری کرنا۔ اس صورت میں انہوں نے اس کے حکم سے ایسا کیا۔ اور اس کو نوحہ و زاری کے عوض عذاب دیا جاتا ہے۔ اور یُعَذَّبُ بِھَا کے معنی یہ نہیں ہیں۔ کہ اس سے نوحہ کرنے والوں کے فعل کے عوض مواخذہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے معنی

صرف یہ ہیں۔ کہ اس سے نوحہ وزاری کرنے کے لئے حکم دینے اور اس کے باب میں وصیت کرنے کی بابت مواخذہ ہوتا ہے۔ اور آنحضرت صلعم نے ایسا اس لئے فرمایا۔ کہ زمانۂ جاہلیت میں مُردوں پر رونے اور نوحہ کرنے کو پسند کرتے تھے۔ اور اپنے پس ماندوں کو نہایت تاکید سے نوحہ وزاری کرنے کی وصیت کرتے تھے۔ اور یہ طریقہ ان میں مشہور و معروف تھا۔ چنانچہ طرفہ بن عبد کا قول ہے۔ شعر

فَاِنْ مِتُّ فَانْعِيْنِيْ بِمَا اَنَا اَهْلُہٗ ✤ وَشُقِّي عَلَيَّ الْجَيْبَ يَا بْنَةَ مَعْبَدِ

اور بشر بن ابی حازم کہتا ہے۔ شعر

فمن یک سائلاً عن بیت بشر ✤ فانّ لہٗ لجنب الرّدھم بابًا
ثوی فی ملحدٍ لابدّ منہٗ ✤ کفی بالموت نأیًا واغترابًا
رھین بلًا وکلُّ فتیً سیبلی ✤ فاذری الدّمع وانتحبی انتحابًا

صورت دوم۔ یہ کہ عرب اپنے مُردوں کو روتے تھے۔ اور ان کی لوٹ مار کرنے اور اپنے دشمنوں کو قتل کرنے اور ان کے مال و اسباب کے لوٹنے اور برباد کرنے کو یاد کرکے نوحے کرتے تھے۔ دراصل وہ ان کے گناہوں کو شمار کرتے تھے۔ جن کے عوض میّت کو عذاب ہُوا کرتا ہے۔ گو وہ اپنے نزدیک ان امور کو ان کے مفاخر اور مناقب قرار دیتے تھے۔ بنابریں حضرت صلعم نے فرمایا۔ تبکونہم بما یعذبون بہ۔ تم ان کی وہ باتیں یاد کرکے ان کو روتے ہو۔ جن پر ان کو عذاب دیا جاتا ہے ✤

صورت سوم۔ یہ کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب اللہ تعالے میّت کو اس کے اہل و عیال اور اقربا کے رونے پیٹنے اور نوحہ و بکا کرنے سے واقف کرتا ہے۔ تو وہ اس حال کے معلوم کرنے سے متالم اور رنجیدہ ہوتا ہے۔ اور یہ خبر اس کے لئے عذاب ہو جاتی ہے۔ اور عذاب سے یہاں وہ عذاب مراد نہیں ہے۔ جو گناہ کے عوض ہُوا کرتا ہے۔ بلکہ اکثر جگہ لفظ **عذاب** ضرر اور الم کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ دیکھو جب کوئی شخص کسی دوسرے کو ضرر و الم پہنچائے۔ تو وہ کہتا ہے۔ قد عذبتنی بکذا وکذا اذیتنی (تو نے فلاں امر سے مجھ کو رنج دیا)۔ جیسے کہتا ہے۔ اضررت بی وآلمتنی ✤ مگر لفظ **عقاب** ضرر و آلام مبتدئہ کے مقام میں مستعمل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ **عقاب** معاقبہ سے مشتق ہے۔ جس کے لئے اول کسی سبب کا ہونا ضروری ہے۔ اور **عذاب** میں یہ شرط

ضروری نہیں ہے +

صورت چہارم ۔ یہ کہ میّت سے مراد وہ شخص ہو۔ جو حالت احتضار میں ہے۔ اور اس کی موت قریب ہے ۔ کیونکہ اس کو بھی قریب المرگ ہونے کے سبب مجازاً میّت کہا جاتا ہے۔ اس حالت میں حضرتؐ کی مراد یہ ہوگی۔ کہ جو شخص قریب المرگ ہے۔ اس کے پاس اہل و عیال کے گریہ وزاری کرنے سے اس کو اذیت ہوتی ہے۔ اور اس کے نفس کو ضعف پہنچتا ہے۔ اور یہ اذیت اور صدمہ اس کے حق میں بمنزلہ عذاب کے ہو جاتا ہے۔

اور یہ سب صورتیں واضح اور ظاہر ہیں +

مسئلہ ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اس حدیث کے کیا معنی ہیں؟ جو عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ وہ کہتا ہے۔ کہ میں نے جناب رسالت مآبؐ کو سنا کہ وہ فرماتے تھے۔ انّ قلوب بنی آدم کلّہا بین اصبعین من اصابع الرحمٰن یصرّفہا کیف شاء (کہ تمام بنی آدم کے دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں جس طرح چاہتا ہے۔ ان کو پھیر دیتا ہے)۔ بعد ازاں حضرتؐ نے فرمایا۔ اللّٰہمّ مصرّف القلوب اصرف قلوبنا الیٰ طاعتک (اے دلوں کو پھیرنے والے خدا ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے)۔ اور اس حدیث میں جو انس بن مالک سے مروی ہے۔ اس طرح مذکور ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا۔ ما من قلب آدمی الّا وھو بین اصبعین من اصابع اللہ تعالےٰ فاذا شاء ان یثبتہ ثبّتہ واذا شاء یقلّبہ قلّبہ (ہر ایک آدمی کا قلب اللہ تعالےٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے جب وہ اس کو ثابت رکھنا چاہتا ہے۔ ثابت رکھتا ہے۔ اور جب وہ اس کو پھیرنا چاہتا ہے۔ پھیر دیتا ہے) +

جواب ۔ ہم کہینگے۔ کہ جو شخص ان احادیث کی تاویل کرتا ہے۔ اور ان کو اس وجہ سے کہ وہ دلائل عقلیہ کے منافی ہیں۔ رد نہیں کرتا۔ اس کا قول یہ ہے۔ کہ اصبع (انگلی) گو ایک عضو مخصوص کا نام ہے۔ مگر زبان عرب میں اثر حسن کے معنی میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ لفلانٍ علیٰ مالہٖ وابلہٖ اصبعٌ حسنۃٌ اے قیام و اثر حسن (فلاں شخص کو اپنے مال اور اونٹوں پر پورا پورا اختیار اور خوب قدرت حاصل ہے)۔ چنانچہ عبیداللہ بن حصین راعی جس کی کنیت ابو جندب ہے۔ ایک راعی کی تعریف کرتا ہے جس کو اپنے اونٹوں پر حسن قیام اور خوب قدرت حاصل ہے + شعر

ضعیف العصا بادی العروق ترعالہ ✤ علیہا اذا ما اجدب الناس اصبعًا

اور لبید کا قول ہے۔ شعر

مَن یبسط اللہ علیہ اصبعًا ✤ بالخیر والشرّ بأیّ اُولعًا

یملأ لہ منہ ذنوبًا مُترعًا

ایک اور شاعر کا قول ہے۔ شعر

اکرم نزارًا واسقہ المشعشعا ✤ فانّ فیہ خصلات اربعًا

جدًّا وجودًا ویدًا واصبعًا

الغرض ان سب اشعار میں اصبع سے مراد اثر حسن اور نعمت ہے۔ پس بنا بریں اس حدیث کے معنی یہ ہونگے۔ مَا مِنْ ادمیٍّ الّا وقلبہٗ بینَ نعمتین للہ تعالیٰ جلیلتین (یعنی ہر شخص کا دل اللہ تعالیٰ کی دو نعمتوں کے درمیان ہے) ✤

اگر کوئی کہے۔ کہ نعمتین کے تثنیہ سے کیا مراد ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس کے بندوں پر بے حد و بیشمار ہیں ✤

ہم اس کا جواب یہ دینگے۔ کہ یہاں یہ احتمال ہوسکتا ہے۔ کہ اس حدیث میں دنیا اور آخرت کی نعمتیں مراد ہیں۔ اور ان کو صیغہ تثنیہ سے اس لئے بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ بمنزلہ دو جنسوں یا دو نوعوں کے ہیں۔ گو ان میں سے ہر ایک فی نفسہ نعمہائے کثیرہ رکھتی ہے ✤

اور اہل عرب نے جو اثر حسن کو اصبع (انگلی) سے نامزد کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو۔ کہ اثر حسن پر تعجب دلانے اور اس پر متنبہ کرنے کی غرض سے انگلی ہی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو اصبع سے نامزد کردیا۔ اور یہ ان کی عادت میں داخل ہے۔ کہ چیز کو اس شے سے موسوم کرتے ہیں۔ جس کے پاس وہ چیز واقع ہو۔ اور اس سے اس کو کچھ علاقہ ہو ✤

اور بعض شارحین کا قول ہے۔ کہ مراعی اصبع کی جگہ ید کہنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ ید بمعنی نعمت ہے۔ مگر نہ لاسکا۔ اس لئے مجبورًا ید کی جگہ اصبع لایا۔ کیونکہ وہ بھی ید کا جزو ہے ✤

اور ان احادیث کی تاویل اور طرح بھی ہوسکتی ہے۔ جو تاویل مذکورہ سے زیادہ تر

واضح اور مذہب عرب کے نہایت مشابہ ہے۔ اور ان کے کلام کی غلطیاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ان احادیث میں اصبع کے ذکر کرنے سے یہ غرض ہے۔ کہ دلوں کا پھیرنا اور ان کا قلب کرنا اور ان میں عمل کرنا خدائے عزوجل کے نزدیک نہایت سہل اور آسان ہے۔ اور یہ سب اس کے قبضۂ قدرت کے تحت میں داخل ہیں۔ دیکھو۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ ھذا الشی فی خنصری واصبعی وفی یدی وقبضتی (یہ چیز میری چھنگلیا میں ہے۔ میری انگلی میں ہے۔ میرے ہاتھ میں ہے۔ میرے قبضے میں ہے)۔ یہ سب الفاظ اس وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔ جبکہ اس کام کا ہونا نہایت سہل اور آسان ہو۔ اور اس میں کسی قسم کی تکلیف اور محنت نہ کرنی پڑے۔ اور اسی معنی کے موافق محققین آیۂ ذیل کی تاویل کرتے ہیں۔ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ۔ چونکہ حضرتؐ کا یہ مقصود تھا۔ کہ اللہ تعالے کو دلوں کے پھیرنے اور ان کے قلب کرنے میں کسی قسم کی مشقت نہیں پڑتی۔ اور یہ امر اس کے نزدیک نہایت سہل اور آسان ہے۔ اس لئے فرمایا۔ کہ انہا بین اصابعہ (یعنی دل خدا کی انگلیوں کے درمیان ہیں)۔ اور اس سے مراد یہی معنی ہیں۔ جو اوپر بیان ہوئے۔ اور عبارت بھی طولانی نہ ہوئی۔ اور اختصار سے کام چل گیا۔

اور بعض شارحین حدیث نے یہ تسلیم کرکے کہ یہاں اصابع سے مراد وہی مخلوقات ہیں۔ جو گوشت اور خون سے مرکب ہیں۔ مخالف کے مغلوب کرنے کی غرض سے ایک اور وجہ پیدا کی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ کہ **قلب** کے اوپر دو جسم دو انگلیوں کی شکل کے لگے ہوئے ہیں۔ جن کے ذریعے سے اللہ تعالے اس کو حرکت دیتا ہے۔ اور ان ہی کے ذریعہ سے اس کو پھیرتا ہے۔ اور ان دونوں جسموں کو **اصبعین** کے نام سے ہمشکل ہونے کی وجہ سے نامزد کیا گیا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالے کے سب افعال ملک اور قدرت کے معنی میں اسی کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن ان اصبعین کو خاص طور پر خدا کی طرف اضافت کرنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ خاص ان دونوں میں قوت فعلی کے پیدا کرنے اور حرکت دینے پر اللہ تعالے کے سوا اور کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

اگرچہ یہ تاویل پہلی تاویلات سے کم درجہ ہے۔ مگر جب کہ کلام میں ادنٰے احتمال

سبھی ہو تو ضعیف اور قوی سب کا بیان کرنا ضروری ہے ؛

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اس حدیث کے کیا معنی ہیں؟ جس میں مروی ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر خلق فرمایا) کیا اس حدیث کا ظاہر تشبیہ کا مقتضی نہیں ہے۔ اور یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالےٰ کی بھی صورت ہے؟

جواب۔ ہم جواب میں کہینگے۔ کہ اگر یہ حدیث صحیح ہو۔ تو اس حدیث کی تاویل میں شارحین کا قول یہ ہے۔ کہ صورتہ کی ھا آدمؑ کی طرف راجع ہے۔ نہ کہ اللہ کی طرف۔ اس صورت میں معنی یہ ہونگے۔ ان اللہ تعالےٰ خلقہ علی الصُّوْرَۃِ الَّتِی قُبِضَ عَلَیْہَا یعنی اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو اس صورت پر پیدا کیا جس پر ان کی رُوح قبض ہوئی؛ اور ان کی صورت میں کسی قسم کی زیادتی کمی اور تغیر نہیں ہوا۔ جیسا کہ انسان کے احوال میں تغیر ہو جاتا ہے ؛

اور دوسری وجہ یہ مذکور ہے۔ کہ ھا کی ضمیر اللہ تعالےٰ کی طرف راجع ہے۔ اور معنی یہ ہیں۔ کہ خلقہ علی الصورۃ التی اختارھا واجتباھا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو اس صورت پر پیدا کیا جس کو اس نے پسند اور برگزیدہ کیا تھا۔ کیونکہ بموجب اس تاویل کے چیز کو کبھی اس کے پسند اور برگزیدہ کرنیوالے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ؛

تیسری صورت یہ ہے۔ کہ یہ کلام ایک خاص سبب مشہور کے موافق فرمایا گیا۔ کیونکہ زہری نے حسن بصری سے روایت کی ہے۔ کہ وہ کہا کرتا تھا۔ کہ ایک روز جناب رسالتمآبؐ کا گزر ایک مرد انصاری پر ہوا۔ اس وقت وہ شخص اپنے غلام کے منہ پر مار رہا تھا۔ اور کہتا تھا۔ قبح اللہ وجہک ووجہ من تشبہہ (اللہ تیرے منہ کو بُرا کرے۔ اور اس کے منہ کو جو اس سے مشابہ ہو)۔ یہ سُن کر حضرتؐ نے فرمایا۔ اے شخص تو نے بُری بات کہی فان اللہ خلق ادم علی صورتہ۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو اس مضروب کی صورت پر پیدا کیا ہے ؛

اور چوتھی صورت یہ ہو سکتی ہے۔ کہ اس قول سے یہ مراد ہو کہ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ وَخَلَقَ صُوْرَتَہٗ (اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کو اور اس کی صورت دونو کو پیدا کیا ہے)۔ تاکہ اس قول سے شک رفع ہو جائے۔ اور کوئی شبہ نہ کرے۔ کہ آدمؑ کا مرکب کرنا کسی اور کا کام

ہے۔ اس لئے کہ جوڑنا اور تالیف کرنا **مقدورات بشری** سے ہے۔ اور جواہر اور اعراض کی اجناس مخصوصہ جو جواہر کے مشابہ ہیں۔ ان سب پر قدرت پانے میں وہ قدیم سبحانہ وتعالےٰ سب سے منفرد ہے۔ پس ممکن ہے کہ نظر اس امر کو قبول کرے۔ کہ جواہر تو خدا کا فعل ہیں۔ اور ان کا جوڑنا اور مرکب کرنا اس کے سوا کسی اور کا کام ہے۔ دیکھو ہم کو اس بات کے معلوم کرنے کے لئے کہ تالیف وترکیب آسمان فعل خداوند متعال ہے۔ دلیل سمعی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ عقلیات میں اس کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اور جب اس مقام میں پہنچتے ہیں۔ جس سے اس امر پر استدلال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ حق سبحانہ تعالےٰ ایسا عالم ہے۔ کہ اس سے فعل محکم ظاہر ہوا ہے۔ تو ہم کو اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کہ انسان کو ترکیب دینا اسی حق تعالےٰ کا کام ہے۔ انسان کی ابتدائے خلقت کی بابت کلام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا ترکیب دینے والا اس حق سبحانہ کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ جب آدم علیہ السلام مخلوقات میں پہلا زندہ وجود ہیں۔ گویا اس حدیث میں آنحضرتؐ نے اس فائدہ جلیلہ کی خبر دی ہے۔ کہ جواہر آدم علیہ السلام کا خلق کرنا اور ان کا مرکب کرنا محض خداوند متعال ہی کا فعل ہے۔ اور کسی کو اس میں دخل نہیں ہے +

اور پانچویں صورت یہ ہوسکتی ہے۔ کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنی قدرت کاملہ سے خود بخود پہلے ہی اس شکل وصورت موجودہ پر پیدا کیا تھا۔ نہ تو اس میں کسی کی نقل کی۔ اور نہ درجہ بدرجہ ترقی کرکے یہ صورت اختیار کی جیسا کہ آدمیوں کا دستور ہے۔ کہ اوروں کی نقل کرتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہیں اور اس حدیث کی تاویل میں مذکورہ بالا صورتوں میں سے ہر ایک صورت درست ہوسکتی ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ وَرَسُوْلُہٗ +

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اس حدیث کے معنی کیا ہیں؟ جو آنحضرت صلعم سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا ہے۔ تَرَوْنَ رَبَّکُمْ کَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ لَا تُضَامُّوْنَ فِیْ رُؤْیَتِہٖ (تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے۔ جس طرح چودھویں رات کو چاند کو دیکھتے ہو۔ کہ اس کے دیکھنے میں تم کو کچھ دقت نہیں ہوگی)۔ یہ حدیث نہایت مشہور ہے۔ اس کو ضعیف اور شاذ کہنا ممکن نہیں ہے +

جواب ۔ ہم اس کے جواب میں کہینگے ۔ کہ اس حدیث کا ظاہر مطعون اور اس کا راوی مقدوح اور مجروح ہے ۔ اس لئے کہ اس کا راوی قیس ابن ابوحازم ہے ۔ کہ آخری عمر میں اس کا دماغ مختل ہوگیا تھا ۔ مگر باوجود اس کے روایت اخبار برابر جاری رہی ۔ اور یہ قدح بے شک وشبہ نہایت سخت ہے ۔ کیونکہ اس کی مرویہ احادیث کی تاریخیں تو معلوم ہو ہی نہیں سکتیں ۔ جس سے معلوم ہو جاتا ۔ کہ یہ روایت دیوانہ ہونے سے پہلے کی ہے ۔ یا پیچھے کی ۔ صورت موجودہ میں اطمینان ہونا مشکل بلکہ محال ہے ۔ اور جو راوی اس کا مجروح و مقدوح ہو ۔ اور اس کے مرویات کی تاریخ معلوم نہ ہو ۔ اس کی روایات کے مقبول یا مردود ہونے کے باب میں اس طریق کو اصل اور معتبر قرار دینا مناسب ہے ۔ اور قیس مذکور میں اگر یہ جرح نہ بھی ہوتی ۔ تو وہ اور طرح سے بھی مطعون ہو سکتا ہے ۔ اور وہ یہ ہے ۔ کہ وہ امیرالمومنین علیہ السلام سے منحرف ہونے اور آپ سے دشمنی رکھنے اور ناصبی ہونے میں مشہور ہے ۔ اور یہ وہی شخص ہے ۔ جس نے کہا ہے ۔ کہ میں نے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو دیکھا ۔ کہ کوفہ کے منبر پر فرماتے تھے ۔ اے بقیۂ احزاب میری طرف نکلو ۔ پس اس جناب کا بغض آج کے دن تک میرے قلب میں ہے ۔ اس کے سوا اور بہت سے موقعوں پر اس نے آپ کے نصب و عداوت کا اظہار کیا ہے ۔ اور یہ امر بےشک وشبہ اس کی عدالت کی قدح کرتا ہے ۔ اور غیر عادل کی روایت قابل قبول نہیں ہے ۔ باایں ہمہ اگر یہ روایت صحیح ہو ۔ تو اس کو وجہ صحیح پر محمول بھی کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ رویت کبھی علم کے معنی میں آتی ہے ۔ اور اس پر لغت شاہد ہے ۔ اور آیات ذیل اس امر پر دال ہیں ۔ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ اور اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحَابِ الْفِیْلِ اور اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاہُ مِنْ نُّطْفَۃٍ ۔ اور شاعر کا قول ہے ۔ شعر

رایت اللّٰہ اذ سمّیٰ نزارًا ✤ وَاسکنہم بمکّۃَ قاطنینَ

پس اس صورت میں اس حدیث کے معنی یہ ہو سکتے ہیں ۔ اِنَّکُمْ تَعْلَمُوْنَ رَبَّکُمْ ضَرُوْرَۃً کَمَا تَعْلَمُوْنَ الْقَمَرَ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ مِنْ غَیْرِ مَشَقَّۃٍ وَّلَا کَدِّ نَظَرٍ یعنی تم اپنے پروردگار کو اس طرح بدیہی طور پر جان لوگے ۔ جس طرح چودھویں رات کو بلا دقت و زحمت نظر چاند کو جان لیتے ہو ✤

اور کوئی شخص یہ اعتراض نہیں کر سکتا ۔ کہ رویت جب علم کے معنی میں آتا ہے ۔

تو متعدی بدو مفعول ہوتا ہے۔ اور اہل زبان کے مذہب کے موافق اس حالت میں ایک مفعول پر اقتصار کرنا جائز نہیں ہے۔ اور رویت جب دیکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ تو متعدی بیک مفعول ہوتا ہے۔ پس واجب ہوا۔ کہ جب خبر مذکور میں مفعول ثانی مفقود ہے۔ تو یہاں رویت بالبصر مقصود ہے۔ اس لئے کہ ہم اعتراض کی تردید میں ہم کہینگے۔ کہ اہل لغت کے نزدیک علم دو قسم پر منقسم ہے۔ (۱) علم یقین و معرفت۔ (۲) ظن و حسبان + اور جو علم بمعنی الیقین ہوتا ہے۔ اس کا مفعول ایک سے زیادہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ عَلِمْتُ زَیْدًا یعنی عرفتہ وتیقنتہ (میں نے زید کو پہچانا اور یقینی طور پر اس کو جان لیا)۔ اس صورت میں دوسرا مفعول نہیں لایا جاتا۔ اور جب علم بمعنی ظن وحُسبان ہو۔ تو دوسرے مفعول کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض یوں بھی کہتے ہیں۔ کہ ممکن ہے۔ کہ دوسرا مفعول اس حدیث میں محذوف ہو۔ کہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔ گو اس کی تصریح نہیں کی گئی +

اب اگر کوئی یہ کہے۔ کہ تمہاری اس تاویل کے موافق لازم آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ضروریہ کے حاصل کرنے میں اہل جہنم اور اہل جنت دونو مساوی ہوں۔ کیونکہ تمہارے نزدیک تمام اہل آخرت کے معارف اضطراری ہیں۔ اور جبکہ یہ بات ثابت ہے۔ کہ یہ حدیث مومنین کے لئے بشارت ہے۔ نہ کہ کافرین کے لئے۔ تو تمہاری تاویل باطل ہو گئی +

تو ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ یہ بشارت بیشک مومنین کے لئے مخصوص ہے۔ کیونکہ یہ حدیث جزوی اذیت کے رفع ہونے کے سبب سے ان لوگوں کے لئے بشارت شمار ہوتی ہے۔ جن کی تمام نعمتیں خالص اور صاف ہیں۔ اور ایسی باتیں ان لوگوں کے لئے بشارت نہیں سمجھی جاتیں۔ جو نہایت رنج اور تکلیف و عذاب میں مبتلا ہوں۔ اس لئے کہ اہل جنت کا بدیہی طور پر خدا کو جان لینا ان کی نعمات اور سرور کو زیادہ کر دیگا۔ کیونکہ اس سے وہ لوگ جان لینگے۔ کہ اللہ تعالےٰ جو نعمتیں ہمارے لئے مقرر فرماتا ہے۔ ان سے ہماری تعظیم اور تبجیل مقصود ہے۔ اور وہ ان نعمات کو ہمیشہ قائم رکھیگا۔ اور کبھی منقطع نہ کریگا + اور جب اہل دوزخ کو اللہ تعالےٰ کا علم بدیہی حاصل ہوگا۔ تو وہ جانینگے۔ کہ اس کا قصد یہ ہے۔ کہ ہماری ذلت اور استخفاف کرے۔

اور ہمارے عذاب اور سختی کو ہمیشہ قائم رکھے۔ پس دونوں علم بشارت کے باب میں مختلف ہیں۔ گو ضروری ہونے میں متحد اور متفق ہیں *

مسئلہ۔ اگر کوئی کہے۔ کہ اس حدیث کے کیا معنی ہیں؟ جو ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ جناب رسول خدا صلعم نے فرمایا ہے۔ انّ احبّ الاعمال الی اللّٰہ تعالیٰ اَدْوَمُھَا وَاِنْ قَلَّ فَعَلَیْکُمْ مِنَ الْاَعْمَالِ بِمَا تُطِیْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا (اللہ کے نزدیک پسندیدہ تر اعمال وہ ہیں۔ جو دائمی ہوں۔ گو کم ہوں۔ پس تم پر حتےّ المقدور ایسے اعمال کرنے ضروری ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ ملول نہیں ہوتا۔ جب تک کہ تم ملول نہ ہو) *

جواب۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ اس کے جواب کی کئی صورتیں ہیں۔ کہ ہر صورت اس کلام کو مورد شک سے خارج کر دیتی ہے :۔

صورت اوّل۔ کہ ان اللہ لا یمل سے حضرتؐ کی مراد یہ ہے۔ انہ لا یمل ابداً (کہ کبھی ملول نہیں ہوتا)۔ پس اللہ تعالےٰ ملال کو ایسے امر سے متعلق کیا ہے۔ جس کا صدور کبھی نہ ہوگا۔ جیساکہ اللہ تعالےٰ آیۂ ذیل میں فرماتا ہے۔ ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط۔ اور جیساکہ شاعر کہتا ہے۔ **شعر**

فانک سوف تحکمُ او تباھی * اذا ما شبت او شاب الغراب

اس شعر میں شاعر کی مراد یہ ہے۔ کہ لا تحکم ابداً (تو کبھی حکم نہ کریگا) *

اگر کوئی کہے۔ کہ یہ تم نے کہاں سے نکال لیا کہ آنحضرتؐ نے جس چیز سے ملال اللہ تعالےٰ کو معلق کیا ہے۔ وہ کبھی وقوع پذیر نہ ہوگی۔ جس سے تم نے یہ حکم لگا دیا۔ کہ آپ کی مراد ہمیشہ کے لئے نفی ملل ہے *

ہم اس کے جواب میں کہینگے۔ کہ یہ ظاہر ہے۔ کہ ملال بشر کو اس کے تمام امور اور حاجات میں عارض نہیں ہوتا۔ جیساکہ وہ حرص۔ رغبت۔ آرزو اور طمع سے کبھی عاری نہیں ہوتے۔ اس لئے جو چیز اللہ تعالےٰ کے علم میں ہے۔ کہ ان کو ملول اور تنگ نہ کریگی۔ اس سے اس ملال کو معلق کرنا جائز ہے *

صورت دوم۔ یہ کہ معنی یہ ہوں۔ کہ اللہ تعالےٰ تم پر غضب ناک نہیں ہوتا۔ جو تم کو اپنے فضل و احسان سے دور کر دے جب تک کہ تم اس کے لئے عمل کو ترک نہ کرو۔ اور اس سے سوال کرنے اور اپنی حاجات میں اس کی بخشش کی طرف رغبت کرنے سے

اعراض نہ کرو۔ پس دونوں فعلوں کو ملل سے نامزد کیا۔ حالانکہ دراصل ایسا نہیں ہے۔ اور یہ تسمیہ اہل عرب کے نزدیک جائز ہے۔ کہ جب ایک شے کے معنی دوسری شے سے بعض وجہوں سے موافق ہوں۔ تو وہ اس شے کو دوسری شے کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ عدی بن زید عبادی کا قول ہے۔ شعر

ثم اضحوا لعب الدهر بهم ✣ وكذاك الدهر يودي بالرجال

لعب کو دہر کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور عبید بن ابرص اسدی کہتا ہے۔ شعر

ساتل بنا حجر بن امّ قطام ✣ اذ ظلت به السمر الذوابل تلعب

اس شعر میں لعب کو نیزوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور ذو الرمہ کا قول ہے۔ شعر

وابيض موشي القميص نصبته ✣ على خصر مقلاة (ناقہ) سفيه جديلها (زمام)

اس شعر میں شاعر نے زمام ناقہ کے اضطراب کو سفہ سے موسوم کیا۔ کیونکہ سفہ دراصل طیش اور سرعت اضطراب وحرکت کو کہتے ہیں۔ اور مقصود ذکاء اور نشاط کے ساتھ ناقہ کو موصوف کرنا ہے ✣

صورت سوم۔ یہ کہ معنی یہ ہوں۔ کہ اللہ تعالےٰ اپنی خیر و بخشش کو تم سے منقطع نہ کریگا جب تک کہ تم اس کے سوال سے ملول نہ ہو جاؤ۔ پس بندوں کے فعل کے لئے ملل حقیقی معنی میں ہے۔ اور فعل خدا کے لئے ملل حقیقی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ صرف شراکت اور مشاکلت کے لئے ہے ✣ گو معنی مختلف ہیں۔ جیساکہ آیۂ فمن اعتدىٰ عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدىٰ عليكم (جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر ویسی ہی زیادتی کرو) میں ہے۔ اور آیۂ جزاءُ سيئةٍ سيئةٌ مثلها (برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے) میں ہے ✣

اور شاعر کا قول ہے۔ شعر

الا لا يجهلن احدٌ علينا ✣ فنجهل فوق جهل الجاهلينا

اس میں شاعر کا مقصود یہ ہے۔ کہ ہم جہل کی مجازات اور پاداش بخوبی دے سکتے ہیں۔ کیونکہ عقلمند آدمی جہل پر فخر نہیں کر سکتا۔ اور اس سے اپنی مدح کا اظہار نہیں کرتا ✣

ارباب علم و دانش و ناظرین رسالہ ہذا پر مخفی نہ ہے۔ کہ اس قسم کی اخبار

جو آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف منسوب ہیں۔ بیشمار ہیں جن کا ظاہر اللہ تعالےٰ کا اپنی مخلوقات سے مشابہ ہونا اور اس کے حکم میں زیادتی اور تجوّز اور اصول عقلیہ کا بطلان ثابت کرتا ہے۔ گو وہ ایسی مشہور نہیں جیسی یہ حدیثیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔ اگر ہم ان سب کو بیان کریں۔ تو کتاب بہت بڑھ جائیگی۔ اور ہماری غرض فوت ہو جائیگی۔ اس لئے کہ ہم نے دیباچہ میں یہ شرط کی تھی۔ کہ ہم صرف اُن آیات قرآنیہ اور اخبار معلومہ یا احادیث مشہورہ پر جو شہرت میں بمنزلہ احادیث معلومہ کے ہونگی۔ بحث کرینگے۔ اور ان کی تاویل کرینگے۔ کہ جن کے حوالے سے انبیاء علیہم السلام کی طرف صدور معاصی کو منسوب کیا جاتا ہے۔ اب جو کچھ ہم نے اس وقت تک بیان کیا۔ ناظرین کے لئے نہایت کافی ووافی ہے۔ اس لئے اسی پر اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ ومن اللہ نستمدّ حسن المعونۃ والتوفیق۔

خاتمہ

(از مترجم)

خداوند ذوالجلال وایزد متعال کا ہزار ہزار شکر ہے۔ کہ بطفیل حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین افضل الاولین والآخرین رحمۃ للعالمین خلاصۂ موجودات ونخبۂ مکونات والممکنات باعث ایجاد عالم وآدم جناب محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم و بتوسل حضرات ائمۂ ہدےٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کتاب مستطاب مسمّی بہ تنزیہ الانبیاء مصنفۂ افضل العلماء اکمل الفقہاء جناب سید مرتضےٰ علم الہدےٰ رحمہ اللہ کا اردو ترجمہ مسمّی بہ تحفۃ الاتقیاء اس حقیر پرتقصیر ننگ خلائق کے قلم شکستہ رقم سے اختتام کو پہنچا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ یہ کام اس بے بضاعت کی قابلیت سے بدرجہا برتر اور بڑھ کر تھا۔ مگر بفضلہ تعالےٰ ایسے وسائل دستیاب ہوئے۔ کہ وہ مضامین عالیہ جن کا اردو زبان میں بیان کرنا سہل نہ تھا۔ بوجہ احسن صحیح صحیح اور عام فہم زبان میں جلوہ افروز ہو گئے۔ جس کو ملاحظہ فرماکر

مومنین کی آنکھیں پُرنور اور ان کے قلوب مسرور ہونگے۔ اوّل تو یہ کتاب عربی زبان میں تھی۔ اور عربی زبان ہمارے ملک سے قریبًا مفقود ہو چکی ہے۔ اور روز بروز اس کی طرف سے عام طور پر توجہ گھٹتی جاتی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ دوسرے ایسے فاضل جلیل کا کلام جس کا سمجھنا اور اس سے مطلب کا نکالنا کچھ آسان نہیں۔ لہذا ان دقتوں پر نظر کرکے باوجود عدیم الفرصتی اور بے بضاعتی کے اس مشکل کام کو اپنے ذمے لیا۔ جو اللہ تعالےٰ کی خاص مہربانی اور حضرت محمدؐ و آل محمدؐ کے تصدق سے اس کتاب کا حصۂ اوّل (تنزیہ الانبیاءؑ) اتمام کو پہنچا۔ اور حصۂ دوم (تنزیہ الائمہؑ) فی الحال نظر انداز کیا گیا۔ اگر ضرورت سمجھی گئی۔ تو آئندہ دیکھا جائیگا۔ انشاءاللہ۔

آخر میں میں اپنے فاضل دوست جناب مستطاب مولوی سید محمد سبطین صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل اڈیٹر رسالہ البرہان لاہور و پروفیسر عربی مہندر کالج پٹیالہ کا شکریہ دل و جان سے ادا کرتا ہوں جنہوں نے نہایت جانفشانی اور محنت سے تنزیہ الانبیاء کے متعلق مفید حواشی تحریر فرما کر اصل کتاب کی خوبی کو دوبالا اور مختصر اور مجمل مقامات کو نہایت واضح اور روشن کر دیا۔ فجزاھم اللہ خیر الجزا و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد و آلہ الطیبین الطاہرین آمین ثم آمین ثم السلام علی المومنین و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

نیازمند

سید شریف حسین بھیرلوی

مدرس سنٹرل ماڈل سکول لاہور

مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء

تمت بالخیر

اطلاع

رسالہ البرہان: جس میں اسلام کی حقیت وحقیقت۔ اُس کی سچی تعلیم حقیقت وضرورت نبوت۔ تعلیم انبیاء۔ اُن کے علوم وفضائل وکمالات۔ اُنکا طریق تعلیم بالخصوص آنحضرت صلعم اور اُنکے اوصیاء کرام علیہم السلام کے علوم وکمالات۔ اُن کا طریق ہدایت اور اخلاق حسنہ دیگر جملہ اصول اسلام اتفاق و اتحاد کی ضرورت۔ اسلام کے برخلاف جملہ ایرادات و اعتراضات کا رد جدید اکتشافات۔ اصول تمدن وغیرہ وغیرہ مطالب براہین عقلیہ سے مع مطابقت بآیات واحادیث بحث کیجاتی ہے۔ اور اس میں بڑے بڑے علماء وفضلاء وگریجوئیٹ صاحبان کے اعلیٰ اور مفید مضامین درج ہوتے ہیں۔ ہر انگریزی مہینے میں ایک دفعہ بازار حکیماں لاہور سے شایع ہوتا ہے۔ یہ اپنی وضع کا پہلا رسالہ ہے۔ اُس کی خوبی دیکھنے ہی پر موقوف ہے۔ اہل علم سے جیسی اس کی قدر کی ہے قابل رشک ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ۔ عام سالانہ قیمت عہ فی پرچہ ۳ ر +

طریقۃ الصلوٰۃ:۔ جس میں جملہ واجب نماز کے طریق اور اُن کے احکام کو اس طرز سے نہایت سلیس و بامحاورہ اردو میں بیان کیا گیا ہے کہ معمولی لیاقت کا آدمی بھی بلا کسی کی امداد کے سیکھ سکتا ہے۔ گویا یہ مختصر رسالہ استاد کا کام دیتا ہے۔ نماز سیکھنے کے واسطے اس سے بہتر رسالہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ ۲ ر قیمت پر دفتر "البرہان" لاہور سے طلب کرنا چاہیئے +

الہیئۃ والاسلام:۔ اس کتاب میں ہیئت جدید کو تعلیم اسلام کے موافق ثابت کیا گیا ہے۔ اور دکھایا گیا ہے کہ اسلام ان علوم کی تحقیق سے تیرہ سو برس قبل ان علوم کو بیان کر چکا ہے جو اسلام کی صداقت وحقیت کی روشن دلیل ہے۔ یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہی ہے اور اس مضمون کی پہلی کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ زیر طبع ہے عنقریب دفتر "البرہان" سے شایع ہوگا +

توحید القرآن:۔ مصنفہ جناب عمدۃ الافاضل مولانا مولوی سید محمد ہارون صاحب ممتاز الافاضل دام مجدہٗ۔ قرآنی توحید کے بے بہا جواہرات کا خزانہ۔ اپنی وضع کی بالکل نئی اور پہلی کتاب ہے۔ جو حال ہی میں مطبع ناظم الھند لاہور میں طبع ہوئی ہے۔ تقطیع ۲۰×۲۶ ۸ ۔ ۳۰۰ صفحے عہ قیمت بلا محصول ڈاک پر دفتر "البرہان" و "ناظم الہند" لاہور سے مل سکتی ہے +

مینیجر رسالہ "البرہان" لاہور

اعلان

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ لہذا کوئی صاحب بلا اجازت جناب مولوی سید محمد سبطین صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل اڈیٹر "البرہان" کے اس کتاب کے کُل یا کسی جُز کے چھاپنے کا قصد نہ فرمائیں۔ جس قدر جلدیں مطلوب ہوں۔ دفتر "البرہان" لا[ہور] سے طلب فرمائیں ؂

منیجر "البرہان" لاہور
بازار حکیماں

خاکسار محمد اسمٰعیل کاتب و نقاش
از لاہور